سالنامہ

اکبر الہ آبادی نمبر

مرتبہ ڈاکٹر فرمان فتحپوری

رجسٹرڈ نمبر ایس ۲۴۷۲

(بانی علامہ نیاز فتحپوری)

اکبر الہ آبادی نمبر

سالنامہ سنہ ۱۹۶۹ء

(نومبر و دسمبر)

مدیر اعلیٰ
ڈاکٹر فرمان فتحپوری

مدیر
عارف نیازی

نائب مدیر
وزیری پانی پتی

ناظم نشر و اشاعت و اشتہار
رشید محمد قریشی

زر سالانہ دس روپے — قیمت فی کاپی تین روپے

کاتب .... عالم علی خاں

صدر دفتر : نیاز منزل ۔ ناظم آباد (۲)۔ کراچی ۱۸

شاخ : نگار پاکستان ۔ ۳۲۔ گارڈن مارکیٹ۔ کراچی ۳

منظور شدہ برائے مدارس کراچی ۔ بموجب سرکلر نمبر ڈی / ایف یو پی / ۳۶۶۹ / ۶۲ / محکمہ تعلیم کراچی

پبلشر عارف نیازی پرنٹر سید صابر علی مشہور آفسٹ پریس سے چھپوا کر ادارہ ادب عالیہ سے شائع کیا

داہنی طرف کا صلیبی نشان اس بات کی علامت ہے کہ آپ کا چندہ اس شمارے کے ساتھ ختم ہو گیا

فہرست

۴۸ واں سال / اکبر الہ آبادی نمبر۔ نومبر۔ دسمبر ۱۹۶۹ء / شمارہ (۱۱ و ۱۲)

ملاحظات

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

"نگار" نے اپنی اڑتالیس سالہ زندگی میں اُردو کے اکثر مشاہیر سخن کے متعلق سالنامے شائع کئے ہیں۔ غالب، مومن، ظفر، اقبال، مصحفی، نظیر اکبرآبادی اور حسرت موہانی نمبر سے قطع نظر، نگار نے جدید شاعری اور اصناف شاعری کے نام سے بھی دو سالنامے شائع کئے ہیں۔ ان خصوصی شماروں نے اردو کی جملہ شعری روایات، اس کے اسالیب، نمائندہ شعراء کی خصوصیات، ابتداء و ارتقاء اور ادوار و تحریکات کو جس تفصیل و جامعیت سے سمیٹ لیا ہے وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے، بایں ہمہ نگار کے شعری سرمائے میں ایک کمی محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ اس میں اکبر الہ آبادی کا تفصیل سے کہیں ذکر نہیں آیا حالانکہ سرسید کے سیاسی نظریات، مذہبی عقائد اور تعلیمی پالیسی کے حریف و ناقد ہونے کی حیثیت سے انکی شخصیت اور شاعری دونوں کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے، اکبر کی مشرقیت پسندی اور سرسید کے بعض افکار و خیالات سے مخالفت کے سبب انھیں کتنا ہی مطعون کیوں نہ کیا جائے، اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ پاک و ہند کے مسلم معاشرے اور اس معاشرے کے نمائندہ ذہنوں، مثلاً مولانا محمد علی جوہر مولانا ظفر علی خاں، علامہ اقبال، مولانا شبلی، مولانا سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام آزاد، سب کو اکبر نے متاثر کیا ہے۔ اس اعتبار سے وہ صرف یہی نہیں کہ اُردو کے ممتاز ترین طنز نگار شاعر تھے بلکہ ملک و ملت کے ایک ممتاز رہنما بھی تھے۔

اپنے دوسرے ہمعصروں کی طرح "نگار" کے بانی مادر اُردو کے ادیب شہیر علامہ نیاز فتحپوری مرحوم بھی اکبر الٰہ آبادی سے متاثر تھے بلکہ تعلق خاص رکھتے تھے۔ اکبر الٰہ آبادی جیسا کہ ان کے مکتوبات سے ظاہر ہے نیاز صاحب کے فکر و فن کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، یہی وہ قدیم تعلق تھا جس کے سبب نیاز صاحب "نگار" کا اکبر الہ آبادی نمبر شائع کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بعض وجوہ سے انکی زندگی میں ایسا نہ ہوسکا۔ ورنہ "نگار" کا "اکبر نمبر" زیر نظر نمبر سے، شاید بہت مختلف ہوتا۔ اس لئے کہ اکبر کے سلسلے میں انھوں نے جو کچھ لکھا تھا اس سے آگے بڑھ کر بھی بہت کچھ لکھنا چاہتے تھے، یہ سالنامہ دراصل نیاز صاحب کی اسی خواہش کی عملی صورت ہے۔ امید ہے کہ اس سے ایک طرف اکبر الٰہ آبادی کی شخصیت اور فن کو سمجھنے سمجھانے اور انھیں عام و خاص میں مقبول بنانے میں مدد ملے گی، دوسری طرف وہ خلا بھی پُر ہو جائے گا جو نگار کے صفحات میں ایک عرصہ سے محسوس کیا جا رہا تھا۔

ہمیں افسوس ہے کہ چند ایک کے سوا، ہم اس سالنامے کے لئے تازہ مقالات فراہم نہ کر سکے، وجہ یہ تھی کہ سالنامے کا اعلان بعض وجوہ سے بڑی تاخیر کے ساتھ ہوا اور نگار کے قلمی معاونین وقت کی تنگی کے سبب بروقت ہماری مدد نہ کر سکے اس لئے نگار کی روایت کے خلاف ہمیں اس بار منتخبات سے بھی کام لینا پڑا۔ چنانچہ نگار کی فائلوں کے علاوہ، علی گڑھ میگزین اور بعض دوسرے ماخذوں سے اس نمبر کی ترتیب میں مدد لی گئی ہے، ہم ان سارے دوستوں اور بزرگوں کے شکر گزار ہیں۔ جنھوں نے از راہ کرم، ہمیں تازہ مقالات مرحمت فرمائے یا اپنے مطبوعہ مقالے کو قند مکرر کے طور پر اگر نمبر میں شامل کرنے کی اجازت فرمائی۔

آخر میں ہم اپنے بعض بزرگ اہل قلم سے معذرت چاہتے ہیں کہ ان کے مقالات چونکہ حد درجہ تاخیر بلکہ پرچہ چھپ جانے کے بعد موصول ہوئے اس لئے آخری صفحات کے سوا ہم انھیں مناسب جگہ نہ دے سکے۔ امید ہے کہ اس شتر گربہ گی کو مجبوری سمجھ کر قارئین بھی ہمیں معاف کر دیں گے۔

اکبر الٰہ آبادی

(علامہ نیاز فتحپوری)

سترہ سال کا ایک نوجوان لڑکا۔ دُبلا پتلا، قد ذرا دبتا ہوا، رنگ کچھ کھلتا ہوا مسیں بھیگی ہوئی، پیشانی کی رگیں ابھری ہوئی، اپنے کمرے میں ٹہل رہا ہے اور یہ شعر گنگناتا جارہا ہے :

چشم عاشق سے گریں لختِ دلِ بیتابؔ اشک　　آپ یوں دیکھیں تماشا جانکر سیماب واشک

معلوم نہیں یہ زمین خود اس نے پیدا کی تھی یا شاہ نصیر وظفر کے کلام کو دیکھ کر اس کے ذہن میں آئی تھی، وہ بہت خوش تھا کہ ایسی مشکل زمین میں اس نے ایک شعر کہا اور لختِ دل کو سیماب کہہ کر اپنی بے چینی کا اظہار کس خوبی سے کیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے میز سے کاغذ اٹھایا اور پنسل سے اس پر دوسرا شعر لکھا ؎

اپنے دامن پر گرا کر کیوں اسے کرتے خراب　　جانتے یکساں اگر ہم گوہرِ نایاب واشک

اب اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ واقعی گوہرِ نایاب اُس کے ہاتھ آگیا۔ اس نوجوان کا نام اکبر حسین ہے اور یہ اشعار اس کی فکر کا اوّلین ثمر ہیں۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس نوجوان کا اس وقت شاعری میں کوئی استاد تھا یا نہیں اور یہ اشعار اس کو دکھائے گئے یا نہیں، لیکن اگر ایسا ہوتا تو وہ اپنے شاگرد کو جھڑکتا کہ یہ کیا مہمل گوئی ہے، تاہم دل ہی دل میں وہ اس امر کا بھی اعتراف کرتا کہ لڑکا ہونہار ہے، ذہین ہے، معنی آفرینی کی خاص اہلیت رکھتا ہے اور اگر اس کی رہنمائی کی گئی تو اچھا شاعر بن جائے گا۔ اس کے بعد کچھ پتہ نہیں کہ یہ رہنمائی اس نوجوان کو میسّر آئی یا نہیں اور فکرِ سخن جاری رہی یا نہیں لیکن چار سال بعد جبکہ اس کی عمر ۲۱ سال کی ہے۔ پہلے پہل ایک مشاعرہ میں شریک ہوتا ہے اور ایک طویل غزل خاص والہانہ انداز سے سناتا ہے۔ جس کے بعض اشعار یہ ہیں :

دکھلاتے ہیں بت جلوۂ مستانہ کسی کا　　یاں کعبۂ مقصود ہے بتخانہ کسی کا
نالاں ہے اگر وہ تو یہ ہے چاک گریباں　　بلبل کی طرح گُل بھی ہے دیوانہ کسی کا
تاثیر جو کی صحبتِ عارض نے دمِ خواب　　خجلت دہِ آئینہ ہوا شانہ کسی کا
پہونچی جو نگہ عالمِ مستی میں فلک پر　　ہم سمجھے مہِ نو کو بھی پیمانہ کسی کا
تاثیرِ محبت سے جو ہو جاتے ہیں بے چین　　رو دیتے ہیں اب سن کے وہ افسانہ کسی کا

ہم جان سے بیزار رہا کرتے ہیں اکبرؔ
جب سے دلِ بیتاب ہے دیوانہ کسی کا

آپ نے دیکھا کہ اس چار سال کے اندر کتنا فرق ہوگیا۔ ہر چند اس زمانے کی غزل گوئی کا پامال انداز اس میں موجود ہے، یعنی وہی معمولی تشبیہیں، وہی گل و بلبل اور وہی کعبہ و بتخانہ جو غزل کے عناصر ضروری تھے۔ یہاں بھی پائے جاتے ہیں، لیکن "سیماب واشک" والی بے معنی دقت پسندی کا کہیں پتہ نہیں اور آخری دو شعر تو اُن جذبات کا بھی پتہ دیتے ہیں، جنھیں آسانی سے ہم صحیح تغزل میں شامل کر سکتے ہیں، زمانہ گزرتا گیا، اکبر شعر کہتے رہے۔ مشاعروں میں شریک ہوتے رہے، لیکن ماحول کے اثر سے مغلوب، رواج سے متاثر اور زلف و سنبل کے جال میں بدستور گرفتار۔ تاہم وہ فطری صلاحیت جس کو آگے چل کر بالکل دوسری راہ اختیار کرنا تھی، کبھی کبھی منھ سے کچھ اور بھی کہلوا لیتی تھی اور وہ "کچھ اور" اس رنگ کا ہوتا تھا ؎

ابھی سے خون رُلاتی ہے مجھ کو فکرِ مآل　　چمن میں بعد ترے اے بہار کیا ہوگا
گو بہت کچھ رنج یارانِ وطن سے تھا ہمیں　　آنکھ میں آنسو مگر وقتِ سفر آ ہی گیا
بعد مدت کے نظر آئی جو صورت یار کی　　سو طرح دل کو سنبھالا غش مگر آ ہی گیا

اکبر کے اس ابتدائی دور میں سوائے غزل کے ہمیں اور کچھ نہیں ملتا اور غزل بھی اسی رنگ کی جس میں زیادہ تر قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی سے کام لیا جاتا ہے۔ اکبر نے اس دور شاعری میں اساتذہ کی غزلوں کو سامنے رکھ کر ایک ایک زمین میں چار چار غزلیں کہیں، اور خوب خوب زور آزمائی کی، یہاں تک کہ شاید خود تھکن محسوس کرنے لگے اور جب اس رنگ کو چھوڑا تو ان میں اس قسم کے اشعار کہنے کی صلاحیت پیدا ہو چلی تھی ؎

بزم عشرت کہیں ہوتی ہے تو رو دیتا ہوں　　کوئی گزری ہوئی صحبت مجھے یاد آتی ہے

اکبر کا یہ دور شاعری دس بارہ سال رہا اور جب ان کی عمر ۳۰ سال کی ہوئی تو یہ رنگ بہت کچھ بدلا ہوا تھا، اب ان کے یہاں زیادہ زور لفظوں پر نہ تھا بلکہ واقعیت پر تھا اور اُن کے غزل کا داخلی رنگ بھی بہت کچھ نکھر گیا تھا۔ ایک غزل ملاحظہ ہو ؎

کہوں کس سے قصۂ درد و غم کوئی ہمنشیں ہے نہ یار ہے　　جو انیس ہے تری یاد ہے جو شفیق ہے دلِ زار ہے
یہ نوید اوروں کو جا سنا ہم اسیرِ دام ہیں اے صبا　　ہمیں کیا چمن ہے جو رنگ پر ہمیں کیا جو فصلِ بہار ہے
تو ہزار کرتا لگاوٹیں، میں کبھی نہ آتا فریب میں　　مجھے پہلے اسکی خبر نہ تھی ترا دو ہی دن کا یہ پیار ہے
وہ نظر جو مجھ سے ملا گئے تو یہ اور آفتیں ڈھا گئے　　کہ حواس و ہوش و خرد ہے اب شکیبُ صبر قرار ہے
مجھے رحم آتا ہے دیکھ کر ترا حال، اکبر نوحہ گر　　تجھے وہ بھی چاہے خدا کرے کہ تو جس کا عاشق زار ہے

آپ نے دیکھا۔ اکبر کے دوسرے دور کی غزل گوئی پہلے دور سے کتنی مختلف نظر آتی ہے، پہلے سوز و گداز مفقود تھا اور اب اس کی چاشنی ان کے اکثر اشعار میں پائی جانے لگی۔ پہلے وہ صرف سطح پر رہ کر بال کی کھال نکالا کرتے تھے اور اب دل کی گہرائیوں تک بھی ان کا ذہن پہونچنے لگا۔ پہلے ان کے کلام میں تکلف و تصنع تھا اور اب اس میں بیساختہ پن ہے پہلے وہ صرف لفظوں سے کھیلا کرتے تھے اور اب وہ معنویت کی طرف مائل ہو چلے ہیں۔ پہلے ان کی غزلوں میں اوچھاپن تھا لیکن اب ان میں وزن پیدا ہو چلا ہے ـــــ پہلے ان کی شاعری روایتی قسم کی تھی لیکن اب وہ خود دلی جذبات کو نظم کرنے لگے تھے، ہر چند اکبر کے دوسرے دور کی غزل گوئی میں بھی ہمیں اس رنگ کے اشعار کافی نظر آتے ہیں ؎

اسی کے سائے میں ہوتی ہے میرے دل کی بسر　　خدا دراز کرے عمر زلفِ پیچاں کی
جماتی ہے لبِ نازک پہ ان کے رنگ اپنا　　یہ شوخیاں تو ذرا دیکھو سرخیٔ پاں کی

لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا بدرقہ وہ ان اشعار سے بھی کر دیتے ہیں ؎

غم نہیں اس کا جو شہرت ہوگئی — ہوگئی اب تو محبت ہو گئی
اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز — مل گئے صاحب سلامت ہوگئی

یہ وہ زمانہ تھا جب اکبر وکیل ہو کر دنیا کا عملی مطالعہ شروع کر چکے تھے اور دوسری طرف اودھ پنچ کی طنزیہ ظرافت نے ملک میں شوخی و شوخ نگاری کا عام ذوق پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اکبر حسن کی قسمت میں ملک کا بہترین طنز نگار نقاد ہونا مقسوم ہو چکا تھا۔ اس رنگ سے بہت متاثر ہوئے اور غزل گوئی کے ساتھ ساتھ انھوں نے مثنوی، قطعات اور رباعیات لکھنا بھی شروع کر دیں، لیکن ان کا رنگ بالکل علیحدہ تھا اور ایسا ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ اب یہ اودھ پنچ کے مستقل نامہ نگاروں میں شامل ہو گئے تھے اور اس طرح ان کے انتقادی ذوق کو ابھرنے کا پورا موقع مل گیا تھا۔ اس وقت ملک میں انگریزی تعلیم کا چرچا تھا۔ مغربی تہذیب تیزی سے پھیلتی جا رہی تھی، عادات و اخلاق میں آزادی پیدا ہو چلی تھی، قدیم معاشرت پر جدید معاشرت چھائی جا رہی تھی۔ اور سر سیّد نے کالج قائم کر کے ملک میں دو جماعتیں پیدا کر دی تھیں ایک وہ جو انگریزی تعلیم اور سر سیّد کے حامی تھے اور دوسری وہ جو اسے مشتبہ نگاہوں سے دیکھتی تھی، اودھ پنچ اس دوسری جماعت کا آرگن تھا اکبر اسی آرگن کے نامہ نگار تھے۔ اس لیے وہ اسی جماعت کے فرد تھے۔ چنانچہ ۱۸۷۷ء میں انھوں نے جو ایک منظوم خط اودھ پنچ کو لکھا وہ ثبوت ہے اس بات کا کہ اگر وہ بجائے غزل کے شروع ہی سے مثنوی کی طرف توجہ کرتے تو بہت زیادہ کامیاب ہوتے۔ بیانیہ شاعری کا چونکہ میدان وسیع ہوتا ہے اور انتقادی ذوق رکھنے والے شاعروں کو اس میں پھولنے پھلنے کا زیادہ موقعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اکبر نے جب کبھی مثنوی کے رنگ میں لکھا بہت زیادہ کامیاب ہوئے اور اس سلسلہ میں انکی وہ نظم جو (سودی) (SOUTHEN) کی مشہور نظم آبشار لوڈور کے انداز پر لکھی گئی ہے اور جنگ نامہ روم و روس جو غیر مطبوعہ ہے اس بات کا مزید ثبوت ہیں کہ ان میں مثنوی نگاری کی بڑی زبردست قوت پائی جاتی تھی۔

افسوس ہے کہ ان کے کلیات کی ترتیب میں تاریخوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ اس لئے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ غزلوں کے علاوہ قطعات وغیرہ کی صورت میں انھوں نے جو کچھ لکھا اس میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے کس نظم کو پہلے رکھنا چاہیئے اور کسے بعد میں، لیکن چونکہ وہ ۱۸۸۰ء میں منصف ہو گئے تھے، اس لئے ۱۸۶۶ء سے لیکر ۱۸۸۰ء تک کا زمانہ دس سال کا جس میں اودھ پنچ کے ساتھ نامہ نگارانہ تعلق کے بھی ۶ سال شامل ہیں .... ان کی نظم نگاری کا پہلا دور تھا۔

اس زمانے کی نظموں میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ نسبتاً زیادہ طویل ہیں اور ان کو کسی نہ کسی غالبؔ شعر پر تضمین کی صورت سے پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ہیں وہ سب انتقادی رنگ کی جن میں مذہب، معاشرت۔ اخلاق، تعلیم، پردہ وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ لیکن باوجود اس میلان کے غزل گوئی کا سلسلہ بھی جاری تھا اور اس میں زیادہ پاکیزگی اور گہرائی پیدا ہوتی جا رہی تھی۔ مثلاً ایک غزل ملاحظہ ہو:

ہم کیوں یہ مبتلائے بیتابی نظر ہیں — تسکین دل کی یارب وہ صورتیں کدھر ہیں
دنیا کی کیا حقیقت اور ہم سے کیا تعلق — وہ کیا ہے اک جھلک ہے، ہم کیا ہیں اک نظر ہیں
پیدا کئے فلک نے نادیدنی مناظر — نیچی ہیں ان کی نظریں جو صاحب نظر ہیں
غمخانۂ جہاں میں وقعت ہی کیا ہماری — اک ناشنیدہ اُف ہیں اک آہ بے اثر ہیں

اکبر کے شعر سنکر کہتے ہیں اہلِ باطن — اب بھی خدا کے بندے کچھ صاحب اثر ہیں

آپ نے دیکھا کہ اس میں ایک خاص فلسفیانہ انداز ہے ۔ ایک خاص معلمانہ کیفیت ہے جو مخاطب کو فطرت کے گہرے مطالعہ کی طرف مائل کرتی ہے ۔ ان کے تیسرے دور میں ان کی یہ معنی آفرینی برابر بڑھتی ہی رہی اور ان کی غزل میں ایک خاص وزن پیدا ہوگیا ۔ ملاحظہ ہو تین شعر کی ایک غزل ؎

یہ جتنے ذرّے جہانِ فانی کے اپنی شکلوں میں جلوہ گر ہیں — خدا کی ہستی کے سب ہیں شاہد اور اپنی ہستی سے بیخبر ہیں
تغیر اتنا کہ کم تعین ، تعین ایسا کہ اپنی ہی دُھن — کمال ایسا کہ سب ہیں حیرت ، جمال ایسا کہ سب نظر ہیں
حواس کچھ نیک کام کرلیں کہ جیب و دامن کو اپنے بھرلیں — مرے معانی کی حد نہیں ہے اگرچہ الفاظ مختصر ہیں

ان اشعار کو پڑھئے اور ابتدا کے ان دو اشعار کو پڑھئے جن میں " سیماب و اشک " کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر غور کیجئے کہ اکبر کے رنگ تغزل میں آخر آخر کتنا تغیر پیدا ہوگیا تھا ۔

اکبر اپنی جس حیثیت سے ملک میں مشہور ہیں ، وہ ایک طنز نگار نقاد (SATIRIC CRITIC) کی حیثیت ہے جس میں ان کی ظرافت (HUMOUR) نے جان ڈالدی ہے ۔ اکبر کو ادبی دنیا میں ایک سوشل نقاد کی حیثیت سے جتنی شہرت حاصل ہوئی اس کی مثال مشرق کے لٹریچر میں کوئی نہیں ملتی ۔ اکبر نے اپنے زمانے کے ادبی ، معاشرتی اور سیاسی رجحانات پر جو تنقید کی ہے وہ بالکل انفرادی حیثیت رکھتی ہے ۔ ان کا نصب العین مشرق کو مغرب کے تقلیدی اثرات سے بچانا ہے ، وہ نئی تہذیب و تعلیم کے مخالف نہیں ہیں ، لیکن اس سے مشرق کی اخلاقی روایات کو جو صدمہ پہونچتا ہے اس کی مخالفت ضرور کرتے ہیں ، وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ ملک کے نوجوان تقلید مغرب میں اپنی قومی خصوصیات اور مذہبی احساسات کو ترک کردیں اور انھیں خیالات کو انھیں مختلف انداز میں ظاہر کیا ہے ۔ ایک جگہ وہ صاف صاف اس کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

اک برگِ مضمحل نے یہ اسپیچ میں کہا — موسم کی کیا خبر نہیں لے ڈالیو تمھیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا — موسم سے باخبر ہوں تو کیا جڑ کو چھوڑ دیں؟

عورتوں کی تعلیم کے متعلق بھی ان کا فلسفہ یہی تھا کہ اگر مغربی تعلیم انھیں مشرق کی گھریلو زندگی سے ناآشنا کردیتی ہے تو کسی کام کی نہیں اسی لئے وہ پردے کے بھی حامی تھے اور لڑکیوں کی بیجا آزادی کو پسند نہ کرتے تھے ۔ اس موضوع پر انھوں نے بڑی دلچسپ باتیں کہی ہیں ۔ گھر اور شوہر کی طرف سے عورت کی بے اعتنائی انھوں نے ایک شعر میں کس خوبی سے ظاہر کی ہے ۔

ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی
یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اسی قسم کا ایک اور طنز ملاحظہ ہو ، بنارس سے علی گڑھ کالج کے اولڈ بوائز نے ایک رسالہ اولڈ بوائے کے نام سے نکالا تھا اس پر اکبر فرماتے ہیں ؎

نکلا بہ آب و تاب بنارس سے اولڈ بوائے — اللہ اس کو گولڈ بھی دے اور پرل بھی
خواہش ہے اب یہ بعض محبانِ قوم کی — نکلے کسی طرف سے یونہی اولڈ گرل بھی

پردہ کی حمایت میں انھوں نے بہت کچھ لکھا ہے اور بعض جگہ اس سلسلہ میں ان کی طنز نگاری بہت سخت ہوگئی ہے مثلاً ؎

پردے کی وجہ سے یہ اجازت ہے چار کی — پردہ نہ ہو تو ایک کی بھی احتیاج کیا
پردہ اٹھا ہے ترقی کے یہ سامان تو ہیں — حوریں کالج میں پہونچ جائیں گی غلمان تو ہیں

عورتوں کی آزادانہ تعلیم اور بے پردگی کا ذمہ دار وہ مرد کو قرار دیتے ہیں اور نہایت لطیف انداز میں اسکا اظہار کرتے ہیں

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں
حجاب اس کو نہیں آتا، انھیں غصہ نہیں آتا

بے پردگی کا جو نتیجہ ان کی نگاہ میں تھا اسے ایک شعر میں یوں ظاہر کیا ہے ؎

کیا گزری جواک پردے کے عدو، رو رو کے پولس سے کہتے تھے
عزت بھی گئی دولت بھی گئی، بی بی بھی گئی زیور بھی گیا

اکبر قومی کانفرنس کی ہنگامہ آرائیوں سے بھی زیادہ خوش نہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ مرض کا حقیقی علاج نہیں ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں ؎

مجرب ایسا ملا نسخہ قوم بازی کا
کہ قدر اٹھ گئی دنیا سے عشق بازی کی

قوم کے لیڈروں اور ریفارمروں پر بھی انھوں نے خوب خوب طنز کئے ہیں ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کیساتھ — رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

وہ اصلاح قومی کے باب میں سب سے پہلے اقتصادی اصلاح چاہتے تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے باب میں وہ اسی چیز کی کمی پاتے تھے۔ چنانچہ ایک جگہ لکھتے ہیں :۔

انگریز خوش ہے مالکِ ایروپلین ہے — ہندو مگن ہے اس کا بڑا الین دین ہے
بس اک ہمیں ہیں ڈھول میں پول اور خدا کا نام — بسکٹ کا صرف چور ہے لنڈ کا چھین ہے

تہذیب جدید کی کورانہ تقلید سے مسلمانوں کو جو فائدہ پہنچا اس کو اس انداز میں ظاہر کرتے ہیں ؎

رہ گیا دل ہی میں شوقِ سایۂ الطافِ خاص — مجھ کو آنے کی اجازت دی نہیں بڈ روم میں
کھانے کے کمرے سے رخصت کر دیا بعد از ڈنر — تھیں فقط چھریاں ہی اور کانٹے مرے مقسوم میں

اکبر بہت مذہبی آدمی تھے اور جدید تعلیم سے جو بیدینی پھیل رہی تھی اس پر بہت دل کڑھایا کرتے تھے بعض اشعار اس خیال کے ملاحظہ ہوں :

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے در سے پیدا — دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا
لا مذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم — ہرگز گزر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
مذہب ہے گم ترقیِ یوروپ کے سامنے — معذور خاکسار بھی ہے اور جناب بھی

اکبر کا بڑا کمال بات میں بات پیدا کرنا تھا اور اسی کے لئے ان کا طنز و مزاح زیادہ تر قافیوں کی تلاش پر منحصر ہے۔ ان کے ایک دوست بیماری کے بعد لاہور کسی جلسہ میں شرکت کے لئے جانے لگے انھوں نے کہا کہ ابھی قوت نہیں ہے آپ کیوں جاتے ہیں، لیکن وہ نہیں مانے۔ اکبر اس خاص واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

میں کہتا ہوں جاتے ہو لاہور بلا قوت — وہ اس کو سمجھتے ہیں لاحول ولا قوۃ

ایک اور شعر نہایت لطیف کنایہ لئے ہوئے ملاحظہ ہو ؎

شیخ تثلیث کی تردید تو کچھ کرتے نہیں　　گھر میں بیٹھے ہوئے والتین پڑھا کرتے ہیں

لفظ تثلیث کے ساتھ ہی، سورۂ والتین کی طرف منتقل ہونا اکبر کی شوخ ذہانت کا زبردست ثبوت ہے، قافیہ کی تلاش کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں ؎

یا الٰہی ٹیشن کے صدقے چلو دودھ اور کھانڈ لے　　یا الٰہی ٹیشن کے بدلے تو چلا جا مانڈلے

فضلِ خدا سے عزت پائی آج ہوئے سی۔ایس۔آئی　　شیخ نہ سمجھے لفظ انگریزی بولے ہوئے ہیں عیسائی

پنجاب کے ایک وکیل الف دین صاحب نے کوئی مذہبی کتاب لکھی تھی، اس پر اکبر کا یہ شعر ملاحظہ ہو ؎

الف دین نے خوب لکھی کتاب　　کہ بے دین نے پائی راہ صواب

اردو میں اکبر ہی پہلا اور شاید آخری شاعر تھا جس نے نظم میں لطیفوں اور چٹکلوں کو پیش کیا اور سب سے بڑا کمال یہ تھا کہ اس سلسلے میں وہ اپنے اصل مقصد کو کبھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ مغرب کی بیجا تقلید کا اثر دو شعروں میں اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی　　چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی

واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر　　پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

مغربی وضع کی عام مقبولیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں ؎

میرے منصوبے ترقی کے ہوئے سب پائمال　　بیج مغرب نے جو بویا وہ اُگا اور پھل گیا

بوٹ ڈاسن نے بنایا، میں نے اک مضموں لکھا　　ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

اکبر کا مطالعۂ فطرت بھی بڑا زبردست تھا اور اگر وہ خالص منظریہ شاعری کرتے تو بھی بہت کامیاب ہوتے۔ ایک نظم ملاحظہ ہو جو محاکات و جزئیات نگاری کی بہترین مثال ہے ؎

دو تیتریاں ہوا میں اڑتی دیکھیں　　اک آن میں سو طرف کو مڑتی دیکھیں

بھولی، خوش رنگ، چست، نازک، پیاری　　پہنے ہوئے فطرتی منقش ساری

پھرتی ہے کہ برقِ طبیعت کا ابھار　　تیزی ہے کہ آنکھ کو تعاقب دشوار

جو فاصلہ کر لیا ہے باہم قائم　　وہ بھی ہے بلا زیادت و کم قائم

گو تابعِ جوشِ برقِ پروازی ہیں　　دونوں کے خطوطِ طیر متوازی ہیں

کیونکر میں کہوں کہ یہ نظر بندی ہے　　اللہ، اللہ، کیا ہنرمندی ہے

ان جانوروں میں گرل اسکول کہاں　　فطرت کے چمن میں صنعتی پھول کہاں

کس بزم سے ایسا ناچ سیکھ آئی ہیں　　پریاں اندر کی جس سے شرمائی ہیں

اس سمت اگر خیالِ انساں بڑھ جائے　　دامانِ نظر پہ رنگِ عرفاں چڑھ جائے

اکبر کا سیاسی مسلک

(مولانا عبدالماجد دریابادی)

سیاسیات سے براہ راست حضرت اکبر کو کبھی دلچسپی نہیں رہی، نہ ان کا یہ فن، نہ اس موضوع سے انھیں کوئی خاص مناسبت لیکن تھے پورے مشرقی ...... اور مشرقی سے بھی بڑھ کر پختہ مذہبی۔ اور دل و دماغ نہایت درجہ حساس، اس لئے مذہب کی توہین اور مشرقیت کی چوٹ پر تڑپ جاتے، اور جب کبھی سیاسی کانٹوں کو مذہب و اخلاق کے دامن سے گستاخیاں کرتے۔ دیکھتے تو قدرتاً یہ بات ان کے دل میں چبھ جاتی، اور مجبوراً خارزار سیاست میں قدم رکھ کر کانٹوں کو ایک ایک کر کے چنتے۔

عمر کا بیشتر حصہ سرکاری ملازمت میں گذرا، اور آخری حصہ تو خاصے اعلیٰ عہدوں پر۔ اس کے بعد بھی پنشن کے طوق سے گرانبار، اور خطاب خان بہادری کی زنجیر طلائی سے پابجولاں، اس لئے زبان پر آخر وقت تک مصلحت اندیشیوں کی مہر لگی رہی، اور ناطقہ قلب و دماغ کی پوری ترجمانی نہ کر سکا۔ تاہم ظرافت کا نسخہ ایسا ہاتھ میں موجود تھا کہ جسے جتنی تلخ دوا چاہتے کھلا دیتے اور اوپر شکر کا غلاف اس قدر دبیز رکھتے کہ کھانے والا ادھر حلق سے کڑوی کسیلی گولیاں اتارتا اور ادھر زبان ہے کہ فرطِ حلاوت و شیرینی سے ہونٹ چاٹتی رہتی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں تحریک خلافت و تحریک ترک موالات دونوں کا ہیجان اپنے پورے شباب پر تھا۔ وفات سے چند ماہ، بلکہ شاید چند ہفتہ ہی قبل ایک پورا رسالہ گاندھی نامہ کے نام سے کہ ڈالا اس میں خلافت و ترک موالات کی تحریکوں کے تمام پہلوؤں کے متعلق ہر فریق کے خیالات کی ترجمانی کی ہے، افسوس ہے کہ ایسی پر لطف نظم نہ مرحوم کے زمانے میں شائع ہوئی، نہ اب اس کے بعد ہی، جب شاعر اور خود ان تحریکات کو بھی ختم ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا ہے اور اب اس نظم میں ظاہر ہے کہ کوئی زندہ لطف بھی باقی نہیں رہ سکتا۔ زندہ لطف تو جبھی تک رہتا ہے جب تک وہ شخصیتیں جیتی جاگتی رہتی ہیں وہاں تاریخی لطف البتہ بالکل دوسری چیز ہے۔ وفات سے چند ہفتہ قبل جب آخری بار الہ آباد میں حاضر خدمت ہوا ہوں چند شعر زبان مبارک سے سننے میں آئے تھے۔ افسوس ہے کہ اب ان میں سے کوئی بھی یاد نہیں نقل لینے کی اجازت تو اس وقت کیا ملتی؟ خود میری ہمت اجازت مانگنے کی نہ پڑی کلیات سوز میں سیاسی اشارے کنائے، رمز، تلمیحیں ایک دو جگہ نہیں پچاسوں سینکڑوں جگہ ملیں گی، کہیں کہیں ایسا ہے کہ کوئی مخصوص مسئلہ نہیں بیان کیا ہے بلکہ ملک کی عام سیاسی فضا کی مصوری کی ہے۔ ایسے موقعوں پر اکثر قالب غزل کا اختیار کیا ہے چنانچہ جب نظر بندیوں کی گرم بازاری تھی اور محمد علی، شوکت علی، ابوالکلام سب نظر بند ہو چکے تھے۔ ذیل کی بلیغ و پر معنی غزل ارشاد ہوئی ؎

زباں ہے ناتوانی سے اگر بند مرے دل پر نہیں معنی کے در بند
ہماری بے کسی کب تک چھپے گی! خدا پر تو نہیں راہ خبر بند!

بیادِ رنجِ یارانِ نظر بند　　　کیا ہم نے بھی اب ملنے کا در بند
دلوں میں درد ہی کی کچھ کمی ہے　　　نہیں ہے آہ پر راہِ اثر بند
بتِ مشرق نہیں محتاجِ ساماں　　　کمر ہی جب نہیں، کیسا کمر بند!
کہوں گا مرثیہ اس غم میں ایسا　　　کھلے معنی دکھائے جس کا ہر بند
خیالِ چشمِ افتاں میں ہوا محو　　　مرا دل اب ہے سینہ میں نظر بند

لیکن اظہارِ خیال کی یہ صورت بس حالی ہی خالی ہے، عام دستور یہ ہے کہ یا تو سیاسی فلاح و ترقی کی کوئی خاص اصل بیان تحریر کرتے ہیں یا اسبابِ تنزل میں کسی متعین سبب کی جانب رہنمائی کرتے ہیں۔ یا موجودہ صورتِ حال سے مستقبل کی پیشین گوئیاں کرتے ہیں، یا پھر حریف کے کسی زبردست وار کو رد کرتے ہیں، تحریری سیاسیات کا عالم جیسا کچھ دشوار گذار ہے۔ سب کو معلوم ہے۔ بڑے بڑے محتاط مسافروں اور بڑے بڑے ہوشیار سیاحوں نے جب اس وادی میں قدم رکھا ہے، تو اپنے تئیں زخموں سے چور اور جراحتوں سے فگار ہی پایا ہے، لیکن اس پیمبر سخن کا اعجاز یہ تھا کہ اس کے قدم رکھتے ہی یہ خارزار بھی چمنستان بن گیا، سفر کی خستگی تفریح میں تبدیل ہو گئی اور کانٹوں کی چبھن کی جگہ پھولوں کی مہک نے لے لی۔

اعتراض بہت پرانا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے مذہب کی اشاعت بزورِ شمشیر کی۔ ایک لطیف الزامی جواب کی جانب سب سے پہلے اکبر کا ذہن منتقل ہوتا ہے، فرماتے ہیں کہ ہماری شمشیر کی تو یہ دھوم دھام ہے۔ لیکن اب توپ پر بھی کبھی نظر کی ہے؟ ہم نے بالفرض شمشیر کے ذریعہ سے اشاعت کی تو مذہب ہی کی تو کی، توحید و رسالت ہی کے لئے تو کی۔ گردنیں اس لئے ماریں کہ دوزخ کے دائمی عذاب سے بچائیں، جنت کی دائمی راہ دکھائیں۔ مے فروشی، سود خواری، بے حجابی، حرامکاری، زر پرستی، زن پرستی کی اشاعت کے لئے تو نہیں کی۔ توپ دَم قوموں کی قوموں کو، قبیلوں کے قبیلوں کو اس لئے تو نہیں کر دیا کہ قبضہ ان کے گھروں پر، ان کی جائیداد دولت پر کریں اور ان کی جانوں کو، اولادوں کو اپنی غلامی میں لیں، سارے مضمون کو یوں ادا کرتے ہیں ؎

اپنے عیبوں کی نہ کچھ فکر نہ کچھ پروا ہے　　　غلط الزام بس اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے، تیغ سے پھیلا اسلام　　　یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

کمزور و ناتواں قوموں کی قوتِ مقاومت توڑنے، اور ان کے جسموں کو ہلاک کرنے کیلئے تو توپ، گولہ، بندوق، مشین گن استعمال ہوتی ہیں، پھر جہاں تسلط ہوا اور قدم جما، انہیں بدبختوں کے دلوں اور دماغوں اور روحوں کو غلامی کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے اسکول اور کالج اور خدا جانے اور کیسی کیسی تعلیم گاہیں کھول دی جاتی ہیں۔ غرض کمزور اقوام کے مقابلہ میں "صاحب" کی جنگ و صلح دونوں کا مقصد ایک ہی ہوتا ہے یعنی ان کی روحوں کو اپنا غلام بنا کر رکھا جائے۔ اس خشک حقیقت کو کس تر زبانی سے بیان کرتے ہیں ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے　　　جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

ہماری تہذیب و ترقی، ہماری اصلاح و فلاح، ہماری تعلیم و تربیت کا نام لے لے کر جس قدر بھی کارگزاریاں ہمارے "خداوند" کرتے رہتے ہیں، ہمارے لئے درسگاہیں کھولتے ہیں، عدالتیں قائم کرتے ہیں معیشت میں سہولت بہم پہنچاتے ہیں ان سب کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ہم کو اپنے میں جذب کریں ؎

وہ اس کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑیں گے　　　اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے
کریں گے شوق سے مسلم، غذا میں سے داخل　　　شراب کو بھی ہریسا بنا کے چھوڑیں گے

کہا یہ شیخ نے اکبر سے روک اپنی زباں　　کہ تجھ کو بھی وہ مجھی سا بنا کے چھوڑیں گے

"اونٹ" اور "خرِ عیسیٰ" اکبر کی زبان کی مخصوص اصطلاحیں ہیں "مسلمان" اور "صاحب" کے لئے "اونٹ" اور "گلئے" کا ذکر بھی بڑی کثرت سے آتا ہے ۔ مسلمان اور ہندو کے لئے خرِ عیسیٰ کے بجائے کہیں کہیں "جان بل" بھی استعمال کیا ہے اور کہیں "بندر" بھی ۔

اکبر کے عقیدے میں سیاسی ترقی کا اصل اصول حصولِ قوت تھا ۔ اگر آج ہم اپنے حاکموں سے مساوات کا مطالبہ کرتے ہیں تو اس میں کامیابی کا طریقہ صرف یہ ہے کہ اپنے میں قوت بھی ان کے مساوی پیدا کریں ، سیاسیات نام ہے توازنِ قوت کا ، جو قوم جس قدر قوی ہوگی اسی قدر دوسروں کے مقابلہ میں ممتاز ہوگی ۔ طاقتور قوم کسی کی محتاج نہیں رہ سکتی ، اور کمزور کو ہمیشہ غلامی سہتے رہنا پڑے گا ۔ تحصیل قوت کی بار بار تعلیم دیتے ہیں ۔ مثلاً ؎

مذہب سوسائٹی ہے اور دین آخرت ہے　　پولیٹیکل جو پوچھو طاقت ہے اور سکت ہے

صحیح طریقۂ عمل صرف یہ ہے کہ قوت حاصل کی جائے ۔ نہ یہ کہ شکوہ و شکایات یا خوشامد و تملق میں وقت ضائع کیا جائے ؎

بنایت قابلیت سے مجھے ثابت کیا مردہ　　مناسب داد دینا ہے مجھے یارب کہ رونا ہے

ندا آئی مناسب ہے کہ جینا اپنا ثابت کر　　خوشامد یا شکایت دونوں ہی میں وقت کھونا ہے

سیاسیات کی دنیا میں محض زبان بننا لاحاصل ہے ۔ یہاں ہاتھ بن کر رہنا چاہیے ؎

زور بازو نہیں تو کیا اسپیچ　　ہاتھ بھی دے خدا زباں کے ساتھ

ترک ہوں خواہ عرب ، اسلام کے اقتدارِ دنیوی کے محافظ وہی ہو سکتے ہیں جن کی تلواروں میں دم موجود ہے[1] ؎

کوئی عرب کے ساتھ ہو یا ہو عجم کے ساتھ　　کچھ بھی نہیں ہے تیغ نہ ہو جب قلم کے ساتھ

زورِ بازو ہندوستان کی دوسری قوموں کو بھی نہیں حاصل ، اور وہ بھی کونسلوں وغیرہ ہی کے جال میں پھنسی ہوئی ہیں ، تاہم کم از کم اس محدود دائرے کے اندر تو وہ کر اپنی قوت بڑھانے کی فکر میں رہتی ہیں ؎

گو رہتے ہیں ممبریِ فانی پر ، شاد　　لیکن نہیں اپنی ناتوانی پر ، شاد

کونسل میں بڑھا رہے ہیں طاقت اپنی　　غافل ہیں مکرجی بھوانی پرشاد

جب تک قوت ہاتھ میں نہیں ، زبانی چیخ و پکار ، شور و غل ، تقریر و محفل طرازی سب بیکار ہے ، پلیٹوں کی جھنکار عمر بھر سنتے رہیے مگر کیا ان سے بھوک کی تسکین ہو جائے گی !

رزولیوشن کی شورش ہے مگر ان کا اثر غائب　　پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

اس وقت صرف مسلمان ہی ایسے ہیں جو تذبذب ، کشمکش و دو دلی میں مبتلا ہیں ۔ باقی قومیں یا تو حکمران قوت میں جذب ہو گئی ہیں ، اور یا اپنے میں قوت پیدا کر رہی ہیں ۔ اس حقیقت کو کس اچھوتے انداز سے پیش کرتے ہیں ؎

شیخ صاحب تو ادھر فکرِ مساوات میں ہیں　　بھائی صاحب کو سنا ہے کہ حوالات میں ہیں[2]

---

[1] ترک اس وقت محافظ اسلام سمجھے جاتے تھے ۔ "خادم الحرمین الشریفین" ترکی سلطان (خلیفۃ المسلمین) کا خاص لقب ہوا کرتا تھا ۔

[2] حضرت اکبر نے یہ اشعار ۱۹۱۳ء میں حادثہ مسجد کانپور کے بعد ہی موزوں کئے تھے ۔ اور فوراً ایک گرامی میں بھی تحریر فرمائے کلیاتِ سوم میں پہلا شعر کسی قدر مختلف ہو کر چھپا ہے ۔ یعنی پہلے مصرع میں "بھائی صاحب ہے اور دوسرے میں شیخ صاحب" بات یہ وہی ہے جو نسخہ میں درج کی گئی ہے اور جو مکتوب اکبر کے موافق ہے ۔

قوم کے حق میں تو انجمن کے سوا کچھ بھی نہیں		حسرت آنز کے مزے ان کی ملاقات میں ہیں
سر بسجدہ ہے کوئی، اور کوئی تیغ بکف		اک ہمیں اس رزولیوشن کے خرافات میں ہیں

کونسلوں میں جانا بجائے خود ضعیفی و کمزوری کی دلیل ہے، اس اعزاز پر قناعت وہی لوگ کر سکتے ہیں، جن کا مادۂ خودداری پہلے سے رخصت ہو چکا ہے ؎

کونسل میں سوال کرنے لگے		قومی طاقت نے جب جواب دیا

اس سوال و جواب کا پورا لطف جب ہے جب یہ یاد رہے کہ "سوال کرنا" اردو محاورہ میں خیرات مانگنے کے معنی میں بھی آتا ہے اس وقت تو حالت یہ ہے کہ جس شے کو ہم اپنی ترقی سمجھ رہے ہیں، یہ سب انھیں کی ترقی ہے۔ ہم خوش ہوئے کہ ہم نے اپنی اب نئی یونیورسٹی بنالی وہ مسکرائے کہ غلامی و محکومی کا ایک نیا سانچہ تیار ہو گیا ہم تالیاں بجا رہے ہیں کہ اب تو گورنری تک ہمیں ملنے لگی، صیاد اندر ہی اندر ہنس رہا ہے کہ نادان چڑیا کیسی جلد اپنی اسیری پر راضی اور مطمئن ہو گئی۔ بس اتنا ہی ہوا ناکہ پنجرہ کی تیلیاں لوہے کی جگہ سونے کی دینی پڑیں! اس صورتِ حال کی تصویر کتنی موثر اور سچی، اکبر کے مرقع میں ملے گی ؎

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی		انھیں کی محفل سنوارتا ہوں، چراغ میرا ہے رات اُن کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انھیں کا مطلب نکل رہا ہے		انھیں کا مضمون انھیں کا کاغذ، قلم انہیں کا دوات اُن کی

بُت کدہ میں ہماری عزت کیا خاک ہو سکتی ہے جب سب کو یہ معلوم ہے کہ جو قشقہ ہماری پیشانی پر ہے، وہ بھی ہمارا اپنا نہیں، غیروں کے ہاتھ کا لگایا ہوا ہے، ہماری بے دست و پائی کا نشان اور کلنک کا ٹیکہ ہے۔ سید احمد خانی سیاست، وفاداری کی مسلمہ پالیسی جو ملت پر کہنا چاہیے کہ کوئی ۴۰ سال تک مسلط رہی۔ یہ تمام تر اُسی کی تفسیر و تفصیل بیان ہو رہی ہے ؎

عزت اکبر مثل برہمن در دیر بود		قشقہ بودش بر جبیں، لیکن ز دستِ غیر بود

اپنی اس بے بسی، بے کسی، بے دست و پائی پر ایک اور تشبیہہ سنئے۔ نئی اور لطیف، پھڑکتی ہوئی پھدکتی ہوئی، اسے کمند ڈال کر گرفت میں لانا حصہ تھا اکبر ہی کی ظرافت کا، ذہانت کا ؎

بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں		ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

گویا گوری قوموں کو تو کھلے بندوں آزادی ہے کہ جہاں، جس خطہ میں، جس جتن سے بھی چاہیں، قابض ہو جائیں، حکومت قائم کریں، ہر طرح اُن کی حوصلہ افزائی ہی کی جائے گی، کہ حکمرانی و جہانبانی تو فطری حق صاحب بہادروں کا ہے۔ لیکن کوئی مشرقی قوم، خصوصاً مسلمان، اگر کہیں ذرا بھی سنبھلنا چاہیں، اپنے پیروں اٹھ کر کھڑے ہونے لگیں، تو انھیں روکیے۔ تھامیے، ماریئے پیٹئے، نوچیے پھاڑئیے۔ بلگیریا، سرویا، رومانیہ، یونان، اگر بڑھیں، ترقی کریں، تو یہ ان کا حق ہی ہے، انہیں خوب بڑھائیے پر بڑھاوے ملتے رہیں لیکن اگر ترک و عرب، ایرانی و افغانی، محض اپنی کمر بھی کسنا چاہیں، تو فرنگستان کا گوشہ گوشہ چیخ اٹھے کہ لو، وہ پین اسلامزم، کا ہوا نکل آیا۔ اب مسیحی سلطنتوں کی خیر نہیں! حالات و واقعات کی اس رفتار سے واقف تو اب بچہ بچہ بھی ہو چکا ہے۔ لسان العصر بھی اس حقیقت کو اپنی زبان میں دہراتے چلے ہیں لیکن حالت یہ ہے کہ ہاتھ میں ظرافت کے کھلونے لئے ہوئے ہیں انھیں تو دیدہ سے اچھالتے جاتے ہیں اور زیر لب مرثیہ بھی پڑھتے جاتے ہیں۔ نظریں کھلونوں پر سب کی جمی ہوئی ہیں اور زیر لب آواز ہے کہ کسی کے کان میں آتی ہے اور کسی کے نہیں۔ فرماتے ہیں ؎

سرافرازی ہو "ادنیٰ" کی تو گردن کاٹیے اُن کی		اگر "بندر" کی بن آئے تو فیضِ ارتقا کہیے

کہا جاتا ہے، کہلایا جاتا ہے، کہ عہدِ حاضر کی برکتیں دیکھو خدا کی رحمتوں کی طرح شمار و حساب سے باہر، اسکول ہیں، کالج ہیں، ریل ہے، تار ہے، اسپتال ہیں، امن و امان ہے، وغیرہا۔ عندلیبِ گلشنِ حقیقت جواب دیتا ہے کہ یہ ساری برکتیں مان بھی لی جائیں، جب بھی بلبل تو دلدادہ اپنی قوتِ پرواز کا ہے، اُسے صیاد کا سجا سجایا، رنگین پُر تکلف قفس درکار نہیں ؎

کہا صیاد نے بلبل سے، کیا تو نے نہیں دیکھا　　کہ تیرے آشیاں سے یہ قفس آراستہ تر ہے
کہا اُس نے اسے تسلیم کرتی ہے نظر بندی　　نشاطِ طبع کی مہلک، مگر بیکاری پر ہے

مسلمانوں کے لئے یہی قہرِ الٰہی کیا کم تھا کہ وہ اپنی صداقت، اپنا اخلاص، اپنے ایمان کی پختگی کھو چکا تھا۔ ستم یہ ہوا کہ رہنما کا جامہ پہنے ہوئے "آپ" مل گئے۔ اونٹ راستہ تو بھول ہی چکا تھا، لیکن شاید کہ بھٹکتے بھٹکتے منزلِ مقصود تک کبھی پہنچ ہی جاتا۔ لیکن اب اس کا کیا علاج کہ زمین پر لٹکتی ہوئی نکیل بندر کے ہاتھ آ گئی اور وہ اچک کر اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اب خدا ہی ہے جو کبھی بھی اپنے ٹھکانے تک پہنچ سکے! زبانی خاطرداریوں میں لفظی واہ واہ میں اب بھی کمی نہیں، لیکن یہ مجال کس کی جو مساوات کا کلمۂ کفر زبان پر لا سکے ؎

گم کی تھی میں نے راہ، مصیبت یہی تھی سخت　　اس پر ہوا یہ قہر، تم ایسے خضر ملے
باتیں بھی مجھ سے کیں، مری خاطر بھی کی بہت　　لیکن مجال کیا جو نظر سے نظر ملے
کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگذشت　　دو چار برگِ خشک تو دو چار پر ملے

سرکار کا ادنیٰ سا گوشۂ چشم بھی ہمارے لئے طرۂ افتخار۔ "صاحب" کا ادنیٰ سا التفات بھی ہمارے لئے موجبِ ناز، فرنگیت سے شرمانا کیسا، وہ تو الٹی ہمارے خون میں رچ گئی ہے۔ رُوح میں بس گئی ہے ؎

ان کو بسکٹ کے لئے سوجی کی تھیلی مل گئی
کیمپ میں غل مچ گیا۔ مجنوں کو لیلیٰ مل گئی

بیمار ہم پڑیں تو علاج سرکاری شفاخانوں میں کرائیں بچے پیدا ہوں تو تعلیم سرکار کے جاری کئے ہوئے مدرسوں میں پائیں۔ کورس سرکار کا تیار کیا ہوا پڑھیں، آپس میں لڑیں جھگڑیں تو دروازہ سرکاری عدالتوں کا کھٹکھٹائیں، مدد سرکاری پولیس کی لائیں جاہ و نام کی طلب دل میں پیدا ہو تو خطاب و اعزاز سرکار کے دربار سے حاصل کریں۔ پیٹ خالی ہو، بھوک لگے، تو روٹی کا سوال وہی سرکاری محکموں سے حل کریں۔ غرض سرکار دولت مدار کا دامن عاطفت جو آغوش مادر سے بھی بڑھ کر وسیع ہو گیا ہے، اور ہمیں ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں ہماری مرکزیت سے، ہماری خودی سے دور کرتا جا رہا ہے آخر اس صورتِ حال کا اثر ملت کی سیرت پر کیا پڑے گا اور کیا پڑ رہا ہے! یہ سوال اکثر زبانوں پر ہے، جواب آئیے اکبرؔ کے جامِ جہاں نما میں دیکھیں ؎

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج　　بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید
ہر گام پر جو طاعتِ حق سے الگ پڑا　　ہوتے رہوگے مرکزِ قومی سے تم بعید
ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہو گی جب　　ہو جاؤ گے بتانِ کلیسا کے تم مرید
شاید کہ مدعا بھی تمہارا ہے بس یہی　　ہر چند ابھی ہے درس کے پردہ میں ناپدید
حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا　　حافظؔ کا ایک شعر، جو معنی کو تھا مفید
"سرِ ازل کہ عارفِ سالک بکس نہ گفت　　در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید"

"صاحب" کو اس دیس میں اپنے پرستارانِ وفا کے ساتھ جس درجہ اور جس نوعیت کا تعلق ہے، اور ظاہری خاطر داری کے عقب میں خلوص اور قدر کتنی رہتی ہے، اس کی توضیح و تشریح سے خشک نثر میں اخبارات کے کالم روز ہی لبریز رہتے ہیں، اکبر کی قادر الکلامی نے اس سارے دفتر کو بس ایک مصرعہ میں سمیٹ لیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں دریا کو کوزہ میں بند کرنا۔ مثل تو بہت دفعہ جاتی ہے، صحیح تر مثال اس کی مشکل ہی سے ملے گی ؎

اکبر سے میں نے پوچھ لیا واعظِ طریقت　　دُنیائے دُوں سے رکھوں میں کس قدر تعلق
اس نے دیا بلاغت سے یہ جواب مجھ کو　　انگریز کو ہے ٹیٹو سے جس قدر تعلق

سینکڑوں پُرجوش اخباری مضامین، سینکڑوں شعلہ بار سیاسی تقریریں، ان چار مصرعوں کی بلاغت جامعیت نکتہ وری پر قربان ہیں!

بیرونیوں اور مدیسیوں کی کفش برداری سے تو اپنوں کی غلامی، چاہے وہ اپنے کوئی بھی ہوں، بہرحال صورت بہتر ہے اس خیال کو ذرا دیکھئے کس مزے سے ادا کیا ہے ؎

دُھن دیس کی تھی جس میں گاتا تھا اک دہاتی　　بسکٹ سے ہے ملائم، پوری ہو یا چپاتی

"دیس" کے معنی وطن کے تو ظاہر ہی ہیں، باقی دیس ایک راگنی کا بھی نام ہے۔ گانا، دُھن، دیس، اب سب اکٹھے ہوگئے بسکٹ کا اشارہ صاحب کے میز کی طرف، پوری کا ہندو کی رسوئی کی طرف اور چپاتی کا مسلمان کے باورچی خانہ کی طرف بالکل کھلا ہوا ہے۔

ہندیوں کی باہمی ناچاقی، ضرب المثل کی حد تک پہنچی ہوئی ہے "صاحب" بھی اس رمز سے خوب آگاہ ہیں۔ جب کبھی اس آگ کو سرد ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں، تو کبھی بندش ذبح گاؤ" مشغلہ چھوڑ دیا۔ کبھی ہندی زبان اور دیوناگری حروف کا قصہ لے بیٹھے۔ مسجد کے آگے باجہ کا سوال چھیڑ دیا، اور اب تو نہیں لیکن کچھ روز قبل تک ایک بڑا ہوا "حملۂ افغانستان" کا بنا کر پیش کر دیا۔ اکبر کی نگاہِ دور رس نے تاڑ لیا کہ اہم ترین مسئلہ زبان کا ہے۔ زبان کے معاملے میں جب تک سارا ملک رواداری برتنے کے لئے تیار نہ ہوگا، اتحاد وطنی کی گتھی کسی طرح نہ سلجھے گی۔ اپنے ہم وطنوں کی سادہ مزاجی، کم فہمی و نادانی پر تاسف و حسرت کے آنسو بہاتے ہیں ؎

کہتا ہے مجھ کو جو کچھ سُنیئے گا اس صدی میں　　پُوچھا کہ اس صدی میں کیوں چپ رہ گئے جی میں
بولے کہ یہ صدی ہے اس بحث اور بیاں میں　　کہتا ہے جو، کہیں ہم وہ کون سی زباں میں
سُن کر یہ بات ان سے ہر ایک کو آیا چکر　　ایک صاحب بصیرت چلتے ہوئے یہ کہہ کر
پیر فلک نہ کیونکر ابواب بحث کھولے　　جیتے رہیں گُروجی، زندہ رہیں یہ بھولے

غیر ملکی حکومت کی بدگمانیاں اور سخت گیریاں، خُدا کی پناہ! بات بات پر شبہ، بے بات کی بات پر گرفت، خود غزلیہ اور عاشقانہ شاعری کے اندر بھی غدر، بغاوت، قانون شکنی کے جراثیم سرکاری خوردبین میں عیاں۔ اس دارو گیر کی لطیف و شاعرانہ تصویر، شاعر کے نگار خانہ میں ملاحظہ ہو ؎

اِک غزل میں اتفاقاً میرا اک مصرعہ یہ تھا　　دیدۂ عبرت سے رنگِ دَیرِ فانی دیکھئے
کوئی بول اُٹھا، زوالِ حسنِ بُت مقصود ہے　　اس سخن میں بدشگونی کی نشانی دیکھئے

عارفانہ شاعری بھی آجکل دشوار ہے　　بزمِ دنیا میں، یہ زورِ بدگمانی دیکھئے

اکبر کی آپ بیتی بھی اس سلسلہ میں سننے کے قابل ہے ۔ ۱۹۱۴ء میں جب یورپ کی جنگ عظیم شروع ہوئی ہے، تو یاد ہوگا کہ بالکل ابتدا میں اعلانِ جنگ صرف آسٹریا اور سردیا کے درمیان ہوا تھا ۔ برطانیہ اس وقت تک الگ تھا، اکبر نے معاً ایک نظم کہی ۔ ایک مصرعہ یہ تھا ؎

بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

مسجد کانپور کے سلسلے میں گولی چلنے اور مسلمانوں کے شہید ہونے کا واقعہ تازہ تھا ۔ خونِ شہیداں" کی تلمیح اس جانب سمجھی گئی اور شاعر صاحب دھر لئے گئے ۔ اکبر صاحب بھی نرے شاعر تھے ۔ کوئی دار و زندان کے مرد میدان تو تھے نہیں ۔ اعلان کر دیا کہ بہت اچھا، آئندہ شعر گوئی ہی سے توبہ، نہ معلوم کس وقت کیا نکل جائے، اور آپ کیا گرفت کر بیٹھیں ۔ لیکن رند قدح خوار کی طرح شاعر کی توبہ ہی کیا، اور کے دن کی ! توبہ کیجئے ! خیر کچھ دن ظاہر کی تو احتیاط رہی بھی لیکن تخلیہ کی مجلسوں میں، قاضی و محتسب کی دست رس سے دور، شغل اس وقت بھی جاری ہی رہا، ایک آدھ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

سینے ادھر لیے کہ سہیں جورِ رفل بھی
کان اُن کے وہ نازک کہ گراں میری غزل بھی

حکم اکبر کو ملا ہے کہ لکھو اشعار　　خواجہ حافظ بھی نکالے گئے میخانے سے

جنگ یورپ کی تلمیحوں سے اس دور کی غزلیں تک خالی نہیں ۔ نئی نئی تشبیہیں، میدانِ جنگ سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ لاتے ایک غزل کا مطلع ہے ؎

یہ بت دل میں گھسے آتے ہیں جرمن کا ستم بنکر　　میر التقویٰ کہاں تک اف کو روکے بلجیم بن کر[1]

یہ کونسلیں، یہ اسمبلیاں، یہ ووٹ بازیاں، اور الکشن جنگیاں، یہ علامتیں ہیں ہماری ترقی اور آزادی کی ! یا مزید حلقے ہیں زنجیر غلامی کے، اور ہمارے حق میں مزید پھندے ؟ اکبر کے ہاں یہ تعلیم بار بار اور وضاحت کے ساتھ ملتی ہے ۔ ایک جگہ ارشاد فرماتے ہیں ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا　　اچھے اچھے ووٹ پہ شیدا
کیوں نہیں پڑتا عقل کا سایہ　　اس کو سمجھیں فرض کفایہ
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی　　سیلف گورنمنٹ کے آگے آئی
پاؤں کا ہوش، اب فکر نہ سر کی　　ووٹ کی دھن میں بن گئے پھرکی

ایک دوسری جگہ ان کی دور اندیشی، قوم کی غفلت و کوتاہ بینی کی تصویر یوں پیش کرتے ہیں ۔

ہاؤن تو ہے ہوس کا، دستہ ہے پالسی کا　　لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا !!
ہے کوفت لیکن اس پر مسرور ہو رہے ہیں　　ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں
اس قبیلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو　　اس باغ میں خزاں کی اکبر، بہار دیکھو
لکھے گا کلکِ حسرت، دنیا کی ہسٹری میں　　اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

---

[1] پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کا حملہ اتحادیوں پر بلجیم کے راستے سے ہوا تھا، اور بلجیم بیچارہ پہلی ہی زد میں گر گیا تھا ۔

ایک اور مقام جہاں شاعرانہ دُور بینی اور حقیقت سنجی، اس ظاہر فریب اور اوپر سے خوش نما منظر کو یوں بے نقاب کر رہی ہے

نیشو ہے نمود کا محتاج　　　کونسل تو اُن کی جن کا ہے راج
کہتے جاتے ہیں یا الٰہی!　　　سوشل حالت کی ہے تباہی
ہم لوگ جو اس میں پھنس رہے ہیں　　　اغیار بھی دل میں ہنس رہے ہیں
دراصل نہ دین ہے نہ دنیا　　　پنجرہ میں پھدک رہی ہے مینا
اسکیم کا جھولنا وہ جھولیں!　　　لیکن یہ کیوں اپنی راہ بھولیں

مئی و جون کی گرم گرم لُو، اور تپش میں باہر نکلنا ہر ایک کا کام نہیں ۔ قاضی و محتسب کی پکڑ دھکڑ کی گرما گرمی دیکھ شاعر غریب کو اپنی خیریت تو اسی میں نظر آتی ہے کہ زبان بند رکھی جائے اور بات کرنے کے لئے انتظار کسی مناسب موسم کا رہے بے فصل اگر بیج ڈال دیا جائے تو پودا ہرگز نہ اُگے گا ۔ کہتا ہے کہ جس طرح ایک وقت گفتگو کا ہوتا ہے، اسی طرح ایک موقع سکوت و بے تعلقی کا بھی ہوتا ہے، اور آج وہی موقع ہے ؎

گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصہ لیکن　　　کس سے کہئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو
داستانِ غمِ دل کون کہے، کون سُنے　　　بزم میں موقعِ اظہارِ خیالات تو ہو
عدمِ نشو و نما ہے نہ کہو تخم کو بد　　　وقتِ بالیدگیِ تخم و نباتات تو ہو

تینوں شعر سوز و درد کی تصویر ہیں، اور انفرادی و اجتماعی دونوں پہلوؤں کو لئے ہوئے ۔

پھر کہتا ہے کہ ؎　　　زمانہ نے مساعدت کی، تو کبھی ہماری بھی زبان کھلے گی
ورنہ یہ سکوت، سکوتِ اجل سے ہم آغوش کر رہے گا

ہم اس زمانے میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے　　　ہوا ہی بدلی ہوئی ہے، فلک سے کون لڑے
خدا ہی ہم کو اٹھائے گا جب تو اٹھیں گے　　　ابھی تو چپ ہیں کوئی لاکھ اعتراض جڑے
اگر اُٹھے تو عَلَم اپنا گاڑ لیں گے کہیں　　　جو اٹھ گئے تو ہے قصہ ہی ختم، خود ہی گڑے

حق پرستوں کے لئے کھلے ہوئے راستہ تو دو ہی ہیں، یا سیدھے سیدھے اس دارِ فانی سے رخصت ہو جائیں، اور یا صبر کے تلخ گھونٹ حلق سے اتارتے رہیں ؎

حق پرستی کا نشاں اب قبر ہے یا صبر ہے　　　اور جو کچھ ہے عقیدوں پر فقط اک جبر ہے

فرماتے ہیں کہ مومن کے لئے فضا یکسر تاریک، ماحول تمام تر ناسازگار، ہر ہوا جو چلتی ہے ناموافق ۔ اہلِ ایمان کے لئے اس عالمِ یاس و حرماں میں بھی بھروسہ صرف رحمتِ باری کا تاریک خانہ میں بھی ایک شعاعِ اُمید ؎

جب آنکھ کو کھلنے میں ہو جھجک، جب منہ میں زبان جنبش سے ڈرے
اس قید میں کیونکر جینا ہو، اللہ ہی اپنا فضل کرے

کیا ناز ہو ایسی ساعت پر، افسوس ہے ایسی حالت پر　　　یا جھوٹ کہے، یا کچھ نہ کہے، یا کفر کرے یا کچھ نہ کرے
قاتل کو بھروسہ قوت کا، اور ہم کو خدا کی رحمت کا　　　ہونا تھا جو کچھ وہ ہو ہی لیا، وہ بھی نہ رکا ہم بھی نہ مُڑے

"صاحب" کا ساتھ دیجئے تو دین رخصت، بے نیازی اختیار کیجئے تو دنیا رخصت ؎

بے گزٹ ہو کے جو چلئے تو محلّے میں حقیر — با گزٹ ہو کے جو رہیے تو فرشتوں میں خفیف

"گزٹ" کے لفظ سے بھی اکبر نے خوب کام نکالے ہیں۔ کہتے ہیں کہ بے سرکاری تعلق کے بغیر سرکاری اعزاز کے ہو کر رہیے تو دنیا میں کون بات پوچھے گا؟ مادی تعلق، منصب و اعزاز کو ذہن میں رکھئے تو پھر دین سے ہاتھ دھو رکھئے۔

اور تو اور، آپ اپنے کو محض مسلمان کہنا اور کہلانا بھی تو مشکل ہو گیا ہے۔ ادھر آپ نے اعلان اپنے اسلام کا کیا، اُدھر روشن خیالی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اور آپ مضحکہ کے ہدف بن کر رہے۔ مسلمان کہلانے ہی پر اگر آپ کو اصرار ہے تو چارہ بجز اس کے نہیں کہ اپنے کو تجدد کا بندہ، صاحب زدہ مسلمان کہلائیے ؎

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے — میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رازِ پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے — اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ — ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے، خانساماں ہے

لیکن اس ساری پستی و ادبار کے اسباب اکبر کی تشخیص میں خارجی نہیں داخلی ہیں، جن مصائب کے ہم شکار ہو رہے ہیں یہ خود ہمارے ہی ہاتھوں کے پیدا کئے ہوئے ہیں۔ ہم نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اغیار ہم پر دلیر ہو گئے، ہم نے اپنے ملّی طور طریقوں کو خیر باد کہا۔ اغیار ہم کو نگلنے لگے۔ ہم نے اپنوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی تقلید و نقالی شروع کی بیگانوں نے دیکھتے دیکھتے ہم کو زیر کر دیا۔ جھاڑو جب تک بندھی ہوئی ہے۔ تیز سے تیز آندھی میں بھی محفوظ ہے، اِدھر اس کا مٹھا کھلا، اُدھر اس کی ایک ایک سینک ہوا کے ہر معمولی جھونکے کے رحم و کرم پر رہ گئی۔ قوم کا شیرازہ قائم رکھنے والی شے تو صرف قوم و ملت میں خودی و خودداری کا احساس ہے۔ اقبال کی شاعری کا تو خاص موضوع ہی یہی ہے۔ لیکن اس کی جھلکیاں اکبر کے یہاں بھی موجود ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

طریقِ حکمت و تزئیں ہر ایک رنگ میں ہے — نہ یہ سمجھ کہ فقط مغربی ہی ڈھنگ میں ہے۔
نگاہِ غور کر سوئے ٹرکی و ایران! — نئی بنا پہ حریفوں نے کر دیا ویران!
تمھارے دل میں یہ کیا وہم کیا گماں آئے — تمھارے جسم میں کیوں دوسرے کی جاں آئے
جو تو نے بھائیوں کا اپنے ساتھ چھوڑ دیا — تو دستگیر نے تیرا بھی ہاتھ چھوڑ دیا
جو بات ٹھیک ہے، کہتا ہوں میں اسے کھل کر — کہ سلطنت نہ سہی، تم رہو تو مل جل کر

لیکن آج جو بڑے بڑے اقبالمند نظر آتے ہیں، ان کی بھی اقبال مندیاں، خوش بختیاں کامرانیاں کب تک؟ کے دن کے لئے؟ ایک دن احتساب کا آخر ان کے لئے بھی آنے والا ہے، جہانِ فانی کو فانی سمجھنے والا مشرقی شاعر اس انجام کی خبر کبھی کبھی ان بدمستوں کے کان تک پہنچا دیتا ہے ؎

مجبور بدل جانے پہ یہاں اقبال و حشم کے دور بھی ہیں — یکتائی کا دعویٰ خوب نہیں، اللہ کے بندے اور بھی ہیں

کہیں یہ فقیر مدہوشانِ غفلت کے قصر و ایوان کے سامنے اگر صدائے عبرت بلند کرتا ہے ؎

ہرج کیا وقعت نہیں میری جو بزمِ غیر میں — غیرتِ مسلم ہے اس کی کس مپرسی دَیر میں
تار برقی سے ہوا معلوم حالِ زارِ روس[1] — شور برپا ہے کلیسا میں حرم میں دَیر میں

---

[1] اشارہ ہے ۱۹۱۷ء کے عظیم الشان انقلاب روس کی جانب۔ زار شاہی کا خاتمہ آناً فاناً ہو گیا۔ زار روس اپنے وقت کا سب سے بڑا فرعونِ باسامان، اگلے جباروں کی زندہ یادگار تھا۔

آسمانی توپ چلتی ہے کہیں صدیوں کے بعد لیکن اُڑ جاتی ہیں ساری غفلتیں دو فیر میں

اور کہیں اپنوں اور بیگانوں دونوں کو حدودِ انسانیت کے اندر رہنے کی موعظت و تلقین کرتا ہے ؎

تم مِلو یا نہ ملو مجھ سے، مَنو یا نہ مَنو ساتھ رہنا ہے اسی مُلک میں اے ہم وطنو
اہلِ مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد آسماں تنگ ہو تم پر، مگر اتنا نہ تنو

ذیل کا شعر اس وقت کا ہے جب پہلی جنگ عظیم کے خاتمہ پر صلح نامہ مرتب ہو رہا تھا اور اس کا خاص اہتمام تھا کہ اب کی یورپ کی تنظیم جدید کی جو قبا تیار ہو، اس کا دامن بھی ترکوں کے وجود کی نجاست سے پاک رہے ؎

کو دانہ ترنگیں قوت کی کچھ فائدہ، ان کو دیں گی نہیں نقشوں میں لکیریں کھینچنے سے فطرت کی حدیں بدلیں گی نہیں

واہ، واہ، واہ، دوسرا مصرعہ تو اپنی بلاغت، ایجاز و جامعیت کے لحاظ سے اس قابل ہے کہ زبان میں ایک مستقل ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرے۔

آج جنھیں اپنی طاقت و توانائی پر غرّہ ہے، کیا انھوں نے کبھی خیال نہیں کیا کہ شمع نے دم بھر میں سینکڑوں پروانوں کی جانیں لے ڈالیں، لیکن خود صرصرِ فنا کے ایک طمانچہ کے سامنے مغلوبِ نور تھی۔ ہاتھی نے ایک قدم اٹھاتے ہی صدہا چیونٹیوں کو کچل ڈالا، لیکن قضائے الٰہی کے پیلتن کی ہلکی سی ٹکر کے سامنے تودۂ خاک تھا۔ طاقتوروں نے کمزوروں کو، زبردستوں نے زیردستوں کو، سرمایہ داروں نے ناداروں کو تختۂ مشق ہمیشہ ہی بنائے رکھا ہے۔ لیکن انجام بھی ہمیشہ ہی کیا ہوتا رہا ہے؟ اس کا جواب مصر کے فرعونوں کی لاشیں، روما کے قیصروں کی ہڈیاں، بابل کے کھنڈر، اسیریا کے ویرانے مذبوح و مقتول زارِ روس کے جسم کی تڑپ اور زندہ درگور قیصرِ جرمنی کے دل کی حسرتیں دیں گی۔ اکبر کا مرقعِ سیاست یہ تصویر بھی رکھتا ہے ؎

شک اس میں کیا ہے کہ ساری دنیا ہے آج ان کی رفل کی زد پر
اشارہ فطرت کا ہے مگر یہ کہ خود بھی ہیں وہ، اجل کی زد پر

سنتِ الٰہی ایک یہ رکھی گئی ہے کہ سفینۂ ظلم و جور چشم زدن میں غرق ہو کر ضرور رہتا ہے۔ لیکن شروع میں نہیں، قہر و انتقام کی لہریں چاروں طرف سے لپکتی صرف اس وقت ہیں، جب پہلے خوب مہلت مل چکتی ہے اور تمرد و رعونت، خود فراموشی و خدافراموشی کی کشتی حد سے زیادہ ہی بھاری ہو چکتی ہے۔ اکبر کی ذہانت اس اٹل حقیقت سے یہ مضمون پیدا کرتی ہے کہ دامنِ مشرق کو پارہ پارہ کرنے میں یورپ عجلت کیوں کر رہا ہے۔ جب تک اس طغیان و تمرد کی کشتی پوری طرح گرانبار نہ ہو چکے گی، غضبِ الٰہی جوش میں نہ آئے گا، گویا اس مشغلہ میں دیر تک مصروف رہنا، آنے والے یوم احتساب کو ٹالتے رہنا ہے ؎

یورپ کو پالسی میں عجلت کی کیا ضرورت ہے ملتوی قیامت تقسیم ایشیا تک

اس تمام سیاسی کشمکش و بین الاقوامی آویزش سے جو بربادیاں اور ہلاکتیں پیدا ہونے والی ہیں ان سے تو اب کسی کو بھی انکار نہیں، البتہ سوال یہ ہے کہ آخری فتح کس کے ہاتھ رہے گی؟ "صاحب" اور صاحب زدوں کا کہنا یہ ہے کہ آخری جیت، ہمت و حوصلہ مندی، باقاعدگی و خوش نظمی "علم" و "روشن خیالی" تہذیب و شائستگی کی رہنا یقینی ہے۔ اکبر کا فیصلہ یہ ہے کہ مشیتِ الٰہی تائید اسی فریق کی کرے گی جو نیکوکار ہے اور حسنِ عمل کے حصار میں پناہ گزیں ہے۔ اور استادی کا کمال یہ ہے کہ اس وعظ خشک میں بھی زندہ دلی کی ادائیں بھر دی ہیں ؎

شامت آئی ہے یہ مسلّم ہے | بحث اتنی ہی رہ گئی کس کی ؟
میری جانب اشارہ غالب ہے | یعنی اکثر یہ کہتے ہیں اس کی
خیر جو کچھ خدا کی مرضی ہو ؟ | کھل ہی جائے گا ، آئی ہے جس کی
اس قدر تو مجھے بھی کھٹکا ہے | بڑھ گئی ہے بہت مری دھسکی

اہل ملک کے لئے اس صورت حال کا آخر علاج کیا ہے ، جتنی زبانیں ، اتنی باتیں ، اکبر کی تشخیص اور طریق علاج سب سے مختلف ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ پرندہ جال میں کیوں پھنسا ؟ کس نے اسے مجبور کیا ؟ کسی نے بھی نہیں ، بجز خود اس کی ہوس وطمع کے ، اکبر بے نیازی ، بے طمعی ، بے غرضی کا آئیڈیل (مطمح نظر) پیش کر کے سیاسیات کے ساتھ ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر تصوف کی تعلیم دیئے جاتے ہیں ؎

ہو مجھ پہ بتوں کی چشم کرم دل کو یہ طلب اصلا نہ رہی
مجھ کو بھی خدا نے غیرت دی ، ان کو جو مری پروا نہ رہی
دنیا کا تردد جب تک تھا ، جب تک ہم اس کے طالب تھے
پھیری جو نظر غم ہو گئے کم ، رغبت نہ رہی ، دنیا نہ رہی
سچ پوچھے تو راحت ہی مل دنیا سے جدا ہو جانے میں
تھوڑی سی اداسی ہے بھی تو آفت تو مگر برپا نہ رہی

تحریک " ترک موالات " جو ان کے زمانہ میں چلی ، اکبر اس سے متفق ضرور تھے پھر بھی تحریک کے علم برداروں میں بڑی خامیاں پاتے تھے ۔ کہتے تھے ، یہ بھی کوئی جنگ ہے ، کہ روٹی نہ ملی ، نوکری نہ ملی تو حکومت سے بگڑ بیٹھے اور روٹھ کر جھنجھلاہٹ میں لگے غصہ اسی پہ اتارنے ، مولوی ہوں یا گریجویٹ ، جھنجھلاہٹ وہی بھوک ہے ؎

نئی روشنی کا ہوا تیل کم | حکومت نے اس سے کیا میل کم
ادھر مولوی کس مپرسی میں تھے | نہ آفس میں تھے ، اور نہ کرسی میں تھے
یہ ٹھہری کہ آپس میں مل جایئے | سیاسی کمیٹی میں چل جایئے !
اسی روشنی کا ہے بس یہ ظہور | خدا جانے ظلمت ہے اس میں کہ نور ؟

حضرت اکبر نے شخصیتاً اپنا دامن ہمیشہ ہر قسم کی سیاسی مجلسوں سے الگ رکھا ، ان کا مطمح نظر وطن کے بجائے عاقبت ملک کے بجائے حقانیت ، اور قوم کے بجائے خدا تھا ۔ اس لئے جن مجلسوں میں سب کی زبانیں چلتیں ، وہ خاموش رہتے اور اس خاموشی کی تعلیم دوسروں کو بھی دیتے ہیں ؎

آزادی کا شور مبارک | یہ تقلیدی زور مبارک
میرا تو ہے اور ہی منظر | میں تو یہ کہتا ہوں اکبر
عارف کو بے ہوشی زیبا | عاقل کو خاموشی زیبا

ان کے خیال میں سیاسی ، ملکی ، ملی ، اجتماعی ، ہر مرض کی دوا ایک ہی تھی ، طاعت ، عبادت ، عبدیت ، مومن کے لئے ابتلا و آزمائش کا وقت آنا لازمی ہے ۔ مومن وہی ہے جو اس آزمائش میں پورا اترے اور انتہائے کرب و اضطراب میں بھی

نظر شانِ مطلق پر رکھے۔ اس مضمون کو لے کر پوری ایک غزل کہہ ڈالی ؎

مسجد میں خدا خدا کئے جاؤ — مایوس نہ ہو دعا کئے جاؤ
ہرگز نہ قضا کرو نمازیں — مرتے مرتے ادا کئے جاؤ
کتنا ہی ہو وقت بے حجابی — تم پیروئ حیا کئے جاؤ
امید شفا خدا سے رکھو — کیوں ترک کرو دوا کئے جاؤ

غلامی و محکومی کا راز صرف یہ بتاتے تھے کہ ہم نے بدی کو نیکی پر ترجیح دے رکھی ہے۔ سلطنت و حکمت تو مادی حیثیت سے خلافت و نیابت الٰہی ہے۔ آج ہم اپنے ایمان کو زندہ اور اخلاق کو درست کرلیں تو مادی غلبہ بھی حاصل کرلیں ؎

قوتِ ایمان سے کہہ دو سب کو سمجھاتی رہے — نیکیاں کثرت سے ہوں، مغلوبیت جاتی رہے

اس حقیقت کا مشاہدہ، تاسف و حسرت کی نظروں سے کرتے تھے کہ نام وطنیت و قومیت کا لے لے کر ساری دنیا، کیا مشرق اور کیا مغرب، غرض مندیوں کے لئے ایک دوسرے سے مصروفِ کارزار ہے۔ خوفِ خدا، حق پرستی کا وجود روز بروز عنقا ہوتا جاتا ہے۔ اور اس لئے دنیا میں ہر روز ایک نئی تکلیف کا اضافہ ہو رہا ہے ؎

دینِ خدا ہے حق کی تسلی کے واسطے — دنیا بنی ہے اپنی تعلّی کے واسطے
عارف جو ہیں رہیں گے وہ اللہ ہی کے ساتھ — اللہ ہی ہے اُن کی تسلی کے واسطے

سلطنتوں کا عروج و زوال، زمانہ کی معمولی دھوپ چھاؤں ہے۔ آج اس قوم کا طبل اقبال بج رہا ہے۔ دولت کا تاج ایک قوم کے سر پر ہے، کل دوسری کے، یہ مد و جزر، زمانہ کے سمندر میں ہر وقت، اور ہر آن لگا رہتا ہے۔ ترک اگر اس وقت حکومت سے بے دخل کئے جا رہے ہیں تو یہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے[1]۔ ماتم انگیز حقیقت یہ ہے کہ ہمارا صبر و عزم، غیرت و خود داری، صدق و ثبات ہم سے رخصت ہو رہا ہے۔ اور ہم روز بروز بجائے توفیق الٰہی اور قوتِ ذاتی پر اعتماد کرنے کے دوسروں کے محتاج و دستِ نگر ہوجاتے ہیں، حسرت ہماری اس قلب ماہیت پر نوحہ کرتی۔ اور عبرت آنسو بہاتی ہے ؎

انتظامی بات ہے یہ، ہوتی رہتی ہے یونہی — اس کا کیا شکوہ جو ہم پر اس کو غالب کر دیا
ہاں یہ ہے افسوس، ہم سے چھن گیا صبر و قرار — طالبِ حق کو فلک نے اس کا طالب کر دیا

اس وقت دنیا صرف "صاحب" ہی پر کھوڑے ہی مسلط ہے، ہماری ساری جد و جہد کا مرکز بھی تو دنیا اور محض دنیا رہ گئی ہے۔ اس سے آگے کی دور بینی رخصت، فلاح کی صورت صرف یہ ہے کہ ہم سے سر رشتۂ صبر بہرحال نہ چھوٹنے پائے ؎

ارماں بہ قدرِ طاقت ہر سو نکل رہے ہیں — "صاحب" تو اُڑ رہے ہیں اور ہم اچھل رہے ہیں
غصّہ میں ہیں ہم اُن پر، وہ ہم پہ ہنس رہے ہیں — دامِ فریب دنیا میں دونوں پھنس رہے ہیں
دونوں کو چاہئے کہ طاقت سے منہ نہ موڑیں — وہ اپنا جبر چھوڑیں، ہم صبر کو نہ چھوڑیں

---

[1] جس عہد کے کلام پر یہ گفتگو چل رہی ہے، ترک اس وقت دنیا میں اسلامی اقتدار کے سب سے بڑے اور زبردست نمائندہ تھے۔ سلطان المعظم اس وقت تک خلیفۃ المسلمین تھے، اور خادم الحرمین الشریفین۔ ترکوں کو جنگِ عظیم اول میں جو شکست ہوئی (۱۹۱۸ء) یہ محض ایک سلطنت یا جغرافی اقلیم کی شکست نہ تھی، عالم اسلام نے اسے اپنی شکست اور اپنے اوپر ضرب کاری سمجھا۔ ہندوستان میں جو عظیم الشان و بے نظیر تحریک، تحریک خلافت کے نام سے قائم ہوئی وہ اسی کا اس کا نتیجہ تھی۔

تحریکِ ترکِ موالات کو درجۂ قبول صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے، جب اس ضابطہ کی پہلی دفعہ کلمۂ عبودیت ہو نہ یہ کہ اس کی بناء خود بینی پر ہو کہ یہ تو عین ابلیسیت[1] ہوئی ؎

ثواب جب ہے کہ نا خوش ہو اس بنا پر تم | کہ دل کو طاعتِ حق سے یہ دُور کرتے ہیں
نہ یہ کہ عیش میں میرے ہیں یہ خلل انداز | ہمیں ضعیف سمجھ کر غرور کرتے ہیں

یہ تو سنجیدہ گفتگو تھی ورنہ جب ہنسنے ہنسانے پر آتے ہیں تو تحریکِ ترکِ موالات سے الگ رہنے کی وجہ کچھ اور ہی بیان کرتے ہیں، اس کی حیثیت "خانگی" اتنی ہے کہ کسی نا محرم کی زبان سے ادا ہونے کے لائق نہیں، بہتر ہوگا کہ اسے خود انھیں کی زبان سے سُنیئے ؎

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا | اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یہ شعر سنا کر بولے کہ "یہ بھی آپ سمجھے، میں نے اپنے کو مدخولۂ گورنمنٹ کیوں کہا؟ پنشن پاتا ہوں نا؟ ملازمت میں ہوتا تنخواہ پاتا ہوتا، تو مدخولہ نہیں منکوحہ کہتا۔"

---

[1] جولائی ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں نیاز حاصل ہوا (آہ کہ وہی آخری ملاقات تھی) میرے اوپر نشہ تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کا سوار تھا۔ "مہاتما" گاندھی کی روحانیت اور تقدس کی تعظیم و احترام میں سرشار تھا، بات بات پر ان کی بزرگی اور حیثیت کا حوالہ، دل میں اس کی آرزو کہ حضرت اکبر پر یہ جادو چل جائے۔ دو چار منٹ تو صبر کیا، اس کے بعد ایک بارگی پوچھ بیٹھے۔ "اچھا صاحب آپ تو گاندھی جی کی روحانیت کے بڑے قائل ہیں۔ اپنی اس کمیٹی میں داخلہ کی پہلی شرط انھوں نے لا الٰہ الا اللہ تو ضرور ہی رکھی ہوگی؟" —— میں ساری چوکڑی بھول گیا۔ مری ہوئی آواز سے جواب دیا کہ جی نہیں، ایسا تو نہیں۔" بولے۔ "بس تو مجھے بھی آگے کچھ پوچھنا نہیں۔ ایک سیاسی انجمن ہے، جیسی اور بہت سی انجمنیں آج کل ہیں۔"

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

جب تنقید کی گرفت یا گرم بازاری زیادہ ہوجاتی ہے تو تصانیف بے جان نہیں تو نیم جان ضرور ہونے لگتی ہیں۔ آج کل اردو پر تنقید کا دورہ پڑ رہا ہے۔ جہاں جائیے جس سے ملئے یا تو نقاد ہوگا یا نیتا۔ ایک ادب کا لاگو دوسرا آبرو کا! ہمارے نقاد کی سب سے بڑی الجھن یہ ہے کہ اردو کے تمام لکھنے والے روس میں کیوں نہ پیدا ہوئے۔ ایک ایک دو دو کرکے کیوں پیدا ہوئے بیک وقت سارے کے سارے کیوں نہیں! اور اب جبکہ ان باتوں میں سے ایک بھی وقوع میں نہ آئی تو پھر یہ تمام شاعر اور ادیب عرض البلد ۴۸ پر کام کیوں نہیں آجاتے!

تعلیم دینے کے ہر زمانے میں طریقے مروج رہے۔ پہلے تعلیم بذریعہ دراز دستی دی جاتی تھی۔ یہ زمانہ فاقہ مستی کا تھا۔ اس کے بعد تعلیم بذریعہ دست کاری ہوئی۔ یہ زمانہ تنگدستی کا تھا۔ اس کے بعد تعلیم بذریعہ چابکدستی ہونے لگی۔ یہ زمانہ چور بازاری کا تھا آخر میں تعلیم بذریعہ زبان درازی دی جانے لگی اور یہ زمانہ آزادی کا ہے۔ موجودہ تنقید نگاری اس تعلیم کا نتیجہ ہے یا خود تعلیم اس تنقید کی پیداوار۔ کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے!۔

مذہب اپنے تاریک سے تاریک زمانے میں بھی اس حد تک مضحکہ خیز یا بلائے جان نہ رہا ہوگا۔ جتنی تنقید آج بیسویں صدی کی وسط میں ہے، سائنس، فلسفہ، معاشیات، سیاسیات یا قوت مردمی کے سلسلہ میں کوئی ایسا نظریہ دریافت نہ ہوا ہوگا جسے ہمارے نقادوں نے اردو شاعری و ادب پر چسپاں نہ کیا ہو۔ جو نظریہ جتنے زیادہ فساد یا فضیحتے کا ہوگا اتنی ہی شدت و شوق سے اسے شعر و ادب پر چسپاں کریں گے۔ جن انکشافات سے انسانوں کا تباہ کیا جانا آج کل بڑا کارنامہ سمجھا جاتا ہو ان سے شعر و ادب کو مسمار کرنے میں مضائقہ کیا!

ایک عرصہ سے دنیا اضطراب و ہیجان میں مبتلا ہے۔ زندگی کی کشتی کچھ اس طرح ڈانواڈول ہے کہ ذہن و فکر کا توازن قائم نہیں رہا، ہر بددلی بیزاری اور بدچلنی کا جواز سائنس فلسفہ یا سیاسیات کے نظریات میں مل جاتا ہے۔ لوگ سمجھنے لگے ہیں کہ زندگی عبارت ہی ہے فسق و فساد سے۔ کچھ سمجھتے ہیں اور ایک حد تک صحیح سمجھتے ہیں کہ جس طرح شدید اشتعال یا مایوسی میں شدید جرائم کی سزا ہلکی یا معاف ہو جاتی ہے، اسی طرح موجودہ بدحالی یا بدامنی میں شعر و ادب میں کیسی ہی بے راہ روی یا نالائقی کیوں نہ برتی جائے محاسبہ یا مواخذہ کا کوئی اندیشہ نہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس طرح کی حرکتوں کو سراہنے والے بھی کافی تعداد میں مل سکتے ہیں!

علوم اصول و نظریئے دریافت کرتے ہیں۔ علوم ہی ان کی رد و بدل کرتے رہتے ہیں۔ علم کا کام ہی یہ ہے، تجربات و معلومات

کے ذخیرے میں اسی طرح اضافہ ہوتا آیا ہے۔ لیکن کس نظریئے کو کہاں اور کب برسرِکار لانا چاہیئے۔ اس طرف ہماری نظر کم جاتی ہے۔ فرائیڈ کا نظریۂ شتراکیت کے اصول، آٹم بم کا انکشاف اپنی اپنی جگہ پر مسلّم اور مبارک لیکن کسے کہاں اور کب کام میں لانا چاہیئے یہ بھی کچھ کم اہم بات نہیں ہے۔

اگر شاعری اور انشاپردازی میں معنی محل مزاج اور موسیقی کے اعتبار سے مناسب الفاظ اور فقروں کا استعمال کیا جانا ضروری ہے یہی نہیں بلکہ کنایہ اور صراحت تک کی ناپ تول مقرر ہے تو پھر اور زیادہ ضروری ہے کہ زندگی (جو سب سے بڑی شاعری اور انشاپردازی ہے) کے سلجھانے سنوارنے میں انتہائی احترام، احتیاط اور ایمانداری سے کام لیا جائے!

انسان پہلے عناصر کی دستبرد میں تھا جن سے بڑی حد تک سائنس نے اسے نجات دلائی۔ اب وہ سائنس کی دستبرد میں ہے ظاہر ہے اس دستبرد سے بھی نجات پانے کی سبیل اسی کو کرنی پڑے گی۔ اسے سائنس کو انسانیت میں ڈھالنا پڑے گا۔ ادب کا رشتہ براہِ راست انسانیت سے ہے اس لئے ادب اور سائنس میں توافق پیدا کرنا ہر ادیب اور سائنسداں کا فرض ہی نہیں بلکہ فن بھی ہونا چاہیئے!۔

نقاد کو یہ بات نہ بھولنی چاہیئے کہ سائنس غیر شخصی ہوتی ہے اور شعر و ادب قطعاً شخصی و انفرادی، چنانچہ شعری صداقت اور سائنسی صداقت میں جو فرق ہے اس کو نظرانداز کرنا مناسب نہیں، اسی کے ساتھ ساتھ حیوانی صداقت اور انسانی صداقت میں بھی فرق ہے۔ ہمارے جنسی میلانات ایک حیوانی صداقت ہے۔ شرافت، عفت وضعداری وغیرہ انسانی صداقتیں ہیں، فرائیڈ نے ایک حیوانی صداقت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بالکل بجا کیا ہے۔ یہ نظریہ ایک طرح کی طبی تشخیص ہے۔ اس نے ایک مرض کی طرف اشارہ کیا ہے "مبارک مرض" کہہ لیجئے۔ اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ اس مرض سے ہم تمام انسانی فضیلتوں کو داغدار کرتے رہیں، ہماری سوسائٹی میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو فرائڈ کے نظریہ کی بنا پر لذت اٹھانے میں تامل نہ کریں گے لیکن مارکس کے نظریہ کے احترام میں کسی طرح کی سختی جھیلنے پہ تیار نہ ہوں گے!

اکبر کے کلام میں انسانی صداقتوں کے ساتھ ساتھ جہاں تہاں حیوانی صداقتیں بھی نظر آئیں تو اس میں برا ماننے کی کونسی بات ہے۔ سرور صاحب اکبر کو مشاق غزلگو مانتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی مانتے ہوں گے کہ غزل ہماری شاعری کی معراج رہی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم دونوں میں کون روحانی معراج کا قائل ہے اور کون جسمانی کا! میں پیغمبری ہی میں نہیں شاعری میں بھی جسمانی معراج کا قائل ہوں!

اب آتا ہے مسئلہ اکبر کا جاگیرداری نظام کا زائیدہ و پروردہ ہونا۔ اس میں اکبر کا کیا قصور، اکبر کا ایک شعر ہے جس میں انھوں نے بوڑھوں کے فرائض میں مرجانا سب سے مبارک فریضہ بتایا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اس کا ماتم کیا ہے بوڑھے بھی مر نہ پائیں تو کیا کریں۔

تیس چالیس سال پہلے دنیا بھر کے شاعروں کا ایک عجیب خاصا یہ تھا کہ وہ جاگیرداری نظام میں پیدا ہونے سے باز نہیں آتے تھے اور کوئی نقاد ایسا نہ تھا جو ان شاعروں کو بتاتا کہ فلاں زمانہ میں زندگی کا یہ ڈھنگ ہوگا۔ فلاں صاحب یہ فرمائیں گے آپ بھی یہی "فرماؤ"!

ہندوستان کے علاوہ بھی ایسے ممالک ہیں جہاں جاگیرداری نظام نافذ رہا ہے۔ اس نظام کی مسلّمہ خرابیوں کے باوجود ایسی ہستیاں وجود میں آئیں جن پر ادب اور انسانیت دونوں کو فخر رہے گا اور اب بھی ہے۔ اس سے ہرگز یہ بات ثابت کرنی مقصود

نہیں ہے کہ جاگیرداری نظام مبارک و مسعود تھا یا اس نظام کو آج بھی برقرار رکھنا چاہئے۔ حالات بدلیں گے تو زندگی کے طور طریق بھی یقیناً بدلیں گے۔ کہنا صرف یہ ہے کہ بڑا شاعر کسی نظام کا زائیدہ اور پروردہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود ایک نئے نظام کا مبلغ اور مبشر ہوتا ہے۔ میں شاعری کو نیشنلائز کرنے اور اس طرح شاعر کو حکومت کا آلۂ کار بنانے کی موافقت نہ کروں گا۔

میں اس کا قائل ہوں کہ شاعر کی ڈفلی بھی اپنی ہو اور راگ بھی اپنا!۔

اچھا اور بڑا شاعر کسی مخصوص طبقہ یا مخصوص عہد کا شاعر نہیں ہوتا۔ وہ ہر طبقہ اور ہر عہد کا شاعر ہوتا ہے۔ اشتراکی نظام کا اچھا اور بڑا شاعر اتنا ہی قابل قدر اور قابل فخر ہوگا جتنا کسی اور نظام کا اچھا اور بڑا شاعر خواہ وہ نظام آج سے ہزار برس پہلے تھا یا ہزار برس بعد آئے۔ ایسے شاعر کے یہاں آن ابد ہے اور ابد آن۔ وہ ماورائے وقت ہوتا ہے۔ شبّیری ہی نہیں شاعری بھی حقیقت ابدی ہے۔ بدلتے رہتے ہیں انداز کوفی و شامی!

حکومت شاعر کا آلۂ کار ہوتی ہے۔ شاعر حکومت کا آلۂ کار نہیں ہوتا۔ غالب حکومتوں نے مغلوب حکومتوں سے اپنی شرائط منوائی ہیں لیکن کوئی حکومت شاعروں سے اپنی شرائط نہیں منوا پائی ہے۔ آج اگر اس کی کوشش کی جارہی ہے کہ اشتراکیت اپنی شرائط شاعر سے منوائے تو اسے شاعر جانیں، میں تو یہی کہتا رہوں گا کہ اس قسم کی تحریک شاعری اور ادب کے منصب کی منافی ہے!

میرے ذہن میں اکثر یہ وسوسے گذرے ہیں کہ اردو تنقید کے جتنے نظریے کتابوں میں اور نقاد بازاروں میں ہیں اردو میں اتنے شاعر اور لکھنے والے بھی ہیں یا نہیں یا آجکل جتنی دوائیں دریافت کی جاچکی ہیں۔ اتنے امراض بھی دریافت کئے جاسکیں گے یا نہیں۔ نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ شاعر اور ادیب نہیں ملتے تو یہ نقاد آپس ہی میں "مزاح المومنین"[1] شروع کردیتے ہیں۔

مصنّف آب حیات نے بھاشا کی شاعری پر گفتگو کرتے ہوئے بھاشا کے شاعر کی طرف سے کسی مرگھٹ کا نقشہ کھینچا ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

> "آدھی رات اِدھر آدھی رات اُدھر۔ جنگل سنسان اندھیر بیابان۔ مرگھٹ میں دور دُور تک راکھ کے ڈھیر۔ جلے ہوئے لکڑ پڑے۔ کہیں کہیں چتا میں آگ چمکتی ہے۔ بھوتوں پریتوں کی ڈراؤنی صورتیں اور بھیانک مورتیں ہیں۔ کوئی تاڑ سا قد۔ لال لال دیدے پھاڑے لمبے لمبے دانت نکالے۔ گلے میں کھوپڑیوں کی مالا ڈالے کھڑا ہنس رہا ہے۔ کوئی ایک ہاتھی کو بغل میں مارے بھاگا جاتا ہے، کوئی ایک کالا ناگ لکڑی کی طرح کھڑا اچھال رہا ہے۔ پیچھے غل ہوتا چلا آتا ہے کہ بچیو بچیو ماریو ماریو جانے نہ پائے۔ دم بھر میں یہ بھوت پریت غائب ہوتے ہیں۔ غل شور تھمتا ہے۔ پھر مرگھٹ کا میدان سنسان ہے۔ پتے ہوا سے کھڑکتے ہیں۔ ہوا کا سناٹا، پانی کا شور، اُلّو کی ہوک گیدڑوں کا بولنا اور کتوں کا رونا۔ یہ ایسی وحشت ہے کہ پہلے ڈر بھی بھول جاتے ہیں۔"

ہمارے تنقید نگاروں کا بھی نقشہ اس سے کچھ کم نہیں!

۱؎ مزاح المومنین کے سلسلہ میں اکثر یورپ کی حکومتوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے جن کا وطیرہ یہ رہا ہے کہ جب کمزور کو پایا اسے گھیر لیا اور لگے لاٹھیاں برسانے، کمزور گرتے گئے لاٹھیاں چلتی رہیں، نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب لاٹھیاں اپنوں ہی میں ایک دوسرے پر پڑنے لگیں تو کانفرنس کرنے "لگ گئے" اب گرے پڑوں کو اٹھاتے ہیں اور لاٹھیاں حوالہ کرتے ہیں کہ ہماری جان بچاؤ! اُدھر گرے پڑے اقبال کا مصرعہ (بادنیٰ تصرف) "کار جہاں خراب ہے ہم کو تو بس معاف کر!" گنگناتے ہیں اور جمائی لیتے ہیں!

بعض نقاد ایسے بھی دیکھے گئے ہیں جیسے گرہ باز کبوتر ہوتے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے یک بیک چھتری سے اڑے اور فضا میں ایک آدھ چکر کاٹے دو چار گرہیں لگائیں اور پھر چھتری پر لوٹ آئے اور یاد خدا میں مصروف ہو گئے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کو دیکھ کر ہندوستان کی افسانوی بازیگری یاد آجاتی ہے۔ یعنی رسّی فضا میں پھینکی وہ کھڑی ہو گئی اس پر چڑھ کر نظروں سے غائب تھوڑی دیر بعد پھر آموجود ہوئے! اردو شعراء نے محبوب کے دہن اور کمر یا ہجر و وصال کی اقسام یا ترکیب استعمال پر اتنی موشگافی نہ کی ہوگی جتنی تنقید پر تنقید نگاروں نے حاشیے لکھے یا چڑھائے ہیں۔ بیدلؔ اور مومنؔ کی خیال بندی ان تنقیدی خیال بندیوں کے سامنے ہیچ نظر آتی ہے۔

تنقید کی آجکل وہی گرم بازاری ہے جو آج سے تقریباً پچیس تیس سال پہلے ادب لطیف یا ٹیگوریت کی تھی۔ جسے دیکھئے جہاں دیکھئے معاشقہ کی "تعلیم بالغاں" میں مصروف! ایک جملہ لکھا۔ دس بارہ نقطے اس کے بعد ایک فقرہ پندرہ بیس نقطے پھر دو چار لفظ دو چار سکتے ایک آدھ جھٹکے بالآخر جان بحق تسلیم! جیسے کوئی عاشق کسی دوسرے کے معشوق کو سکرات میں اپنے وصیت نامے کا مسودہ سُنا رہا ہو!

ان تنقیدوں کو دیکھتے دیکھتے سنتے سنتے اور پڑھتے پڑھتے مجھ پر وہی حالت طاری ہوتی ہے (چگونہ بود داستان) کسی اسٹیشن پر گاڑی رُکی۔ ایک صاحب گارڈ سے گفتگو کرنے لگے۔ گارڈ کے ایک دوست دور سے یہ سین دیکھ رہے تھے۔ دوست کی متغیر حالت دیکھ کر قریب پہنچے گفتگو کرنے والے بزرگ جا چکے تھے۔ پوچھا خیریت تو ہے تم اس پاگل سے کیوں گفتگو کر رہے تھے۔ گارڈ اس طرح چونکا جیسے اس نے کوئی بڑی خوشی کی خبر سنی ہو لیکن یقین نہ آتا ہو۔ دوست نے بتایا کہ وہ شخص اس نواح کا معروف پاگل تھا اور معلوم نہیں کیوں اسٹیشن کی طرف آنکلا تھا۔ کئی بار پوچھنے اور تصدیق کرانے کے بعد کہ وہ شخص دراصل پاگل تھا، گارڈ نے بے اختیار ہو کر دوست کو گلے لگا لیا اور بولا دوست خدا تم کو جزائے خیر دے، میں تو بڑے شدید خلجان میں مبتلا ہو گیا تھا، میں سمجھتا تھا کہ میں پاگل ہوں!

اُن تنقیدی مضامین کو پڑھ کر جو ہر روز کسی نہ کسی رسالہ یا اخبار میں نظر سے گذرتے ہیں مجھے ہمیشہ دوسروں سے پوچھنا پڑتا ہے کہ میں پاگل تو نہیں ہوں! ایک دفعہ ایسا ہوا کہ میں نے اپنی یہ دقت ایک صاحب سے رجوع کی انھوں نے کچھ اس طرح باتیں کیں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو گئے دونوں پاگل ہو چکے تھے۔

اکبر کے نقادوں کی دو اقسام ہیں! ایک مولانا عبدالماجد دوسری آل احمد سرور یہ اتنے اشخاص نہیں جتنے اقسام ہیں۔ دونوں اپنے اپنے وجود کا جواز اکبر میں ڈھونڈھتے ہیں۔ ملتا ہے تو اور نہیں ملتا تو خفا مجھ پر ہوتے ہیں۔

غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا!

اس مصرعہ کے استعمال پر آپ مجھ پر لعنت بھیجیں ان لوگوں پر بھی جو اس طرح کی حرکت کرتے ہیں۔ متشابہ لگنے پر آدمی کیسی غیر شریفانہ (تحت شعوری!) حرکتیں کرنے لگتا ہے!۔

ان دونوں کے درمیان اکبر کا حال اُس سن رسیدہ شوہر کا ہے جس کی ایک بیوی بوڑھی ہے اور دوسری نوجوان۔ جب بوڑھی کی باری آتی تو شوہر کو سوتا پا کر اس کے سر کے کالے بال چپکے چپکے چن لیتی اور نوجوان کی باری آتی تو وہ سفید بالوں پر ہاتھ صاف کرتی۔ یہ تو سونے میں حال تھا بیداری کا قصہ یہ ہے کہ پہلی بیوی مکان کے نچلے حصّہ میں اور دوسری بالائی حصہ میں رہتی تھی، شوہر نیچے سے اوپر یا اوپر سے نیچے آتا ہوتا تو دونوں کو خبر ہو جاتی۔ ایک دونوں کان پکڑ کر اوپر کھینچتی اور دوسری دونوں ٹانگ پکڑ کر نیچے!

مولانا ماجد کا کہنا یہ ہے کہ اکبر کا کلام و پیام ان تمام فضائل کا ترجمان ہے جو مشرق اور مسلمان کا نمایاں امتیاز رہا ہے لیکن اب وہ فضائل رفتہ رفتہ مٹتے جا رہے ہیں۔ سرور کہتے ہیں اکبر مشاق غزل گو اور روایتی قسم کے صوفی تھے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے ہنساتے رُلاتے تھے، ظرافت سستی طنز و مزاح سطحی جاگیرداری نظام کے آوردہ و دلدادہ، مغربی خیالات اور طور طریقوں سے بدگمان سرسید کے مخالف، ترقی پسند رجحانات سے خائف اور عورتوں کی تعلیم و آزادی کے دشمن تھے بایں ہمہ "کچھ ٹھنڈا کچھ گرم!"[1]

اکبر کا میں قائل ہوں اس لئے نہیں کہ ماجد صاحب یا سرور صاحب اُن کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں بلکہ اکبر شاعر پہلے تھے کچھ اور بعد میں، اکبر نے اپنے عہد میں نہ مولویوں کو منہ لگایا نہ ترقی پسندوں سے مرعوب ہوئے۔ نہ انگریز حاکموں کی پروا کی نہ لیڈروں کو خاطر میں لائے۔ اس عہد میں شاید کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے انگریزی حکومت کا ملازم رہ کر حکومت کی ایسی خبر لی ہو جیسی اکبر نے۔ یہ کام سرسید نے غدر کے بعد غدر کے الزام سے مسلمانوں کو بچانے میں کیا۔ سرسید کی جرأت اور فرزانگی میں کوئی شبہ نہیں لیکن انگریز اور انگریزی حکومت دونوں سے سرسید کی بدگمانی یا مخالفت جلد ہی دور ہو گئی، یہی نہیں بلکہ وہ جلد ہی مغربی خیالات اور مغربی طور طریقوں کے دلدادہ بھی ہو گئے۔ اس وقت کے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی حالت کو سدھارنے سنوارنے میں سرسید نے جو قیمتی خدمات انجام دیں وہ کبھی بھلائی نہ جا سکیں گی۔

سلطنت مغلیہ کے زوال پر مسلمانوں کو جس زبوں حالی سے دوچار ہونا پڑا اس کو دور کرنے اور مسلمانوں کو صلاح و فلاح کے راستہ پر لے چلنے کا مسئلہ اس عہد کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ اس عہد کی تمام ممتاز شخصیتیں اس سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش میں منہمک تھیں جن میں بعض یہ تھیں سرسید، سید امیر علی، اکبر، حالی، شبلی، نذیر احمد، شرر وغیرہ ان کے اپنے حربے یا طور طریقے یا نقطۂ نظر تھے، مذہبیات، عقلیات، سیاسیات، تاریخ، شاعری، ناول اور افسانہ وغیرہ سبھی سے کام لیا جا رہا تھا۔

یہاں یہ بات بھی بھلانے کی نہیں ہے کہ ہندوستان میں مغلوں کی سلطنت مغلوں یا مسلمانوں کے پاس تسلط مذہبی جنون یا معاشی رہزنی کی بنا پر نہ تھی بلکہ ان کے حسن سلوک میل و محبت اور علم و فضل کی قدردانی کی ترجمان تھی۔ مغلوں کی پوری تاریخ میں کوئی جلیانوالہ باغ نہیں ملتا۔ ان کے ہاں کوئی مانچسٹر نہ تھا جس کی خاطر وہ ڈھاکہ کی ململ بنانے والوں کے ہاتھ کاٹ ڈالتے۔ ان کے ہاں کعبہ تھا لیکن انھوں نے قشقہ لگانے میں تامل نہ کیا۔ جس وقت یہ شمع گل ہوئی ہے اس وقت اس محفل میں علم و فن اور فضائل کے جتنے نامور اور باکمال موجود تھے اتنے سلطنت کے انتہائی عروج و ترقی کے دور میں بھی نہ تھے۔

یہی بساط اور یہی روایات "دلّی مرحوم" سے علی گڑھ لائی گئیں اور نئے حالات اور نئے مقتضیات کے سانچوں میں ڈھل کر علی گڑھ تحریک کہلائیں۔ بساط کس طرح بچھائی گئی، روایات کس طرح کیسے سانچوں میں ڈھلیں یا ڈھالی گئیں ایسے مسائل ہیں جن کو سمجھے بغیر اکبر اور سرسید کے نقطہائے نظر کو سمجھنا آسان نہیں ہے۔

میں تفصیل نہ پیش کروں گا اس لئے کہ مجھے یقین ہے کہ ناظرین علی گڑھ تحریک کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تہذیب و تمدن کا مدار ذہن و زمانہ کی رفتار اور سمت پر قدرت رکھنے پر ہے۔ آج سے پہلے زمانے کی رفتار نرم اور سمت متعین تھی اس لئے

---

[1] ایک بزرگ کسی سفارت خانے میں مہمانوں کی پذیرائی پر مامور تھے، کوئی مہمان آتا تو ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اخلاص و اخلاق کے کلمات زبان پر ہوتے ہنستے جاتے بچھے جاتے گڑگڑاتے جاتے اور بیچ بیچ میں کہتے جاتے "کچھ ٹھنڈا کچھ گرم"۔ (یعنی شربت یا چائے، کیا حاضر کروں) "کچھ ٹھنڈا کچھ گرم" ان کا تکیہ کلام بن گیا تھا، ایک دن ایک صاحب کے ہاں تعزیت میں تشریف لے گئے، تسکین و تشفی کے کلمات کہتے کہتے فرمانے لگے۔ بڑا صدمہ ہوا صبر کیجئے اللہ مرحوم کو جوار رحمت میں جگہ دے۔ "کچھ ٹھنڈا کچھ گرم!"

تہذیب و تمدن میں ٹھہراؤ گہرائی اور بھاری بھرکم پن تھا۔ یہی بات اُن روایات میں تھی جو اس تہذیب و تمدن کی بانی ہوئیں اور یہی بات ان روایات میں ملتی ہے جو اس تہذیب و تمدن سے برآمد ہوئیں۔

سرسیّد کے زمانے سے زمانہ کی رفتار تیز اور سمت غیر متعین ہوئی۔ اور یہ دونوں آج جس بے پناہ رفتار و حجم سے بڑھ اور منقلب ہو رہی ہیں۔ اُن سے ہم واقف ہیں، روایات جو کبھی لنگر اور بادبان کا کام دیتی تھیں۔ رکاوٹیں سمجھی جانے لگیں اور روایات کے مؤید رجعت پسند۔ چنانچہ اب روایت، اتنا بڑا الزام ہے کہ آپ جس شخص کے سر اسے تھوپ دیں اسکی پگڑی پونجی غائب!

سرسیّد کی نظر مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور معاشی زبوں حالی پر تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ یہ دونوں درست ہوگئیں تو اور باتیں خود بخود درست ہو جائیں گی۔ شکستہ دل اور شکستہ پا قومیں تباہی سے امن و نجات کی طرف بڑھتی ہیں تو ہر رہنما کی پالیسی وہی ہوتی ہے جو سرسیّد کی تھی، آبادکاری کی پہلی منزل یہی ہے۔ اکبر بھی مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور معاشی زبوں حالی سے پورے ... طور پر آشنا تھے اور ان سے ہمدردی رکھتے تھے۔ لیکن ایک اعتبار سے وہ سرسیّد سے آگے دیکھتے تھے اور ان سے زیادہ دیکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ علی گڑھ کو مغرب کی پیروی آنکھ بند کرکے نہ کرنی چاہئے۔ اور مغرب کی برکات سے فائدہ اُٹھانے میں خود اپنی میراث کی طرف سے غفلت برتنا مناسب نہ تھا بذات خود میں یہ نہیں مانتا کہ اکبر علی گڑھ اور سرسیّد پر کسی تنگ نظری یا رجعت پسندی کی بنا پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ ان کی نظر قوم کی میراث پر بھی تھی اور قوم کی تقدیر پر بھی۔ قوم کی تقدیر قوم کی میراث سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔ حالی اور اقبال دونوں اسے مانتے تھے!

سرسید جس طرح یا جس حد تک مغربیت سے متاثر تھے اس سے نہ حالی کو اتفاق تھا نہ شبلی کو نہ نذیر احمد کو۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں مولوی تھے لیکن پچاس سال بعد معلوم یہی ہوا کہ جہاں تک مغربیت سے احتیاط برتنے کا سوال تھا سرسید اور سید امیر علی دونوں سے یہ طبقہ زیادہ صاحب نظر نکلا!

سرسید کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ وہ مغربی طور طریقوں کے حامی اور ترقی پسند تحریکات کے مؤید تھے۔ اکبر پر یہ الزام ہے کہ وہ مشرقیت کے دلدادہ تھے مذہب و اخلاق پر زیادہ زور دیتے تھے اور ترقی پسندی کے مخالف تھے۔ غالباً اس سے کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ مشرقیت کا پیوند مذہب و اخلاق سے ہے قطع نظر اس سے کہ وہ مذہب و اخلاق مسلمانوں کا ہو یا کسی اور کا اور مغربیت کا رشتہ سائنس اور مادی ترقی کے وسائل سے۔

جس زمانہ میں سرسیّد اور اکبر تھے یہ مانا جاسکتا ہے کہ اکبر کی مشرقیت گھاٹے میں رہی اور سرسیّد کی مغربیت نفع میں۔ لیکن شاعر کی ذہنی ساخت پرداخت عملی سیاست داں کی ذہنی ساخت پرداخت سے علیحدہ ہوتی ہے۔ دونوں کی سطح بھی جداگانہ ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ کسی وقت عملی سیاست ذہنی و اخلاقی مقتضیات کے مقابلہ میں زیادہ مناسب اور منفعت بخش ہو لیکن اسکو کیا کیا جائے کہ بڑا شاعر وقتی مقتضیات کو نہیں دیکھتا قوم کی تقدیر کو نظر میں رکھتا ہے۔

سرسید ہم کو ہر قیمت پر مغربی اقوام کے دوش بدوش لانا چاہتے تھے اکبر ہر قیمت پہ مغرب کا سودا نہیں کرنا چاہتے تھے مشرق اور مغرب کے کمزور پہلو بھی تھے۔ سرسیّد اور اکبر دونوں کی نظر مشرق اور مغرب کے کمزور ہی پہلوؤں پر پڑتی تھی۔ جھگڑا پڑتا بھی اسی وقت ہے جب فریقین کی نظر خامیوں پر پڑتی ہے خوبیوں پر نہیں، بایں ہمہ جیسا کہ میں پہلے کہہ آیا ہوں کہ اکبر سرسیّد سے زیادہ دیکھتے تھے اور سرسید سے زیادہ دور تک دیکھتے تھے۔

اکبر کا عقیدہ تھا کہ ہم کو اپنے کارناموں اپنی روایتوں اور اپنی قدروں پر بھروسہ کرنا چاہیئے اور اپنی نجات اپنے ہی ترکہ

میں تلاش کرنا چاہیئے۔ اکبر کا یہ نظریہ آگے چل کر صحیح ثابت ہوا۔ سرسید کا سالک "مقامات میں کھو گیا"۔ سرسید جس مغربیت کے حامی تھے اس نے بالآخر خود اپنے سے پناہ مانگنی شروع کر دی۔ زیادہ دور تک دیکھنے کا صحیح طریقہ یا مفہوم یہ ہے کہ جتنا آگے دیکھ سکتا ہو اتنا ہی پیچھے بھی دیکھ سکتا ہو اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ زیادہ بلند ہو کر اور زیادہ علیٰحدہ ہو کر دیکھے۔

اکبر جو بات ہر یجن الفاظ ہر یجن انداز اور ہر یجن ماحول میں آج سے پہلے کہہ گئے اقبال نے وہی باتیں حکیمانہ انداز شاعرانہ حسن اور شاہانہ جلال سے پچیس تیس سال بعد کہیں!۔

اکبر ہندوستانی مزاج ہندوستانی زبان اور ہندوستانی تہذیب کے بڑے تندرست بڑے دلیر اور بڑے دل آویز شاعر تھے۔ ان کے کلام میں شمالی ہند کے رہنے بسنے والوں کی تمام ذہنی و اخلاقی قدروں تہذیبی کارناموں سیاسی تحریکوں اور حکومتی کارروائیوں کے ہر طرح کے شواہد ملتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز (تقریباً پچاس سال تک) کی ہماری پوری داستان حوصلہ و ہوس کی، الفت و آویزش کی پیشقدمی و پسپائی کی، شور و سکوت کی سود و زیاں کی اکبر کی شاعری میں جلوہ گر ہے۔ کہیں خفی کہیں جلی، کہیں شگفتہ کہیں حزیں لیکن ہر جگہ دلنشیں، اس عہد کے شعار و شعور کو سمجھنے کے لئے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جا سکتی ہے۔ شاید اتنی قیمتی مدد کہیں اور سے حاصل بھی نہیں ہو سکتی!

شاعر کے کلام میں زمانہ اور زندگی کی جھلک ضرور ملتی ہے لیکن اکثر وہ نقوش اتنے واضح اور اتنے جیتے جاگتے نہیں ہوتے جتنے اکبر کے ہاں دوسروں کے ہاں اس طرح کے نقوش دریافت کرنے میں بڑی چھان بین بڑی الٹ پھیر اکثر خواہ مخواہ کی خوش عقیدگی یا سوءِ ظن کو دخل دینا پڑتا ہے۔ اکبر کے ہاں یہ بات نہیں۔ ہر بات پوری "ولدیت قومیت، سکونت پیشہ اور حلیہ" کے ساتھ، کہیں قلندرانہ آہنگ میں کہیں شاعرانہ رنگ میں، کہیں تراش و خراش کے ساتھ کہیں جوں کی توں کہیں روایتی، کہیں انقلابی! اکبر نے اردو شاعری کے ساتھ جتنی بے تکلفی برتی ہے۔ ان سے پہلے شاید ہی کسی نے برتی ہو، انھوں نے جو موضوع چاہا اختیار کر لیا جو زبان چاہی استعمال کر ڈالی جو لہجہ جی میں آیا اختیار کیا، انھوں نے ہر بات ہر طریقہ سے کہی ہے۔ ثقات کی زبان میں عوام کی زبان میں، مولویوں کی زبان میں، صوفیوں کی زبان میں۔ شاعر کی زبان میں اور سب سے بڑی بات یہ کہ شخص کی زبان میں۔ جہاں تک شخص کی زبان کا تعلق ہے۔ ہماری شاعری میں اس کے نمونے بہت ہی کم ملتے ہیں۔

اکبر کے کلام سے ہم اردو طنز و ظرافت کی پوری تاریخ مرتب کر سکتے ہیں۔ زبان، اسلوب اور موضوع ہر اعتبار سے! وہ ہر طرح کے جذبات و خیالات کے اظہار و ابلاغ پر قادر تھے۔ ان کی بات کی تہ تک پہنچنا ہر شخص کے لئے آسان تھا، اسلئے کہ وہ ہر بات نہ صرف یہ کہ فی الفور اور براہ راست کہہ دیتے تھے بلکہ کہنے کے بجائے اسے سامنے لا کھڑا کرتے تھے وہ جو کچھ کہتے تھے۔ بیشتر ابعادِ ثلاثہ میں کہتے تھے۔

اکبر کے ہاں ہر ذوق و ہر استعداد کی کھپت ہے، ان کی اشاریت یا رمزیت کسی فرہنگ کی محتاج نہیں اس لئے کہ ان کی شاعری کا سرچشمہ ہر طبقہ کی زندگی زبان اور اس کے پسینے پسینے سے پھوٹتا تھا۔ حسرت اور اکبر کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ غیر شاعرانہ الفاظ کو بھی اس خوبی اور بے ساختگی سے استعمال کرتے ہیں کہ وہی لفظ شعر کی جان بن جاتا ہے۔ اس بارہ میں حسرت کا پایہ اکبر سے بلند ہے اس لئے کہ غزل میں اس طرح کی بے تکلفی بڑے مشکل سے کھپتی ہے۔ متفرق اشعار یا ادھر ادھر کی نظموں میں کبھی کبھار اس کا نباہ دینا آسان ہے۔

اکبر اور اقبال کی شاعری میں ایک بات اور ملتی ہے جو کہیں اور نظر نہیں آتی ۔ دونوں نے اپنی اپنی شاعری میں جن خاص الفاظ کو جن معنوں میں استعمال کر دیا ہے کوئی دوسرا ان کو اس طرح استعمال نہیں کر سکا اور کوئی ایسا کرتا بھی ہے تو صاف ظاہر ہونے لگتا ہے کہ وہ محض نقال اور بے بضاعت ہے ۔ اس کا سبب یہ ہے کہ دونوں کی شاعری اور شخصیت کی جڑیں ان مصطلحات کی آب و گل میں پیوست ہیں ۔!

اکبر اور غالب کی ظرافت میں فرق ہے ۔ غالب کی ظرافت اور مزاح دونوں استہزائی ہے ۔ اکبر کی اصلاحی اور بنیادی غالب ۔ اعتقادات اخلاق اور اکثر مذہبی تصورات کا مضحکہ اڑاتے ہیں وہ بھی اس طرح جیسے ان کو اس سے کبھی دلچسپی نہیں ہو سکتی خواہ وہ کسی شکل میں آئیں ۔ اکبر کی ظرافت اور مزاح سوسائٹی اور حکومت کی جہالت اور ظلم کو ہدف بناتی ہے ۔ غالب نے انگریزوں اور والیان ریاست کی شان میں قصیدے کہے ۔ میرے نزدیک اس سے غالب کی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا ۔ حرف آتا ہے انگریزی حکومت اور والیان ریاست پر کہ غالب کو ان کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑا ، کیسی اور کتنی گھٹیا سوسائٹی تھی ، جہاں غالب ایسی ہستی کو پیٹ پالنے کے لئے گڑگڑانا پڑا ۔ اکبر نے اس طرح کے قصیدے نہیں کہے ۔ دِلّی دربار پر ان کی نظم دیکھئے ۔ یہ لارڈ کرزن کے جلال و جبروت کے علی الرغم کہی گئی اور یہ وہ زمانہ تھا جب انگریزی اقتدار کا آفتاب ہماری سرزمین پر نصف النہار پر تھا اور اکبر انگریزی حکومت کے معمولی ملازم ! معلوم نہیں اکبر کے نقاد اسے تسلیم کریں گے یا نہیں کہ انگریز اور انگریزیت کے طلسم پر پہلی ضرب اکبر نے لگائی اور اس زمانے میں لگائی جب انگریزوں کی سطوت و جبروت کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان کا کیا ذکر ساری دنیا میں ان سے آنکھ ملانے کی کسی کو جرأت نہ ہوتی تھی اور اس طرح لگائی کہ پھر اسے پنپنا نصیب نہ ہوا ۔

" سیاست درباں " سے اکبر ڈرتے بھی جلتے تھے ، جیسا کہ ان کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ جب اپنی شاعری کا مشن اکبر کے سامنے آجاتا تھا تو پھر وہ " کہے بغیر " نہیں رہتے تھے ۔ اس " بے باک بیانی " میں اکبر کے ساتھی نواب سید محمد آزاد تھے ۔ جن کی تحریریں عام لوگوں کی نظروں کے سامنے نہیں آئی ہیں ، جو کام اکبر نظم سے لے رہے تھے ۔ نواب سید محمد اپنی نثر سے لے رہے تھے ۔ اردو نثر میں تین بڑے جید آزاد گزرے ہیں محمد حسین آزاد ، نواب سید محمد آزاد ، ابوالکلام آزاد ، تینوں اپنے اپنے اسلوب کے امام ہیں ۔ لیکن ۔

" ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز " ہونے کے اعتبار سے میں نواب سید محمد آزاد کا بڑا احترام کرتا ہوں !

بات میں بات نکل آئی میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ اکبر کی ظرافت اور مزاح غالب کی ظرافت اور مزاح سے زیادہ تخلیقی و اصلاحی ہے ۔ غالب کی طنز و ظرافت فن و فکر کے اعتبار سے اکبر کی طنز و ظرافت سے علیحدہ بھی ہے اور فن و موضوع کے اعتبار سے بلند بھی ۔ اوپر کے بیان کی روشنی میں یہ علیحدگی اور بلندی سمجھ میں بھی آتی ہے ۔ لیکن یہ بات نظر انداز نہ کرنی چاہئے کہ غالب اور اقبال دونوں مشیت کی اصلاح کے درپے تھے یا اس سے بغاوت کرتے تھے ۔ اکبر ہماری آپ کی اصلاح کے درپے تھے اور سوسائٹی سے برسر پیکار تھے ۔ غالب کی طنز و ظرافت ایسی تھی جس سے انھوں نے یا خود طنز و ظرافت نے جتنا فائدہ اٹھایا اتنا ہم نے آپ نے نہیں اٹھایا ۔ اکبر نے خود نہیں فائدہ اٹھایا ، لیکن پوری قوم اور وطن کو فائدہ پہنچا گئے !

اکبر کی طنز و ظرافت کا میدان بڑا وسیع اور متنوع ہے ۔ نہ ان سے پہلے نہ ان کے بعد کسی نے اتنے موضوعات پر اتنے اسالیب سے اظہار خیال نہیں کیا ۔ اودھ پنچ کے تعلق سے ان کو نقصان بھی پہنچا اور فائدہ بھی ۔ فائدہ بہت زیادہ نقصان بہت کم فائدہ یوں کہ ان کی طنز و ظرافت براہ راست ذاتی رنجش و کدورت سے پاک ، ہمہ جہت اور مقبول عام ہو گئی ۔ نقصان یوں کہ اس میں

ادبی وزن و وقار نہ آ پایا۔ اکبر کسی قیمت پر عوام سے علیٰحدہ نہیں ہونا چاہتے تھے!

طنز و ظرافت بڑی نازک اور بڑی خطرناک چیز ہے۔ جیسے بجلی کا کھیل۔ خبردار رہے تو خود فنکار چوکے اور چوٹ! ظرافت کو گنوارپن اور طنز کو کمینہ پن میں بدلتے ذرا دیر نہیں لگتی۔ اچھے اچھوں کو اس وادی میں ٹھوکریں کھاتے دیکھا ہے۔ طنز میں تو بگڑنے میں تھوڑی سی دیر بھی لگتی ہے۔ اس لئے کہ ہم ایک ایسے شخص کو اکثر معاف بھی کر دیا کرتے ہیں جس پر غم و غصہ یا بیزاری طاری ہو۔ تعزیراتِ ہند تک میں اس کی رعایت رکھی گئی ہے لیکن ظرافت میں چوک کبھی معاف نہیں کی جاتی۔ اسلئے کہ "ظرافت فرمانے" کی کسی پر کوئی مجبوری نہیں!

شاعر نہ بچہ ہوتا ہے نہ غلام کہ اس کی قدم قدم پر رہبری کی جائے یا اس پر مسلسل حکم چلایا جائے! اشخاص کی مانند شاعر بھی معقول یا نامعقول ہوتے ہیں اور شاعر کے معقول یا نامعقول ہونے کا معیار یہ نہیں ہے کہ وہ مقطع میں اپنے بارے میں کیا کہتا ہے بلکہ مقطع خود اس کے بارہ میں کیا کہتا ہے!

جس طرح ہم اچھے شخص کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں قطع نظر اس سے کہ وہ کس ملک مذہب حلیہ اور وضع قطع کا ہے۔ اسی طرح ہم اچھے شاعر کو عزیز رکھتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں خواہ وہ روایتی ہو یا رومانی یا انقلابی۔

اکبر روایتی ہوتے ہوئے بھی باغی ہیں اور باغی ہوتے ہوئے بھی اصلاحی! ان کے پاؤں بڑی مضبوطی اور اعتماد سے ایسی زمین میں جمے ہوئے تھے جو مضبوط بھی تھی اور زرخیز بھی۔ ان کی نظر تقدیر پر تھی تحریک پر نہیں۔ وہ شاعر تھے۔ شور نہیں چلاتے تھے۔ افکار و اشراف دونوں ان کو اپنا شاعر سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعری دونوں کے ذوق کو سیراب کرتی ہے۔ اکبر کو اپنے فن اور عقیدہ دونوں پر اتنا اعتماد تھا کہ بازار ہو یا بارگاہ وہ بے تکلف ہر مقام سے گذر جاتے تھے اور ہر جگہ ان کی پذیرائی اس طور پر کیجاتی تھی جیسے وہ اسی حلقہ کے لاڈلے تھے! شاعری بالخصوص طنز و ظرافت میں "جام و سنداں باختن" کسی ہوسناک کا بوتا نہیں!

ہندوستان کی ساری زبانوں کے ذخیرۂ شعر و ادب سے میں واقف نہیں ہوں، ضرورت پڑتی ہے تو ان میں سے اکثر کے بارے میں یا تو کسی جان کار سے پوچھ لیتا ہوں یا انگریزی کتابوں سے مدد لیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہندوستان میں طنز و ظرافت کو کبھی فروغ نہ ہوا اور اس کا سبب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ آج سے پہلے ہندوستان اصلی معنوں میں کبھی آزاد نہیں رہا۔ زمانۂ قدیم میں بھی جب یہیں کے حاکم اور یہیں کی حکومت تھی۔ ہندوستان پر مذہبی عقائد اور شخصی جبروت کا تسلط کافی رہا اور طنز و ظرافت کا حال یہ ہے کہ یہ صرف آزادی کی فضا میں پھلتی پھولتی ہے۔ ملّا یا مہاراجہ کی حکومت میں اس کا گذر نہیں!

چنانچہ اکبر اور ان کی شاعری کا اس اعتبار سے میں نہایت پُر تپاک خیر مقدم کرتا ہوں کہ یہ صنفِ ادب ہندوستان کو اکبر نے دیا۔ بڑی دلیری سے بڑے واضح طور پر بڑے منظم طریقے سے بڑے وسیع پیمانے پر اور تمامی خوبیوں کے ساتھ!

اکبر پر یہ مضمون طویل ہو گیا ہے۔ بہت سی غیر متعلق بحثیں آگئیں، کیا کیا جائے۔ آخر یہ غریب غیر متعلق بحثیں کہاں جائیں ان کا بھی تو کوئی ٹھکانا ہونا چاہئے۔ میرے ہی ہاں کیوں نہیں! ایک دن ایک دوست سے بڑے مزے کی ضرب المثل سُنی "ہو کوا اور نہیں تو کوٹھو نہیں!" مجھ پر اور غیر متعلق باتوں پر یہ کس خوبی سے چسپاں ہوتی ہے۔

میں نے اس مضمون میں کوئی شعر نہیں لکھا۔ سب سے بڑا سبب تو یہ تھا کہ مجھے شعر یاد نہیں رہتے، دوسرے یہ اس نمبر میں لکھنے والوں نے بے تحاشا اکبر کے شعر لکھے ہوں گے۔ جن اصحاب کو شعر کا شوق ہو ان میں سے اپنے یا میرے گوں کے اشعار منتخب فرمالیں، اکبر اشعار خود کہتے تھے ہجے دوسرے سے کراتے تھے۔ یہاں ہجے میں نے کر دئے ہیں اشعار ناظرین انتخاب کریں۔

علی گڑھ والوں کو مسعود ناظمی مرحوم کا لطیفہ یاد ہوگا کہ لکھنؤ کے مشہور مولوی نظام الدین حسن صاحب مغفور بھوپال میں جج تھے، ناظمی مرحوم نے ملازمت کی ایک درخواست دی۔ طلبی ہوئی۔ برہم ہو کر فرمایا یہ کیسی بے تکی عرضی لکھ لائے ہو، دیکھو اتنے الفاظ کے شوشے غائب ہیں، اتنے حروف پر نقطے نہیں، فلاں فلاں دائرے نامکمل ہیں۔ لے جاؤ اور ٹھیک کرکے پیش کرو۔

ناظمی مرحوم عرضی لے کر چلے آئے۔ دوسری عرضی پیش کی۔ پھر طلبی ہوئی اب کے اور زیادہ برہم تھے پوچھا کیوں جی یہ عرضی کے چاروں طرف تم نے کیا کیڑے مکوڑے بنا رکھے ہیں۔ عرض کیا حضور کوشش تو کی ہے کہ نقطے، شوشے دائرے سب اپنی اپنی جگہ پر موجود ہوں، پھر بھی احتیاطاً کچھ اور رکھ دیئے ہیں، جہاں کہیں ضرورت ہو ان میں سے لے لئے جائیں!

اکبر الہ آبادی کی ظرافت

(جعفر علی خاں اثر)

سر عبدالقادر مرحوم نے رسالہ مخزن میں کبھی لکھا تھا کہ :۔

"اکبر روشن خیالی کے ساتھ مشرق کی سچی محبت کا واعظ ہے ۔ اس کے نزدیک ہر مشرق نژاد کا فرض ہے کہ اپنے وطن سے محبت رکھے ۔ اپنے مذہب کی حفاظت کرے ۔ اپنے بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھے اور اپنے ہر رسم و رواج کو صرف اس لئے مذموم نہ سمجھے کہ وہ کسی مغربی رسم و رواج کے خلاف ہے بلکہ جائز حد تک اپنی چیزوں پر نازاں ہو اپنے ماضی سے واقف ہو ، اپنے حال کی تنقید کر سکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے ۔ یہ خیالات اس زور اور خوبی کے ساتھ معاصرین میں سے کسی کے ہاں نہیں ملتے .... اکبر لسان العصر ہے ۔"

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے انھیں امور کا خلاصہ ایک جملہ میں بیان کر دیا ہے "اکبر حال کا شاعر ہے" اس میں کوئی شک نہیں کہ اکبر نے اپنے عہد کے ہندوستان کی مکمل ترجمانی کی ۔ تمدن ۔ سیاست اور معاشرت کا ایسا کوئی پہلو نہیں جس پر روشنی نہ ڈالی ہو ۔ اپنے ہموطنوں کی آگاہی ، اصلاح اور بیداری کے لئے شاعری کو آلۂ کار بنایا ، نصیحت کا سیٹھا پھیکا پن دور کرنے کو ظرافت کا آب ونمک ملایا ، یہی نہیں بلکہ ظرافت کے جتنے اسالیب ہو سکتے ہیں اور جن سے اردو جب تک نابلد تھی لیکن مغربی لٹریچر میں عام تھے استعمال کئے ۔ یہیں ایک غلط فہمی کا ازالہ کرنا چاہیئے ۔

اکبر کا پورا کلام (ما سوائے غزل جو اس زمانے کے مروجہ رنگ سے چنداں علیحدہ نہیں ہے) طنزیہ یا مزاحیہ نہیں ہے ۔ ایک معقول حصہ پند و موعظت پر مشتمل ہے یا مسلمان کی پستی اور مذہب سے بیگانگی کا نوحہ یا اندھا دھند تقلید یورپ کے خلاف صدائے احتجاج ہے اس کو ظرافت قرار دے کر نکتہ چینی کرنا درست نہ ہوگا ۔

ظرافت کے چند اقسام کا بیان کلام اکبر سمجھنے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے ۔

اوّل (HUMOUR) زندہ دلی یا بذلہ سنجی ۔ کسی بات کے مضحک اور دلچسپ پہلو کا احساس اور اس انداز سے بیان کر دینا کہ سننے والے کو بے اختیار ہنسی نہ آجائے تو ہونٹوں پر تبسم کی ایک لہر ضرور دوڑ جائے ۔ یہ صفت کسی کسی آدمی میں ودیعت ہوتی ہے ایک نوع کی افتاد طبیعت ہے ۔ مکسوبہ چیز نہیں بن سکتی ۔

(۲) (WIT) نکتہ سنجی یا نغز گوئی ۔ اس میں (HUMOUR) سے زیادہ گہرائی ہوتی ہے اور فکریت کا عنصر شامل ہوتا ہے ۔ یہ ذکاوت اور آرٹ (ادب) کی پیداوار ہوتی ہے ۔ کوئی انوکھی بات اس اسلوب سے کہی جاتی ہے کہ سننے والا پہلے متحیر اور پھر محظوظ ہوتا ہے ۔ اس میں (HUMOUR) کے خلاف سنجیدگی ہوتی ہے ۔

(۳) (SATIRE) اس انگریزی لفظ کا اردو مرادف بہت غور کرنے کے بعد بھی نہیں ملا۔ ہجو ملیح یا طنز نگاری کہہ سکتے ہیں۔ لیکن Satire کی اصلی جولاں گاہ سماج یا سوسائٹی کی متداول برائیوں کمزوریوں اور حماقتوں کو مضحکہ خیز بنا کر پیش کرنا ہے، تاہم تہذیب اور ادبیت کی حدود میں رہ کر، ورنہ طنز نگاری، پھکڑ یا بھانڈوں کا "عجب تماش کا گھوڑا" بن کر رہ جائے گی۔ انگریزی کا فقرہ (HORSE PLAY) بھانڈوں کے عجیب تماش کے گھوڑے سے کس قدر مشابہ اور متحد المعنی ہے۔

انگریزی میں ظرافت کی تو نہیں تمسخر کی اور بھی قسمیں ہیں۔ جن میں سے (BUSLISQUE) کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ اس میں تین چیزوں کو مضحک یا مضحک چیزوں کو مصنوعی طور پر متین بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

ان اصطلاحات کا واضح مفہوم نظر انداز کرنے سے ہمارے بعض ناقدین کرام نے خوب خوب دھوکے کھائے ہیں۔ غالب کو اعلیٰ درجہ کا (HUMOURIST) فرض کرکے خلعت دوام بخشا ہے اور اکبر کو (WIT) سے متصف کرکے "شہرت مستعجل" سے زیادہ کا سزاوار نہیں ٹھہرایا ہے۔ غالب کو شاعر کی حیثیت سے (HUMOURIST) کہنا ستم ظریفی کے سوا کچھ نہیں جبکہ اس کا اعتراف ہے کہ غالب شیکسپیر کے اس قول کے مصداق ہیں: "And he for sorrow song"

فاضل ناقد کے الفاظ یہ ہیں:

یہ ظرافت (یعنی اکبر کی ظرافت) غالب کی طرح رنج و راحت اور سختی اور سستی کو ہموار کرنے کے لئے نہیں ہے۔

واہ ری اشکوں میں بھیگی ظرافت یا کھسیانی ہنسی! غالب کے بعض قطعات کو مثلاً وہ "جو چکنی ڈلی" "پر ہے یا آموں پر ہے" آپ کھینچ تان کر WIT کی تعریف میں لا سکتے ہیں (HUMOUR) "مسجد اور راگ سے پرے" ہی رہے گی۔ اگر ان لطائف کو جو غالب سے منسوب ہیں یا ان کی نثر میں جابجا بکھرے ہوئے ہیں، اکبر کے منظومات کے مقابلہ میں پیش کیا جاتا ہے تو کم سے کم میں اس خوش مذاقی کی داد نہیں دے سکتا۔ اکبر کے ایسے چٹکلے مختلف کتابوں اور ان کے مکاتیب سے جمع کئے جائیں تو شاید ایک رسالہ مرتب ہو جائے۔

دوسرا اعتراض جس کو جانچنے کی ضرورت ہے یہ ہے۔

اکبر نے جن چیزوں کا مذاق اڑایا ہے وہ تاریخی حقائق ہیں۔ فطری طاقتیں ہیں۔ ایسی قوتوں کے خلاف نبرد آزما ہو کر وہ اپنی جرأت کا ثبوت دیتے ہیں، مگر کچھ ۱۹۲۰ء کے بعد ان کی یہ جرأت ڈان کوئکزوٹ کا پنچکی پر تلوار چلانا معلوم ہوتی ہے وہ جن کمزوریوں پر ہنستے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ زبردست طاقتیں بن کر ان کے سامنے آتی ہیں۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ انھیں بھی اس زبردست طاقت کا احساس ہوتا ہے۔

گویا اکبر اچھے شاعر بن جاتے اگر ان زبردست طاقتوں کا احساس نہ ہوتا یا احساس ہونے پر ان کا مقابلہ نہ کرتے بلکہ بربنائے مصلحت وقت و اندیشہ پاداش فاتح طاقتوں کی قصیدہ خوانی و مدحت سرائی شروع کر دیتے گویا ایک طنز نگار شاعر کو تاریخی حقائق اور فطری طاقتوں کا مذاق نہ اڑانا چاہئے بلکہ ان کے سامنے بظاہر سر تسلیم خم کرکے در پردہ سازش اور جنگی پر آمادہ ہو جانا چاہئے۔ فاضل ناقد کو میرے نزدیک خود احساس نہیں کہ وہ تاریخی حقائق اور فطری طاقتوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور ملاحظہ فرمائیے!۔

۔۔اس بناء پر کہ اکبر کے یہاں ہندوستان کی محبت ہے۔ مشرق کی محبت ہے، اپنی چیزوں کی محبت ہے مگر ہندوستانی

مشرق اور اپنی چیز تینوں کا تصور محدود ہے۔ اکبر کی شاعری کی عظمت اور اس کی ابدیت کم ہو جاتی ہے مگر تاریخی
اہمیت بڑھ جاتی ہے اور ان کے طنز و ظرافت کی وجہ سے ایک قدر و قیمت اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ؟"

"دیو ماضی" کے شانے پر بیٹھے ہوئے جو چاہئے کہئے، ورنہ سر سید کا تصور بھی آفاقی و ہمہ گیر نہ تھا۔ ان کے مساعی بھی مسلمانوں کی فلاح و بہبود و مصلحت اندیشی تک محدود تھے، انھوں نے بھی برطانیہ کی غلامی سے آزادی کا کبھی پرچار نہ کیا۔ اس آزادی، اس سُرخ سویرے، کا ذکر ہی فضول ہے جس کا خواب آجکل دیکھا جا رہا ہے۔ علاوہ بریں اگر ادبی جواہر پاروں کی قدر و قیمت کا تعین ان کی افادیت کی بناء پر ہوا کرے تو دنیا کا بہترین لٹریچر دفتر بے معنی قرار پائے۔ کیا قرون وسطیٰ کی Chivalry تاریخی حقیقت نہ تھی اگر تھی اور سروانٹیز (Cervantes) نے اپنے ناول DON QUIXOTE میں اس کا مضحکہ اڑایا۔ تو فعل عبث کا مرتکب ہوا یا ایسا شاہکار چھوڑ گیا جو روتے ہوؤں کو ہنسا دے اور غم غلط کر دے، کیا مذہب اور دوسرے انسانی رجحانات و معتقدات فطری طاقتیں نہیں ہیں۔ کیا ان طاقتوں میں کبھی انحطاط یا کمزوریاں پیدا نہیں ہو جاتیں۔ کیا ان کی طرف ظریفانہ انداز میں توجہ دلانا یا ان کی مخالف طاقتوں پر اسی انداز سے حملہ کرنا اور ان چیزوں کو منتخب کر لینا بجائے اس کے کہ مبہم و غیر متعین چھوڑ دیا جائے آرٹ کا نقطۂ عروج ہے۔ ابدیت کا ضامن ہے یا فنائیت کا (بہ حیثیت شاعر) مدح خواں؛ کیا تماشا ہے کہ اکبر کی شاعری کی عظمت گھٹا کر اس کی تاریخی اہمیت بڑھائی جاتی ہے۔ گویا شاعر کی تاریخی اہمیت اس کی شاعرانہ عظمت سے وابستہ نہیں ہوتی، اکبر کی محبت کا دائرہ تو کافی وسیع تھا۔ اسکاٹ (سر والٹر) کو محض اسکاٹ لینڈ کی زندگی کی مصوری نے لافانی بنا دیا۔ اسی طرح ڈکنس نے انگلستان کے قوانین کی سختی اور ناانصافی کو افسانوی صورت میں آئینہ کر کے حکومت کو ان کی اصلاح پر آمادہ کیا۔ اکبر وہی کام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کرتا ہے تو "گھر کی مرغی" ثابت ہوتا ہے:

خیر یہ قصہ تو چھوڑیئے اور جارج میریڈتھ GEORGE MEREDETH کے الفاظ میں HUN OUT کا مدعا سنئے؛

"IT IS THE SYMPATHY, THE APPREGIATION THE LOVE WHICH INCLUDE THE FOLLIES OF DON QUIXOT, THE PEOSAIC ABSURDITIES OF SANCHO PANZA, THE ODDITIES OF BRADWAR DINE. OR PKIMROSE. OR MONK BARNS AND THE JOVIAL ANIMALISM OF FALSTAFF IN AN EMBRACE OF CONTRAST BEYOND THE SCOPE OF A COMIC POET"

ہمدردی پسندیدگی اور محبت ہی تو ہیں جن میں ڈان کوئگزوٹ کی حماقتیں سینکو پنزا کی غیر شاعرانہ بیہودگیاں، بریڈ وارڈائن، ڈاکٹر پیمروز یا منکبارنس کی بوالعجبیاں اور فالسٹاف کی حیوانی سطح پر خوش فعلیاں شامل ہیں جو متضاد اشیاء کو ہم بغل (متحد) کر دیتی ہیں اور جو ہنسوڑ (تمسخر پسند) شاعر کے حدود تخیل سے باہر ہیں۔

ذیل کے قطعہ میں نہ صرف اکبر کا نقطۂ خیال مرکوز ہے اور ماضی پرستی کے اتہام کا مسکت جواب ہے بلکہ SATIRE کی بھی عمدہ مثال ہے۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر ۔۔۔ تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا

جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں　　خود اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہئے تو وہ اِدھر نہ اُدھر　　زیادہ حد سے دئے پاؤں سب ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ لمنڈ بھی چھو نہیں سکتے　　اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
اِدھر ہے دفترِ تدبیر و مصلحت ناپاک　　اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا

غرض دوگونہ عذابست جان مجنوں را
بلائے صحبت لیلےٰ و فرقت لیلےٰ

انگریزوں کا تسلط ہونے کے بعد مسلمانوں میں دو جماعتیں پیدا ہو گئی تھیں اور دونوں جادۂ اعتدال سے ہٹی ہوئی تھیں، مولوی کٹر تھے اور نیچرے مطلق العنان ایک پورب جاتا ہے تو ایک پچھم۔ کیا اس قطعہ سے بہتر اس کی مصوری ممکن ہے؟ کیا اس کے ہر مصرعہ سے یہ مفہوم پیدا نہیں ہوتا کہ ہر جدید شے پر بغیر سوچے سمجھے نہ تو ایمان لاؤ نہ مردود ٹھہراؤ۔ ترک ہو یا اختیار دونوں میں اعتدال برتو۔ شراب حرام ہے تو اس کی دشمنی میں بے ضرر لمنڈ کو ام الخبائث کے قبیلہ میں نہ شمار کرو۔ ہر تدبیر یا مصلحت کو بدلے ہوئے حالات میں ناپاک سمجھ کر ٹھکرا نہ دو، اسی طرح انگلستان سے آئے ہوئے ہر فعل و رسم و رواج کو وحی سمجھ کر اعتماد صدقنا نہ کہو۔

اب اسی (Satire) کی بدترین مثال لیجئے جس میں لفظی شعبدہ بازی کے سوا کچھ نہیں جس میں　HUMOOR
پست ہو Invective یا گالم گلوچ بن گئی ہے۔

یورپ کی لیڈیاں بھی تری حرم میں آئیں　　ملحوظ رکھے دنیا اس رشتۂ بہم کو
پھر کر کے اس پہ قبضہ کہدیں گے اہلِ یورپ　　"سالوں کا" ہے اب تو سالوں کا نو ہم کو

(اشعار منقول از مقالات ماجد)

خوش عقیدگی و ارادت مندی جو کچھ توجیہہ کرے، مذاق سلیم اس کو کبھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا Buslesque کی مثال میں یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے۔

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اکبر کا مندرجۂ ذیل شعر بے پردگی کی مذمت میں ہے مگر اس کو ظرافت سے کوئی واسطہ نہیں، مرقعِ عبرت کہہ لیجئے۔
اگرچہ خود انھوں نے عزیز لکھنوی مرحوم کو ایک خط میں تحت عنوان "ظرافت" تحریر کیا ہے ۔

حسرت بہت ترقی دختر کی تھی انھیں
پردہ جو اُٹھ گیا تو وہ آخر نکل گئی

قریب قریب یہی مفہوم اس قطعہ کا ہے:۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں　　اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

آخری مصرعہ اس قدر برجستہ اور صناعانہ ہے کہ عبرت و عبرت کے علاوہ بیمصرف پردے کا یہ مصرف کہ مردوں کی عقل پر

پڑ گیا ایک تبسم اور قہقہے کا تقاضہ کرتا ہے۔ مضمون یہی ہے مگر اس شعر میں (HUMOUR) کی جگہ WIT نے لے لی ہے۔

مجلس نسواں میں دیکھو عزت تعلیم کو پردہ اٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

مندرجہ ذیل شعر خالص HUMOUR کا نمونہ ہے۔

دختر رز نے اٹھا رکھی ہے آفت سر پر
خیریت گذری کہ انگور کے بیٹا نہ ہوا

اس شعر کو SATIRE مشکل ہی سے کہا جاسکتا ہے۔

فکر ساری کی ہے نہ کنسگن کی اب تو دھن ہے انھیں فرنگن کی

مجھے تو اس میں اور رجان صاحب کے شعر میں چنداں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

نکاحی بیاہی کو چھوڑ بیٹھے متاعی رنڈی کو گھر میں ڈالا
بنایا صاحب امام باڑہ خدا کی مسجد کو تم نے ڈھا کر

طنز یا SATIRE کی بہترین مثال یہ شعر ہے:-

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

خالص مزاح کی ایک (دوسری) مثال ؎

اک غل مچا کہ اس کو بھی لیسنس ہے ضرور
منہ کھل چکا تھا ورنہ مرا آہ کے لئے

یہ شعر ظرافت کی تمام خوبیوں کا مجموعہ ہے ؎

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز
جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

شاید اتنی مثالیں کافی ہوں۔

اکبر کی دیکھا دیکھی دوسرے شاعروں نے بھی اس میدان میں جولانیٔ طبع دکھانا چاہی۔ لیکن میرا خیال ہے کہ اکبر اپنے طرز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ شجر ظرافت میں اور کونپلیں بھی پھوٹیں مگر ع

وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

ادبیات اردو میں ہجو اور ہزل کی کمی نہ تھی، مگر طنزیات و فکاہات کا فقدان تھا۔ اکبر نے یہ کمی پوری کردی۔ سر سید نے قوم پر تو اکبر نے زبان اردو پہ احسان کیا اور دونوں بلا خوف تردید کہہ سکتے ہیں ؎

ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

اکبر اور اُس کے نکتہ چیں

(ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی)

عرصہ ہوا اکبر الہ آبادی کے دو خطوط جو علامہ اقبال کے نام تھے، شائع ہوئے تو بعض حضرات نے ان سے عجیب نتائج اخذ کئے۔ ایک خط میں لسان العصر نے لکھا تھا۔ "آپ کی نظم میں نے پڑھی، ماشاء اللہ! چشم بد دور! بعض اور بزرگوار بھی تھے۔ سب نے نہایت تعریف کی۔ منشی صاحب نے تو نقل مانگی ہے۔ لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا۔ وہ اثر باعث سکون خاطر ہے۔ میں افسوس کرتا تھا، اور صرف ایک آپ کے ہونے سے وہ افسوس کم نہیں ہوا کہ قوم کیوں بے بصیرت ہو گئی ہے اگر جان کو قوت نہیں پہنچا سکتی تو تدبیر ہلاکت کی کیوں موید ہے .... اللہ تعالیٰ نے آپ کو چشم بصیرت عطا فرمائی ہے کہ اس عمر میں بلا تجربۂ دنیا آپ کے دل کی نظر کم سے کم اخلاقی حقائق کی طرف ہے ؎

کافروں کی مسلم آئینی کا نظارہ بھی کر

کس قدر بلیغ و صحیح و لبریز معنی ہے۔ اگرچہ یہ لطیف و خوبصورت و بلیغ ترکیب الفاظ آپ کی علمی قابلیت اور خاص شاعرانہ سلیقہ کا نتیجہ ہے، لیکن یہ خیال مرتب و باوقعت ہو کر کس کے دماغ کو نصیب ہوتا ہے۔ گرم گفتاری اور خودداری کے قوافی بھی حقائق کے مضامین سے مزین ہیں۔ شکست رشتۂ تسبیح اور پختہ زناری آپ کا حصہ ہے۔ الغرض جملہ اشعار لاجواب ہیں۔ میری مدح سے بجز اس کے کہ آپ خوش ہوں اور کچھ ہونا نہیں ہے۔ اگرچہ یہ بھی بہت ہے لیکن آپ سے کبھی ملاقات ہو اور زبانی گفتگو ان اشعار کے معانی پر ہو تو گوناگوں فوائد حاصل ہو سکتے ہیں جو آئندہ طریق عمل کے لئے کار آمد ہوں ...."

اس خط میں جس نظم کی تعریف کی گئی ہے وہ اقبال کی اور نظموں کے مانند قومی تاثرات میں ڈوبی ہوئی ہے اور "ہلالِ عید" کے عنوان سے بانگ درا میں شامل ہے۔ بعض اصحاب کو اکبر کے تعریفی الفاظ ناگوار گذرے اور انھوں نے واضح الفاظ میں اظہار کیا کہ اکبر اس نظم کی لفظی صنعت گری کی داد دے رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے بڑی غلط فہمی مشکل سے خیال میں آسکتی ہے۔ اس خط میں جہاں انتخاب الفاظ معنی خیز ترکیبوں اور حسین ترتیب کی داد دی گئی ہے، وہیں صافت لفظوں میں مضمون کی بلاغت، معنی کی لطافت اور اثر و تاثیر کو سراہا ہے۔ اس خط کے ان فقروں کو غور سے پڑھئے (۱) لیکن مجھ پر بہت اثر ہوا...... کیوں موید ہے۔ (۲) اللہ تعالیٰ نے آپ کو........ اخلاق حقائق کی طرف ہے (۳) آپ سے کبھی ملاقات ہو...... کار آمد ہوں۔

یہ بحث خود کافی حد تک اہم ہے کہ خیالات کی بلندی، مضامین کی گہرائی اور جذبات و تاثرات کی ترجمانی کے لئے لفظی صنعت گری کس حد تک ضروری ہے۔ لیکن جس طرح اثر اندازی کے لئے نظم کو نثر پر فوقیت ہے۔ اسی طرح بے شبہ اچھے شعر کو

بڑے اور معمولی شعر پر ترجیح حاصل ہے اور کسی دور رس اصلاحی نظم و شعر کے لئے یہ ضروری ہے کہ معنوی خوبیوں کے ساتھ صوری محاسن بھی آراستہ ہو۔ اقبال کی شاعری ان دونوں زیوروں سے بیک وقت مکمل طور پر آراستہ تھی اور یہی سبب ہے کہ اُسے آفاقیت ...... اور ابدیت حاصل ہو گئی ہے۔ پختہ کار اکبر کی دور بیں نظر نے نوجوان اقبال کی شاعری میں یہ سب پہلو دیکھ پائے تھے۔ اسی لئے وہ اقبال کے درد کا اعتراف کرتے ہیں، ان کی نظم کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور ان سے ملنے اور مل بیٹھ کر آئندہ کے لئے طریق عمل متعین کرنے کے خواہاں ہیں۔ دوسرے خط سے ان باتوں کی کافی وضاحت ہو جاتی ہے لسان العصر نے اقبال کو لکھا تھا۔

"میں نہ کمیٹی کا مشتاق ہوں نہ بڑے لوگوں کا .... ہاں آپ سے ملنے کا بہت آرزومند ہوں۔

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانیں ملے کس کو
نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ دردِ سر اپنا

کسی کا پرانا شعر ہے۔ دیکھا کہ وہ بار غم جو میرے دل پر مستولی تھا، آپ کے دل نے اٹھا لیا، وہی درد تھا وہی سمجھ اور بصیرت تھی، جس نے آپ کے قلم سے قوم فروشی کی طعن تر شوا دی ...... میرے اشارات بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ آپ کبھی ملیں تو مجھ کو یقیناً بڑی روحانی مسرت ہو گی۔ لیکن آپ کو بھی بہت سی باتوں پر توجہ ہو جائے گی ...."

لسان العصر پر نکتہ چینی کی ایک قسم تو یہ تھی کہ جس کی مثال اوپر آئی، دوسری بہت بڑی غلط فہمی ان کی طرف سے ان کے مزاحیہ اشعار کے باعث رہی ہے عموماً وہ کسی موقع پر حسب حال چند اشعار موزوں کر دیا کرتے تھے جن سے ہر ایک محظوظ ہو جاتا جو آناً فاناً تمام ملک میں مشہور ہو جاتے۔ عامۃ الناس کی نظر سطحی ہوتی ہے، وہ اکبر کے ان مزاحیہ اشعار کے ظاہر سے لطف اندوز ہوتے تھے۔ مگر سمجھنے والوں کی نظریں اس زہر سے بجھے ہوئے نشتر تک بھی پہنچی تھیں جو ان اشعار کی تہ میں چھپا ہوتا تھا۔ مزاح اور طنز اکثر پہلو دار ہوا کرتا ہے اور در اصل لطف بھی اسی میں ہے۔ اکبر کے اشعار اس لئے بھی بعض اصحاب کو کھٹکتے تھے۔ اور ایسی نکتہ چینیاں ان کے بعد نہیں، ان کے سامنے بھی ہوتی رہی ہیں۔

شمس العلما مولوی سید ممتاز علی صاحب مرحوم رسالہ تہذیب نسواں کے بانی اور تعلیم بنات کے سرگرم کارکن تھے۔ ایک بار ان کو بھی اکبر کے بعض اشعار سے اسی طرح کی غلط فہمی ہو گئی تھی، اکبر نے ان کے نام خط لکھ کر اپنا مسلک واضح کیا، اس خط کا مضمون دیکھئے۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ اکبر کی شاعری میں کون سی انقلابی اور اصلاحی رَو دوڑ رہی تھی۔ لکھتے ہیں :۔

"میں ترقی و تہذیب نسواں کا ہرگز مخالف نہیں ہوں، جن نظموں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ پرانی نظمیں ہیں جن میں پبلک کے خیالات موزوں کر دیئے گئے ہیں ... میں کیا اور یہ اشعار کیا، شعرا قافیہ پیمائی کیا ہی کرتے ہیں۔ دنیا کے قوانین شعر سے نہیں چلتے زمانے کا رنگ، زمانے کی ضرورتیں فیصلہ کرتی ہیں، اور اس وقت بھی کر رہی ہیں۔ آپ نے صرف چند اشعار کو لے لیا ہے۔ باقی اشعار ملاحظہ فرمائیے تو ان سب باتوں پر نظر کی گئی ہے .... میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ شعر انقلاب کو روکنے کے لئے نہیں ہیں بلکہ یادگار انقلاب ہیں۔"

سچ یہ ہے کہ جب تک اکبر کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ نہ کیا جائے ان کی شاعری کی بابت صحیح رائے قائم کرنی ممکن نہیں۔ لسان العصر بے شبہ اصلاحی شاعری کے ان اقانیم ثلثہ میں سے ہیں جن کے باقی دو رکن حالی اور اقبال ہیں۔ انھوں نے اپنی انقلابی شاعری کے لئے جو راہ اختیار کی تھی اس نے البتہ لوگوں کو غلط فہمیوں کا موقع دیا۔ مگر وہ مجبور تھے۔ مصلحت وقت اسی کی متقاضی تھی۔ وہ ایک سرکاری عہدہ دار تھے اور اس لئے ان کے واسطے ناممکن تھا کہ وہ کھل کر بات کہہ سکیں۔ اب دو ہی صورتیں تھیں، یا تو وہ استعارات

نہ کنایات میں ڈوب کر کہتے یا مزاح وطنز اختیار کرتے ۔ انھوں نے دوسرا راستہ پسند کیا اور جاننے والے جانتے ہیں کہ انسانی طبائع کے لئے مزاح کس قدر خوش آئند ہوتا ہے ۔ اُن کے طنزیہ نشتروں کی زہرناکی کو اُن کا مزاح مقبول عام وخاص بنلتا تھا اور اسی لئے ان کے انقلابی اور اصلاحی شعر یگانہ وبیگانہ ، دُور و نزدیک سب تک پہنچتے تھے اور اصلاح پذیر طبائع پر مطلوبہ اثر چھوڑ جاتے تھے ۔

اکبر کی سنجیدہ شاعری سے اور بھی کم اعتنا کیا گیا ہے ۔ اس سے بڑا اور کیا ظلم ہوگا کہ ان کی غزل کو عرصہ تک لوگوں نے زینتِ طاقِ نسیاں بنائے رکھا ۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ مصحفی لگو ہونے کے اعتبار سے ان کا نام شاد عظیم آبادی اور حسرت موہانی کے ساتھ سرفہرست نظر آتا ہے ۔ لکھنؤ کی آخری دور کی شاعری غزل کو جس اخلاقی پستی میں گرا دیا تھا ۔ اس سے نکالنے والوں میں اکبر امتیازی رتبہ رکھتے ہیں اور ان کی غزل میں وہ داخلیت اور وہ معنوی خوبیاں جمع ہیں جو دہلی اسکول کے لئے مایۂ ناز تھیں اور جن کو دوبارہ زندہ کرنے میں اکبر نے متاخرین پر بڑا احسان کیا ہے ۔ لیکن ان کی شاعری نے غزل میں انقلاب پیدا کرنے میں جو حصہ لیا ہے ، اس وقت میں اس سے بحث نہ کروں گا ، بلکہ میں کوشش کروں گا کہ مختصر طور پر ان کی شاعری کے وہ پہلو اجاگر کروں جنھوں نے اصلاح قومی اور انقلاب ملّی میں نمایاں حصّہ لیا ہے ۔

سرسیدؔ بالیقین نئی نسل کے باوا آدم تھے ، مگر انھوں نے جس طرح اصلاح قوم کا علم بلند کیا تھا ۔ اُس نے ان کے خلاف مخالفت کا طوفان برپا کر دیا تھا ۔ سرسید بجا طور پر چاہتے تھے کہ قوم میں سے احساسِ کمتری جاتا رہے اور علوم مغربی کا مطالعہ کر کے اقوام عالم کی صف میں اپنی جائز جگہ حاصل کرے اور یہ کہ مذہب و معاشرت میں جو برائیاں پھیلی ہوئی ہیں ان کی اصلاح اور تدارک ہو جائے ۔ سرسید نے کالج کھول کر اور تہذیب الاخلاق جاری کر کے عملی طور پر اس انقلاب و اصلاح کی بنیاد ڈالی اس میں شک نہیں کہ ان کی انقلابی تحریک ہی سبب بنی نئی نسل کی ترقی اور تعلیم کے رواج کا ۔ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کہ انھوں نے مذہب اور سائنس ۔ اور مذہب و مادیت میں جس طرح سمجھوتہ کرانا چاہا تھا اس نے خطرناک نتائج پیدا کئے ۔ سیدؔ کے حسن عمل سے انکار ظلم ہے ۔ لیکن اس سے بھی آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں کہ ان کی کارگذاریوں کے نتیجہ میں جو نسل سامنے آئی وہ مذہب سے قطعاً بے بہرہ ہوتی تھی ۔

شبلی کی طرح اکبر بھی سرسید کی پالیسی سے اسی لئے خفا تھے ، وہ نہ تعلیم کے مخالف تھے اور نہ نئی روشنی کے ، لیکن وہ سرسید کے طریق کار سے ناراض تھے اور انجام بد سے ڈرتے تھے ۔ اکبر نے اپنے لڑکے سید عشرت حسین کو اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا تھا ۔ اس لئے یہ بات بے شبہ ماننی پڑتی ہے کہ وہ اعلیٰ تعلیم اور مغربی تعلیم کے مخالف نہ تھے ۔ ہاں ! مذہب کے معاملے میں وہ کسی سمجھوتے کے لئے تیار نہ تھے ۔ اسی لئے انھوں نے عرصے تک سرسیدؔ کے خلاف مضامین اور نظمیں لکھیں اور کہا ۔

کیونکر کہوں طریقِ عمل ان کا نیک ہے ۔۔۔ جب عید میں بھلائے سویّوں کے کیک ہے

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے ۔۔۔ کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

نظراُن کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر ۔۔۔ گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے　　مگر یوں ہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ　　مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

اکبر کے طنزیہ اشعار کسی مسلسل قومی نظم اور مسدس حالی کے طور پر نہیں ہیں۔ مختلف اشعار، قطعات اور فردیات ہیں جن میں کبھی ایک جذبے کی ترجمانی کی گئی ہے اور کبھی دوسرے کی، اسی لئے اکبر کے تاثرات اور معتقدات کی بابت کافی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ اور آج بھی ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ ان کے کلام کو ان کے ماحول اور ان کے ذہنی پس منظر کو سامنے رکھ کر اور ان کے اشعار میں ربط و تسلسل پیدا کر کے مطالعہ کیا جائے۔ تب اکبر کی شاعری کا صحیح مرتبہ سامنے آسکتا ہے۔

اس زمانے کی تعلیم کیسے گریجویٹ پیدا کر رہی تھی، اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ ایک بار ایک مسلمان گریجویٹ اکبر سے ملنے آئے، ان کی ذہانت، لیاقت، تاریخی واقفیت اور آداب گفتگو سے اکبر بہت خوش ہوئے۔ اتنے میں مؤذن نے مغرب کی اذان دی۔ اذان سنتے ہی وہ صاحبزادے بولے "اب میں اجازت چاہتا ہوں" سب لوگ مصلے کی طرف بڑھے اور وہ صاحب دروازے کی طرف۔ اکبر نے فوراً کہا :-

دل میں خاک اُڑتی ہے خالی لہجہ و لب دیکھئے　　مذہب اب رخصت ہے بس تاریخ مذہب دیکھئے

اسی طرح کہتے ہیں ؎

شیطان نے ترکیبِ تنزل یہ نکالی　　اِن لوگوں کو تم شوق ترقی کا دلا دو

نہ نماز ہے نہ روزہ نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے　　تو خوشی پھر اس کی کیا ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

کالج سے جنھیں اُمیدیں ہیں مذہب کو بھلا کیا جانیں گے　　مغرب کو تو پہچانا ہی نہیں قبلے کو وہ کیا پہچانیں گے

راہِ مغرب میں یہ لڑکے لُٹ گئے　　واں نہ پہنچے اور ہم سے چھُٹ گئے

دوسروں کی طرح اکبر کو بھی سرسید کی بابت یہ گمان تھا کہ وہ انگریز سے متاثر ہیں، اسی لئے انھیں شکایت تھی ؎

اب قوم میں زندگی کے آثار نہیں　　جو اہلِ نظر ہیں اس سے شرمندہ ہیں
حکام کی ہے بہ صورت عیسیٰ نفسی　　اعضاء کالج کے کچھ اگر زندہ ہیں

علی گڑھ کو شرف بخشا ہے اقبالِ نصاریٰ نے　　کہ جو مسلم اٹھا شوقِ ترقی میں یہیں آیا

انھیں کے مطلب کی کہہ رہا ہوں زبان میری ہے بات اُن کی　　انھیں کی محفل سنوارتا ہوں۔ چراغ میرا ہے رات ان کی
فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے۔ انھیں کا مطلب نکل رہا ہے　　انھیں کا مضمون، انھیں کا کاغذ، قلم انھیں کا، دوات ان کی

اکبر جو کچھ چاہتے تھے، مقصد سرسید کا بھی وہی تھا، لیکن نتیجہ وہ نہ ہوا جس کے لئے انھوں نے اس قدر جدّ وجہد کی تھی وہ ترقی جو مذہب کو پسِ پشت ڈال دے اور وہ تہذیب جو اپنی روایات کو طاق نسیاں میں رکھنے کی تعلیم دے۔ اکبر کو کسی طرح پسند نہ تھی۔ وہ تو یہ چاہتے تھے ؎

تہذیب وہ ہے کہ رنگِ مذہب بھی ہو　　آزاد وہ ہے کہ جو مؤدّب بھی ہو
تزئین وہ ہے کہ خاکساری بھی ہو ساتھ　　اسپیچ وہ ہے کہ اُس میں یارب بھی ہو

قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر　　اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں　　کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

لیکن سرسید سے جزئی اختلافات کے بعد بھی اکبر ان کے مدّاح تھے۔ خصوصاً آخر میں تو وہ ان کے خلوص عمل اور جوش ملی کے بے حد معترف ہوگئے تھے۔

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور　　کہتا نہیں میں تم سے کہ ہو اُس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن　　اللہ کا نام لے کے اُٹھنا ہے ضرور

واہ رے سیّدِ پاکیزہ گہر کیا کہنا　　یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں پُرسوز جگر کیا کہنا　　ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سیّد کام کرتا تھا　　نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر　　خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہِ سیّد سے　　قفس میں ہیں تو اس اڈّے کو چھوڑ جائیں کہاں

اس سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ اکبر کو سیّد سے کد نہ تھی۔ انھوں نے جو کچھ سرسید کے خلاف کہا ہے، وہ دراصل سرسید کے طریق کار کے خلاف ہے۔ کالج میں جو نظام تعلیم رائج تھا جو آج تک بھی ہر جگہ موجود ہے۔ اس کے اکبر سخت مخالف تھے، وہاں سے نئی روشنی کے جو پروانے نکل رہے تھے ان کی بابت اکبر کے خطرات، تجربے نے بتایا کہ بالکل صحیح تھے۔ اکبر ایسے نتائج کے خلاف تھے جن کا خاکہ انھوں نے ان اشعار میں اڑایا ہے ؎

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو　　جائز ہے غباروں پہ اُڑو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد　　اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

مسجدیں سنسان ہیں اور کالجوں کی دھوم ہے　　مسئلہ قومی ترقی کا مجھے معلوم ہے

پری کی زلف میں الجھے نہ ریشِ واعظ میں
دلِ غریب ہو لقمہ امتحانوں کا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے
خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

اکبر نے زندگی کے کسی پہلو کو اپنی تنقید سے نہیں چھوڑا۔ مذہب، تعلیم، اخلاق، سیاست، سبھی پر انھوں نے گہری نظر ڈالی ہے اور تیز نشتر چبھوئے ہیں، لیکن معاشرت کی خرابیوں کا انھوں نے خاص طور پر خاکہ اڑایا ہے۔ وہ ایک طرف شیخ و واعظ پر طنز کرتے ہیں، تو دوسری جانب نئی نسل کی غلط روش پر چرکے لگاتے ہیں۔ تعلیم نے جن کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا ہے جو کلرکی اور شکم پری کو مقصدِ زندگی سمجھتے ہیں وہ ریاکار جو اہلِ مذہب کی آنکھوں میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں اور وہ لوگ جو "بڑا" ہو جانے کے بعد اپنے آپ کو مرفوع القلم سمجھنے لگتے ہیں، کسی کو انھوں نے اپنے طنز کے نشتر دل سے محروم نہیں رکھا۔

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا
شیخ و مسجد سے تعلق ترک کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ
کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر، خوشی سے پھول جا

کالج نے کیسے سانچے میں لڑکوں کی طبیعت ڈھالی ہے
حکام پہ بم کے گولے ہیں اور مولویوں پر گالی ہے

آدم چھٹے بہشت سے گیہوں کے واسطے
مسجد سے ہم نکل گئے بسکٹ کی چاٹ میں

سر میں سودا آخرت کا ہو یہی مقصود ہے
مغربی ٹوپی پہن یا مشرقی دستار باندھ

مسجد نے کہا میرا فسانہ بھی ہے اک چیز
کالج نے پکارا کہ زمانہ بھی ہے اک چیز

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے اسپتال جاکر

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی، اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

مے بھی ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہے شیطان بھی ناراض نہ ہو

پاکر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا
سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

نہیں کچھ اس کی پرسش الفتِ اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

اکبرؔ نے کہا کل یاروں سے اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں — یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

گذران کا ہو کیونکر حلقۂ اللہ اکبر میں — پلے صاحب کے بنگلے پر، امرے صاحب کے دفتر میں

معاشرت کی اصلاح کے سلسلے میں اکبرؔ نے عورت پر بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ عورت کو پردے میں رکھنا چاہتے ہیں، اسکی تعلیم کے مخالف نہیں، جیساکہ شروع میں گذر چکا۔ لیکن اعلیٰ مغربی تعلیم جس کے بعد وہ چراغ خانہ ہونے کے بجائے شمع انجمن بن جائے، اس کے لئے حرام جانتے ہیں۔ مشرقی اور مغربی عورت کا موازنہ ان کی نظر میں یہ ہے :۔

ہر چند کہ ہے میں کالونڈر بھی بہت خوب — بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے
سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن — اس شوخ کے گھنگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

ترقی و اصلاحِ نسواں کی بابت اِن کے خیالات کا اِن اشعار سے اندازہ کیجئے :۔

ترقی کی نئی ہیں ہم پر چڑھا کیں — گھٹا کی دولت اسپیچیں پڑھا کیں
رہیں ہر پھر کے آپا بی نصیبن — وہ گو اسکول میں برسوں پڑھا کیں

سایہ مدت ہوئی غبارہ بنا — پائینچوں میں بھی اب بھری ہے ہوا

مجلسِ نسواں میں دیکھو عزتِ تعلیم کو — پردہ اُٹھا چاہتا ہے علم کی تعظیم کو

تمام شہر سے بی بی کا دوستانہ ہوا — کلب ہوا مرا گھر یا غریب خانہ ہوا

جاتی ہے اسکول میں لڑکی تو کچھ حاصل کرے — کیا ہوا حاصل جو بس بیباک بن کر رہ گئی

لیکن انھیں یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ زمانے کا بہاؤ کس طرف کو ہے۔

بٹھائی جائیں گی پردے میں بیبیاں کب تک — بنے رہو گے تم اس ملک میں میاں کب تک

اور یہ بات صرف عورتوں کے مسئلے تک ہی محدود نہ تھی بلکہ نئی روشنی کی دوسری خرابیوں کی طرف سے بھی وہ سخت متردد سے تھے اور ان کو یہ نظر آتا تھا کہ برائیوں کا یہ سیلاب کسی کے روکے نہ رُک سکے گا۔

نہ حالیؔ کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے — نہ اکبرؔ کی ظرافت سے رُکے یارانِ خود آرا

شعرِ اکبرؔ کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب — یہ اُسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

زمانے کی بے رُخی اور ابنائے زمانہ کی بے اعتنائی کے وہ بے حد شاکی تھے۔ ایک خط مرزا سلطان احمد کو لکھتے ہیں۔
" پولیٹیکل ظلمت اور سوشل ابتریاں اور بھی سوہان روح ہیں۔ یارانِ موافق عنقا، دو ایک ہیں بھی تو بہت دور اللہ اللہ اور بس۔ ...... کل بے اختیار ایک شعر میری زبان سے نکل گیا۔ ایک صاحب نے بہت پسند کیا، مگر میں

تو اس کو بھی ایک آہ بے معنی سمجھتا ہوں ۔

حضرتِ واعظ سے اب یہ قوم زندہ ہوگی کیا　　اتنے مردوں کو مسیحا بھی جِلا سکتے نہیں "

اکبر محسوس کرتے تھے کہ تہذیب مغرب کے اس طوفان میں جو ہر سمت سے اُمنڈ رہا ہے ہماری ہر وہ شے جو ہمیں عزیز ہے ڈوب جائے گی ، وہ تڑپ جاتے تھے ، بے تاب ہوکر نالے کرتے تھے ۔ مگر اُن کے یہ نالے روحِ ملت کو نہ گرما سکے اور تہذیب نو کا یہ شیش محل اُن کو دیوارِ قہقہہ کے مانند اپنی جانب کھینچتا رہا ۔ اس سے اکبر کے حساس دل پر اور کاری ضرب لگی اور وہ مجبوری و مایوسی کے عالم میں فریاد کر اُٹھے ۔

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے　　نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی　　نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے　　نیا کعبہ بنے گا ۔ مغربی پتلے صنم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی　　لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا　　ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر　　بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

لیکن اکبر کی یہ فریاد بے سبب تھی ۔ ان کے تیر و نشتر اپنا کام کر چکے تھے ۔ طوفان اُٹھا اور سیلاب آیا ۔ لیکن مغربیت کے اس سیلاب میں وہ شدت نہ رہی تھی : حالی اور شبلی کے ساتھ اکبر کا بھی اس شدت کو کم کرنے میں بہت بڑا حصہ ہے ۔ دراصل اکبر کے طنز یہ نشتروں نے طوفانِ مغرب کا ردِ عمل پیدا کیا اور نئی نسل مجبور ہوئی کہ وہ اس کے نتائج و عواقب اور مالہ و ماعلیہ کو پرکھے ۔ سوچے اور غور کرے ۔ اس لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ اکبر اپنے اصلاحی اور انقلابی مقصد میں کامیاب ہوئے تو بیجا نہیں ۔

اب چند لفظ اکبر کی شاعری کے محاسن کی بابت بھی سن لیجئے ۔ اکبر سے پہلے ظرافت کا معیار بلند نہ تھا ۔ سودا اور انشا کے دور کا مزاج عموماً پھکڑپن کی طرف لے جاتا تھا ۔ اودھ پنچ کی ظرافت اس سے بہتر تھی لیکن اس میں بھی درشتی اور تصنع تھا ۔ اکبر نے سب سے پہلے مزاح کا وہ رنگ اختیار کیا جس نے معیاری صنف ادب کی حیثیت سے ابدیت حاصل کی ۔ آتش ان کے دادا استاد تھے ۔ اس لکھنوی تلمذ سے انھوں نے رعایت لفظی اور قدرتِ بیان حاصل کی لیکن اس سے بہترین کام لیا ۔ اکبر ہنستے ہنساتے ہیں ، مگر اس میں کوئی مقصد پوشیدہ ہوتا ہے اور چونکہ یہ مقصد اصلاحِ قوم اور اصلاحِ معاشرت جیسا پاکیزہ جذبہ ہے ، اس لئے ان کی ظرافت میں شگفتگی اور پاکیزگی آگئی ہے ۔ پھر یہ کہ اس غرض میں کامیاب ہونے کے لئے انھوں نے مزاح میں طنز کی آمیزش کی ہے ۔ جو بسا اوقات اپنی زہرناکی کے باعث بے پناہ ہو جاتی ہے ۔ مضمون کے الٹ پھیر کے ساتھ ان کے یہاں الفاظ کا الٹ پھیر بھی ملتا ہے ۔ رعایتِ لفظی اور قافیہ پیمائی بھی ہے ، بلکہ یوں سمجھئے کہ یہی باتیں ان کے طنز و مزاح کی جان ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان کے ہاتھ میں آکر یہ خزف ریزے جواہر پارے بن جاتے ہیں اور یہی سبب ہے کہ ان کا یہ رنگ ان کے بعد کوئی بھی اس کامیابی اور استادی کے ساتھ نہ نباہ سکا ۔ اسی طرح انھوں نے بعض جدید اصطلاحیں تراش لی تھیں جو ان کی شاعری کی مخصوص علامات بن گئی ہیں ۔ جیسے شیخ ۔ جمن ۔ سید ۔ بدھو ۔ کلو ۔ مس وغیرہ ۔ انگریزی لفظوں کے استعمال سے وہ اپنے شعروں میں چاشنی بڑھا دیتے ہیں ۔ جو اشعار پہلے آچکے ہیں ، ان میں یہ خوبیاں موجود ہیں ۔ کچھ شعر اور بھی سن لیجئے ؎

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی　　شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا　　ملک میں مضموں نہ پھیلا اور جوتا چل گیا

اکبر دبے نہیں کسی سلطاں کی فوج سے　　لیکن شہید ہو گئے بیگم کی نوج سے

اولڈ مرزا بے طرح بدنام ہیں　　ینگ بدھو وارثِ اسلام ہیں

ایسی پری اور مجھ کو پیارا لکھے　　القاب میں دیکھئے ڈیر کلّو ہے

بتائیں آپ کو مرنے کے بعد کیا ہوگا　　پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

پہلے ہوتی ہے حسرتِ نئی پیدا　　بعد اس کے ہوتی ہے بحثِ نیشن پیدا

بوزنہ کو رقص پر کس بات کی میں داد دوں　　ہاں یہ جائز ہے مداری کو مبارکباد دوں

نئی ترکیب یہ شیطان کو سوجھی ہے اغوا کی　　خدا کی حمد کیجئے ترک بس مجھ کو برا کہئے

خدا کی راہ میں پہلے بسر کرتے تھے سختی پر　　محل میں لیٹ کر اب عشقِ قومی میں تڑپتے ہیں

غرض اکبر نے بحث پر دسہ کی بہت کچھ گو ہوا کیا　　نقاب الٹ ہی دی اس نے یہ کہہ کر کہ ہے گا ہوا کیا

آخر میں اردو ہندی قضیے پر اکبر کا طنز بھی سن لیجئے فرماتے ہیں :۔

بھائیو! تم کبھی ہندی کے مخالف نہ بنو　　مر کے سمجھا ہوں میں اتنا کہ یہ تھی کام کی بات

بس کہ تھا نامۂ اعمال مرا ہندی میں　　کوئی پڑھ ہی نہ سکا مل گئی فی الفور نجات

اکبر کو ہم سے یہ شکایت درست نہ تھی کہ :۔

گو اپنے ساتھ آپ کا مُہر آنہ لے گیا　　اکبر مگر خدا کی گواہی تو دے گیا

اسلئے ان کے پیام کو ان کی زندگی ہی میں قبولِ عام و خاص کا طغرا مل چکا تھا اور قوم نے ان کو لسان العصر تسلیم کر لیا تھا البتہ اس "ظرافت" اور ہنسنے ہنسانے میں اکثر لوگ یہ بھول گئے کہ ان پر یہ بھی فرض ہے کہ اکبر کے صحیح منصب اور مقام کو سمجھیں جو جانا ہے کہ ان کا طنز و مزاح کوئی وقتی و ہنگامی شے نہیں بلکہ انقلابی و پیامی شاعری اس پردے میں جھانک رہی ہے ۔

اکبر الہ آبادی

(ڈاکٹر امرناتھ جھا)

انیسویں صدی میں اُردو شاعری کافی ترقی کرچکی تھی۔ ہرچند کہ لکھنؤ اس کے اقتدار کے مقابلہ میں گاہ گاہ اکھڑا ہوتا تھا۔ پر دہلی کی زبان معیاری زبان کی حیثیت سے مانی ہوئی تھی۔ اس کی نوعمری میں دکن نے اس کی پرورش کی تھی۔ مگر اب وہ چلتا ہوا مرکز نہ رہا تھا۔ اکثر اہل قلم دہلی اور لکھنؤ ہی میں اپنی ترقی کے سامان پا رہے تھے۔ اس میں سے معدودے چند دربار حیدرآباد کی طرف ہجرت کر گئے تھے اور وہاں کی سرپرستی حاصل کر پائے تھے۔ لیکن وہ وہاں رس بس نہ پائے اور وہ ہمیشہ اپنی متمنی نگاہیں شمال کی طرف ہی ڈالتے رہے۔ اردو ایک شستہ وشائستہ زبان بن چکی تھی۔ اس کا ابتدائی اکھڑپن دور ہو چکا تھا مگر اس راہ میں اس کی توانائی گھٹ گئی تھی۔ تازگی اور قوت کھو جانے سے اس کے اسالیب پرتکلف اور بندھے ٹکے ہو کر رہ گئے تھے تشبیہیں اور استعارے بس ایک مخصوص قماش کی پیروی کرتے تھے۔ ہندوستانی اصل کے الفاظ بڑی سختی سے ترک کئے جا رہے تھے۔ دہلی، لکھنؤ اور حیدرآباد کے درباروں کی پروردہ شاعری کا بیشتر حصہ باوجود اعلیٰ صنعتوں کے سستا اور اوچھا تھا، سادہ پُرجوش ہونے کے بجائے جذبات ہوس پرستانہ تھے۔ اس عہد کی زوال پذیر سماجی زندگی پورے طور پر شاعری میں منعکس ہے۔

نیا خون

پھر بھی یہ بڑی قابل لحاظ بات ہے کہ میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ، آتشؔ، ناسخؔ، دردؔ، داغؔ اور انیسؔ نے صحیح معنوں میں اعلیٰ شاعری کا کتنا بڑا ذخیرہ پیدا کیا۔ نغمہ سرا چڑیوں کے اس نشیمن میں اور بھی ممتاز گانے والے تھے لیکن وقت آگیا تھا کہ اردو میں نیا خون داخل کیا جائے۔ حالیؔ اور اکبرؔ دوسروں سے زیادہ اس تبدیلی کے ذمہ دار تھے جو اردو کے معنی و صورت میں رونما ہوئی۔ جب ۱۸۷۴ء میں حالیؔ نے مندرجہ ذیل اشعار لکھے تو وہ نئی طرز میں نئی بات کہہ رہے تھے

اے وطن! اے مرے بہشتِ بریں　　　کیا ہوئے تیرے آسمان وزمیں

تیری اک مشتِ خاک کے بدلے　　　لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

لیکن یہ اکبرؔ کی تقدیر میں تھا کہ وہ اردو شاعری کے مواد اور مزاج میں ایسی تبدیلی پیدا کریں جو گویا انقلابی تھی۔

پیدائش اور خاندان

سید اکبر حسین، بارہ ضلع الہ آباد میں ۱۶ نومبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کے آبا کا ابتدائی وطن نیشاپور ایران تھا۔ ان کے پردادا فوج میں صوبہ دار تھے۔ انھوں نے جنگ پلاسی میں حصہ لیا تھا۔ ان کے دادا سید فضل محمد عالم تھے۔ انھیں اودھ کے نواب آصف الدولہ سے جاگیر ملی تھی۔ ان کے والد سید تفضل حسین نے نائب تحصیلداری تک ترقی حاصل کی اور ۱۸۸۸ء میں وفات پائی۔ ان کی والدہ صوبۂ بہار کے ضلع گیا کی رہنے والی تھیں۔ اس عہد کے متوسط طبقے کے نمائندہ گھرانے کے نوجوانوں کی طرح اکبر نے فارسی اور عربی پڑھی لیکن وہ انگریزی کی جانب بھی

کھینچے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جب شروع شروع انگریزی ہندوستان میں رواج پانے لگی تو من حیث الجماعت مسلمانوں نے اسکولوں سے کنارہ کشی کی۔ تاآنکہ سرسید احمد خاں سامنے آئے اور ان کی کوششوں کے نتیجے میں مسلمانوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اب انگریزی تعلیم کے فائدوں سے متمتع ہوں گے۔ اکبر کو تمام عمر اسی نظامِ تعلیم سے گہری بے اعتمادی رہی۔ جسکو ملکی روایات سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ یہ بے اعتمادی ان کے اشعار سے مستقل طور پر ظاہر ہوتی رہی۔ ۱۸۶۷ء میں وہ نائب تحصیلدار مقرر ہوئے۔ ۱۸۷۳ء میں انھوں نے پلیڈری کا آخری امتحان پاس کیا۔ اور کچھ عرصہ تک وکالت کرتے رہے۔ ۱۸۶۷ء میں وہ ملازمت عدلیہ میں منصف کی حیثیت سے لئے گئے۔ وہ ترقی کر کے ضلع جج بنے اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر الہ آباد میں بس گئے۔ عشرت منزل میں رہتے تھے، انھوں نے ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء کو ۷۵ سال کی عمر میں انتقال کیا۔ ان کے زندہ رہ جانے والے لڑکے سید عشرت حسین جو ضلع کلکٹر کے عہدے تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے تھے۔ چند سال قبل انتقال فرما گئے۔ عشرت کے لڑکے عقیل اور مسلم جو دونوں میرے سابق شاگرد تھے۔ دونوں پاکستان میں ہیں۔ اکبر کی تدفین خسرو باغ کے قریب لاڈنڈا میں ہوئی تھی۔ ان کے مقبرہ میں مندرجہ ذیل شعر کندہ ہے۔

قبر میں آئی تجلی روئے جاناں کی مجھے — زہر سمجھے تھے جسے وہ شربتِ دیدار تھا

دلچسپ شخصیت

شخصی لحاظ سے اکبر اتنے ہی دلچسپ تھے جتنے کہ وہ شاعر کی حیثیت سے تھے۔ ان کی صحبت میں بے کیفی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ نہایت ہی دلنواز اور جوش آفریں گفتگو کرنے والے تھے۔ لطیفے پر لطیفے سناتے جاتے۔ اشخاص و واقعات کے متعلق عیارانہ اشارات کئے جاتے۔ یادِ ایام کی باتیں ہوتی تھیں۔ چٹکلے، زندگی بدامان کہاوتیں، اقوال اور فی البدیہہ اشعار پیش کئے جاتے تھے۔ ان کی گفتگو شراب و کباب کی طرح ہوتی تھی۔ نغمہ خیز اور مقوی۔ مجھے کئی بار انھیں دیکھنے کا فخر حاصل ہوا۔ لیکن میں صرف دو بار دو محترم دوستوں کے ساتھ ان سے ملنے ان کے گھر پر حاضر ہوا۔ (افسوس! یہ دونوں حضرات مسٹر کچلو اور مولوی نصیر الدین انتقال فرما چکے) وہ ہم سے بڑی بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے وہ ان دنوں اپنے بیٹے سے ملنے پرتاب گڑھ گئے تھے۔ اس ملاقات کا مفصل طور پر ذکر کرتے رہے۔ اور ہم لوگوں کو ایک گھنٹہ تک اپنی باتوں سے مسحور رکھا۔ اس وقت وہ اپنی زندگی کے آخری سال میں تھے۔ لیکن ان کی گفتگو کی جانداری اور ولولہ سے آنے والے انجام کا ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا تھا۔ ہم نے پوچھا کہ پرتاب گڑھ کے لوگوں نے آپ کا دھوم دھام سے خیر مقدم کیا ہو گا۔ جواب ملا:

ڈپٹی صاحب کے والد

ایک دفعہ خدا نے لندن کی سیر کی۔ دن بھر وہ سرگرداں رہے۔ گلی گلی کی خاک چھانی۔ در بدر دستک دیتے پھرے لیکن وہ دھکے دے کر نکال دئے گئے۔ کسی نے پانی بھی ان کو پینے کو نہ دیا۔ اور بھوکے آخرش وہ ایک مکان پر پہنچے اور لوگوں کو بتلایا کہ وہ خدا ہیں۔ پھر انھوں نے ایک گلاس پینے کو پانی مانگا، لیکن یہ بات رد کر دی گئی۔ پھر وہ اِدھر اُدھر بھٹکنے پر مجبور ہوئے تھکے ہارے وہ ایک مکان میں جا داخل ہوئے۔ انھیں شدت سے پیاس لگی۔ فرمایا میں یسوع مسیح کا باپ ہوں۔ یہ سن کر گھر کے مالک نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ اور خاطر و تواضع کی بارش سے انھیں ششدر کر دیا۔"

بھائی! پرتاب گڑھ میں کسی نے اکبر کی طرف پھوٹی آنکھوں سے بھی نہیں دیکھا، لیکن ڈپٹی صاحب کے والد کی بڑی قدر ہوئی یہ ہماری اکبر الہ آبادی سے گفتگو کا محض ایک ٹکڑا تھا جو میرے حافظہ میں باقی رہ گیا۔ اسی وقت انھوں نے ایک شعر کہا، اور ہمیں

سنایا۔ ملاحظہ ہو ؎

ہیں کسی چیز کا نہیں عادی — ایک عادت ہے سانس لینے کی

ایک دن کوئی نوجوان شاعر ان سے ملنے گیا۔ فرمایا۔

تحفۂ شب برات کیا بھیجوں — تم تو اے جان خود پٹاخہ ہو

اکبر نے روایتی انداز میں بہت غزلیں لکھی ہیں۔ جن میں اُردو دنیا کے معروف عشقیہ تجربے پیش کئے گئے ہیں۔ آرزوئے ناکام، گریز محبوب، رقیب پر مہربانیاں، پروانے کا شمع سے لگاؤ، بہار میں قید قفس کی سختیاں، غم نجات کیلئے ساقی کی نوازشیں۔ حسن کا فرا اور مسجد کی خانہ ویرانی، واعظ کی حماقتیں، وغیرہ وغیرہ۔ غرض یہ کہ یہی گھسے پٹے ہوئے استعارات اور علامتیں جنھیں ہر لپشت میں نئی زندگی مل جاتی ہے۔ اکبر نے بھی برتی ہیں، مثلاً جس نے اکبر کی تفریحی شاعری کا مطالعہ کیا ہے۔ مندرجہ ذیل شعر اکبر کی کاوش کا نتیجہ تسلیم نہیں کرے گا۔

جو ذبح کر نا ہے پر کھول دے مرے صیاد — کہ رہ نہ جائے تڑپنے کی آرزو باقی

ذیل میں چند اور اشعار درج ہیں جن میں تغزل کا رنگ بہت نمایاں ہے ؎

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام — وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مریض محبت ترا مر گیا — خدا کی طرف سے دعا ہو گئی

ان کا گھر چھوڑ کر کہاں جاؤں — دل ہی کے ساتھ میں ٹھہرتا ہوں

یہ ارشاد آپ کا بالکل بجا ہے حضرت واعظ — مگر میں کیا کہوں بس کچھ نہیں پڑتی جواں ہو کر

آئی ہوگی کسی کو ہجر میں موت — مجھ کو تو نیند بھی نہیں آتی

کوئی اکبر سا دیوانہ بھی نظر آیا ہے کم — پہروں روتا ہے، پوچھو تو سبب کچھ بھی نہیں

ہر چند کہ اس طرز کے اشعار روایتی انداز میں لکھے گئے ہیں۔ تاہم ان میں وہ تازگی ہے جو ان کے ہمعصروں کے پُر تصنع کلام میں مفقود ہے۔ کلام منظوم کی فن کاری میں اکبر نے حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ وہ غیر ملکی الفاظ اور اسمائے خاص کو بھی قافیہ میں نہایت مکمل طور پر برتتے ہیں۔ میں نے ایک ایسا شعر سنا ہے جو کسی مجموعہ میں نہیں ملتا۔ کسی نے اکبر سے فرمائش کی کہ وہ ایک ایسا شعر لکھیں جس میں مسٹر کچلو کا قافیہ ہو۔ فی البدیہہ مندرجہ ذیل شعر وارد ہوا ؎

کوئی جاکے کہہ دو کچلو سے — ہم سب ہو گئے ہیں زچ تو سے

اس طرز کے طبع آزمائی کے بہت سے نمونے ملتے ہیں ؎

چھکڑے پہ جو چڑھتے تھے ہیں موٹر پہ سوار آج — کیوں اس کو سمجھتے نہیں تم لوگ سوراج

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا — حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا

مذہب کا اثر

اکبر کو ہمیشہ یہ دکھ رہا کہ سماج پر مذہب کا اثر کم سے کم ہوتا جاتا ہے۔ وہ مادی اور سائنٹفک ترقی کے خلاف نہیں تھے لیکن روحانی اعتقاد کے نہ ہونے پر نفرین کرتے تھے۔ وہ رجعت پسند نہیں تھے اگرچہ ان کے بعض اشعار سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے انھیں سائنس کے فوائد تسلیم تھے۔ لیکن وہ مذہبی خوبیوں پر قدر دیتے تھے۔

——— وہ اسلام کے معتقد تھے۔ وہ متشدد نہیں تھے۔ وہ مانتے تھے کہ دوسرے مذاہب کو بھی قائم رہنے اور پھلنے پھولنے کا حق حاصل ہے۔ اپنے بعض اشعار میں وہ سر سید احمد خاں اور ان کے تعلیمی پروگرام پر کڑی نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اکبر حیدری مرحوم کے در دولت پر ہونے والی ایک گفتگو مجھے اس سلسلہ میں یاد آتی ہے۔ انھوں نے مجھے اور ڈاکٹر ضیاء الدین کو کھانے پر بلایا تھا۔ برسبیل تذکرہ سر حیدری نے پوچھا کہ "ضیاء الدین مجھے بتاؤ تو بھلا علی گڑھ تحریک سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلافات بڑھ نہیں گئے۔" ڈاکٹر ضیاء الدین خاموش رہے۔ مگر وہ نمایاں طور پر پریشان خاطر تھے۔ بہرکیف اکبر طلبۂ کالج پر عموماً اور طلبۂ علی گڑھ پر خصوصاً فقرے کسنے کا موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی قومی تہذیب کو ترک کیا تھا۔

ڈاروِن صاحب حقیقت سے نہایت دور تھے — میں نہ مانوں گا کہ مورث آپ کے لنگور تھے

صاحبزادے نشہ میں ہیں اور بیف کنور جی کی ہے ٹفن — ہیں مولوی صاحب بھی چپ اور پنڈت جی مہاراج بھی چپ

یہ میرے سامنے شیخ و برہمن کیا جھگڑتے ہیں — اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہوں دونوں کا قائل ہوں

حریفوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

یورپ والے جو چاہیں دل میں بھر دیں — جس کے سر پر وہ چاہیں تخت دھر دیں

بچتے رہو ان کی تیزیوں سے اکبر — تم تو کیا ہو، خدا کے تین ٹکڑے کر دیں

شری پارس ناتھ سنہا کی کتاب میں بہت سے اشعار گاندھی جی کے متعلق ہیں اور کئی اردو ہندی جھگڑے کے بارہ میں اور بہتیرے ہندو مسلم اتحاد سے متعلق ذیل میں گاندھی جی سے متعلق دو شعر دیئے جاتے ہیں۔

ہوں مبارک حضور کو گاندھی — ایسے دشمن نصیب ہوں کس کو

کہ بیٹھیں خوب اور سر نہ اٹھائیں — اور کھسک جائیں جب کہوں کس کو

میں نے ختم کلام کے لئے اکبر کی شاعری کا وہ حصہ چھوڑ رکھا تھا جو اس کا بہترین نمائندہ ہے، یعنی طنز و ظرافت یہ تیز اور کٹیلی ہے۔ مگر اس سے زخم نہیں لگتا۔ اس کی زد پر آیا ہوا شکار تلملا اٹھتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد تربیت اور ترقی ہے۔ نفرت و عداوت کا زہر اس میں نام کو نہیں۔ مزاحِ لطیف اس زہر کا مداوا بن جاتا ہے۔

مثالیں تو بھری پڑی ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم۔ تیزی کی گراوٹ۔ مغرب کی غلامانہ نقالی۔ شہرت کی ہوس، کم علمی کا عجب و تکبر۔ روایات سے بے خبری وغیرہ ان کے ہدف ہیں۔ ان اشعار میں اس دور کی مصوری ہے، جو اب گزر گیا مثلاً برطانوی افسروں کا رعب داب۔ چھاؤنیوں کی زندگی۔ ریسٹوران میں یورپی کھانوں کی طرف رغبت۔ خطابات کا خبط۔ سرکاری نوازشات کا جنون۔ یہ نمونے نہایت قیمتی ہیں۔ کیونکہ ان سے ہماری تواریخ کے ایک دور پر روشنی پڑتی ہے۔ ان میں غور و فکر کے لئے بڑا مواد ہے۔

کیوں سول سرجن کا آنا روکتا ہے ہم نشیں — اس میں ہے اک بات آنر کی شفا ہو یا نہ ہو

ہوئے اس قدر مہذب، کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا — کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جا کر

چور کے بھائی گرہ کٹ تو سنا کرتے تھے — اب یہ سنتے ہیں اڈیٹر کے برادر لیڈر

برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ — روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

ریسٹ ری کو کر لیا جب قوم کے سر نے قبول ... دخلِ انگریزی پہ اردو کی شکایت ہے فضول
تھی جنت ان کو مسلمانوں کی تہذیب کی فکر ... بولے مسجد کے تلے ہیٔے کا بھی سامان رہے

الہ آباد نے بڑے بڑے ماہرین سیاست، جج، قانون دان اور اہل تدبر پیدا کئے ہیں۔ زمانۂ قدیم سے یہ علم کا مرکز رہا ہے، لیکن عصرِ حاضر کے ہندوستانی ادب میں اس کا سب سے بڑا کارنامہ اکبر ہے۔ ہمیں ان کی یاد سینے سے لگائے رکھنی چاہیے۔

اکبر، شخصیت اور فن کی روشنی میں

(ڈاکٹر سید اعجاز حسین)

اکبر کی فنکاری کا مطالعہ کرنے کے لئے نہ صرف اکبر کی ذہنیت اور ان کے ماحول کے مطالعہ کی ضرورت ہے بلکہ اردو ادب کی بعض خصوصیات پر بھی غور کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ غزل کی جامعیت نے اردو شاعری میں شوخی اور نشتریت کے وہ اجزاء پیدا کر دئے تھے کہ اس کی آفرینش سے آجتک لطافت و دلکشی سہیلی بن کر اس کے جلو میں ساتھ ساتھ چل رہی ہیں۔ دو مصرعوں میں بڑے سے بڑے خیال کو نظم کرنا یوں بھی مشکل کام ہے اور جب رموز حسن و عشق بیان کرنا ہو تو یہ مرحلہ اور بھی دشوار بن جاتا ہے۔ اشارے کنائے میں سب کچھ کہہ جانا اور اس طرح سے کہنا کہ بات مبہم نہ رہ جائے، شعر پہیلی نہ بن جائے اسی وقت ممکن ہے کہ زبان پر عبور ہو اور بیان پر حاکمانہ تصرف، ورنہ فیض سخن کا سہارا لے کر کوئی شخص کامیاب فنکار نہیں بن سکتا۔ غزل کی اس اختصار پسندی نے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم واضح کرنے کی صلاحیت عام کر دی اور محبت کی داستان نے نکتہ سنجی و برجستگی کی طرف ذہن و دماغ کو رجوع کر دیا۔ ادھر ایک شعر میں پورا مفہوم واضح کرنے کا مطالبہ اور ادھر حسن و عشق کی روداد، پیام و سلام، گفت و شنید کے تقاضے نے فنکاری کی اس صلاحیت کو ابھار کر جو ایک جملہ میں تمام باتوں کی طرف اشارہ کر دے اور ذکاوت کا سہارا لے کر معقول بات فوراً کہہ دینے پر قادر کر دے اردو غزل میں یہ سلسلہ ابتدا ہی سے کارفرما تھا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک عرصہ کے بعد زبان میں عام طور سے اور بیان میں خاص طور سے نکتہ سنجی و برجستگی کا غلبہ ہو گیا۔ اسی شاعر پر فن کی دیوی نے نظر عنایت کی جس کے یہاں یہ خوبیاں زیادہ سے زیادہ نظر آئیں، زبان نے بھی اس شخص کو انفرادیت عطا کی، کلام میں اوصاف چولی دامن کی طرح ساتھ دکھائی دیئے۔

کلام کو دلکش بنانے کے سلسلہ میں اور بہت سے حربے استعمال کئے گئے، جو جتنا فراخ دل و دماغ لے کر آیا حسب استعداد آرائش کی ویسی ہی فکر کرتا رہا، مگر بات میں بات پیدا کرنا اور تجربوں اور تاثیر کا امتزاج آسان کام نہ تھا، بڑی نکتہ رسی او دقیقہ سنجی کی ضرورت تھی کہ فن میں عظمت و لطافت کے ساتھ ساتھ ہمہ گیری اور دلکشی پیدا ہو سکے۔

فطری صلاحیتوں کی کمی پورا کرنے کے لئے اور شعر میں دلکشی پیدا کرنے کا جب وہ سامان بہم نہ پہنچ سکا جو شاعر کو شاعر بنا سکے اور شعر کو ابدیت عطا کر سکے تو جذبۂ شعر گوئی و داد طلبی کو آسودہ کرنے کے لئے ایسی صورتیں بھی اختیار کی گئیں جو روح کو چاہے گرما نہ سکیں مگر دل کو ضرور ابھار دیں۔

منجملہ اور صورتوں کے رعایت لفظی پر سب سے پہلے نظر گئی۔ اس کی چمک دمک اور ایک لفظ کے سہارے سے دوسرے لفظوں تک ذہن کو فوراً منتقل ہونے میں ایک خاص لطف آنے لگا۔ اور چونکہ یہ رعایت لفظی اردو کو ابتدا ہی سے ام الصبیان

کی طرح پٹتی ہوئی تھی۔ اس لئے تلاش کرنے میں زیادہ کاوش بھی نہیں کرنی پڑی فوراً اس سے فائدہ اٹھایا گیا۔

رعایت لفظی حسن کلام میں داخل ہے مگر ابتدا ہی سے اردو والے اس صنعت کے اتنے دلدادہ ہو گئے کہ حد اعتدال سے تجاوز کر گئے۔

مظہر جان جاناں اور سودا نے اپنے اپنے زمانے ہی میں اس خطرہ کو محسوس کر کے روک تھام کی فکر کی تھی، مگر بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکے یہاں تک کہ یہ وبا بن کر دہلی سے لکھنؤ تک آگئی اور لکھنؤ والوں نے رعایت لفظی پر اتنا زور دیا کہ ساری شاعری اسی میں غرق ہو گئی۔ آتش و ناسخ کے زمانے میں حد سے زیادہ اس صنعت کا غلبہ ہو گیا۔ امانت اور دیا شنکر نسیم نے اس کو معراج پر پہنچا دیا۔ ان لوگوں کے بعد بھی احمد علی شوق وغیرہ نے اپنی شاعری کا جزو غالب اسی رعایت لفظی کو رکھا ان کے بعد البتہ اس کو زوال شروع ہوا۔ اس کا سبب معلوم کرنا ذرا مشکل ہے یہ قطعی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ بعد والوں نے اس صنعت کو حد کمال تک دیکھ کر اب اس سے آگے نہ بڑھ سکنے کی وجہ سے ہمت چھوڑ دی یا حقیقتاً محسوس کرنے لگے کہ یہ حربہ شاعری کے لئے صرف بیکار ہی نہیں بلکہ مضر بھی ہے۔

بہر حال جلال کے زمانے سے اس صنعت میں روز افزوں کمی نظر آنے لگی اور حالی کے وقت تک یہ رعایت لفظی ما دات پر آگئی۔ مگر چونکہ اردو کی گھٹی میں یہ چیز پڑ گئی تھی اس وجہ سے اب بھی ایک طبقہ اس کی چاشنی سے اپنی شاعری کو لذیذ بنانے کی کوشش کرتا رہا۔

اودھ پنچ اخبار کا جو ایک خاص اسکول قائم ہو گیا تھا اس کو بھی رعایت لفظی وغیرہ کا خاص چسکا تھا لیکن اس اسکول کے ماننے والے اس صنعت کو ایک سلیقہ کے ساتھ کام میں لائے ان کے یہاں رعایت لفظی کا استعمال ناگوار خاطر نہ تھا، عموماً اعتدال برتتے تھے۔ اکبر اس اسکول کے خاص جزو تھے بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ مذاق، بیباکی، علمیت کی وجہ سے اودھ پنچ کے لئے زبردست سہارا تھے اس لئے کہ اودھ پنچ کے خاص مذاق کے لحاظ سے اس میں نثر نگار زیادہ تھے، اکبر ایسا شاعر کوئی نہ تھا اودھ پنچ کی ذہنیت اور رویہ سے اس وقت کی اردو کی دنیا مرعوب و متاثر تھی، اکبر بھی اس کے مذاق و رجحان کے گرویدہ تھے۔ لہٰذا منجملہ اور خصوصیات کے رعایت لفظی کو انھوں نے بھی اپنایا، مگر ایک خاص لطافت سے اس کو اشعار میں جگہ دیتے رہے مترادف لفظوں کے مفہوم سے انھوں نے اپنے خیالات کا سہارا حاصل کیا۔ ابہام سے اپنے فن اور عام پسندیدگی کو ابھارنے کی سعی پیہم کو ان کے یہاں برابر نظر آئے گی، ایک طرف تو صدیوں سے لوگوں کی ذہنی انسیت اور دوسری طرف نئے مفہوم اور خاص شعور کے ساتھ رعایت لفظی کو ایک نئے پیرائے میں دیکھ کر دنیا کو شاعری میں ایک نئی کشش نظر آئی جس میں ان کا کہنہ ذوق بھی آسودہ ہوتا تھا اور زمانہ کی روداد اور اپنے کردار کی تصویر بھی بولتی ہوئی دکھائی پڑی۔ لیکن اس زمانے سے بھی پہلے جب اکبر، اکبر نہ تھے صرف غزلیں کہتے تھے، اپنے ہی غم کی روداد بیان کیا کرتے تھے۔ حسن و عشق تک ان کی شاعری محدود تھی تب بھی ان کے یہاں رعایت لفظی کو کافی جگہ دی جاتی تھی۔ اس لئے کہ اس وقت کی شاعری اور مذاق کا ذہنی مطالعہ اسی قسم کا تھا۔ مثال کے لئے دو چار اشعار ان کی ابتدائی غزلوں سے پیش کئے جاتے ہیں ؎

دکھلاتے ہیں بت جلوۂ مستانہ کسی کا — یاں کعبۂ مقصود ہے بُت خانہ کسی کا
گر شیخ و برہمن سنیں افسانہ کسی کا — معبد نہ رہے کعبہ و بُت خانہ کسی کا
اللہ نے دی ہے جو تمھیں چاند سی صورت — روشن بھی کرو جا کے سیہ خانہ کسی کا

ہجر میں دانتوں کے گریاں جو میں بیتاب ہوا — اشک آنکھوں سے جو نکلا دُرِ نایاب ہوا
سبزۂ خط سے قرارِ دلِ بے تاب ہوا — کشتہ اس بوٹی سے آخر کو یہ سیماب ہوا
ہوگیا غرق میں یادِ رُخِ نورانی میں — ہالۂ ماہ مجھے حلقۂ گرداب ہوا

غزلوں میں اکبر کی رعایت لفظی اتنی نہ نکھر سکی جتنی نظموں میں۔ یہاں فرسودگیٔ مذاق یا آورد کا پتہ صاف صاف چل جاتا ہے لیکن نظموں میں یہی صنعت تازگی و جدت کو سہارا دیتی ملتی ہے۔ عمر و شعور کے ساتھ ساتھ اکبر کو احساس بھی ہوتا گیا اور ان کے مخصوص موضوع کا تقاضا بھی یہی ہوا کہ الفاظ سے "کھیلنے کے بجائے ان کو نشتر بنا کر دلوں میں اتارا جائے، اس لئے وہ اس کو کم کرنے اور اس میں لطافت پیدا کرنے کی فکر میں زیادہ متوجہ معلوم ہوتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اکبر نے آگے چل کر جو موضوع اختیار کیا اس کے لئے انداز بیان کا کوئی نمونہ اردو شاعری میں نہ تھا، اور موضوع اس وقت تک کامیابی کے ساتھ نہیں پیش کیا جا سکتا۔ جب تک اس کی خصوصیات کو ایسے الفاظ اور ایسا اسلوب نگارش نہ مل جائے جو اشارے کنائے میں کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ مفہوم پیش کر دے۔ گویا موضوع کو ایک ایسے لب و لہجہ کی ضرورت ہے جو فن کار کی تخلیقی قوتوں اور سامعین کی توجہ کو ایک مرکز پر لا کر اکٹھا کر دے یا اپنی مقناطیسی قوت سے دونوں کو قریب تر کر دے۔

اکبر نے اپنے شعور یا محسوسات کو جس عنوان سے پیش کیا وہ اُردو میں اس سے پہلے نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس سے پہلے کی تمام اُردو شاعری کا جائزہ لے لیجئے تو بھی یہی معلوم ہوگا کہ ظریفانہ شاعری " ہجو کے علاوہ کسی اور شکل میں کسی خاص اہمیت کے ساتھ نہیں ملتی۔ غزل، قصیدہ، وغیرہ میں بھولے بھٹکے مزاح تمسخر یا پھبتی وغیرہ کا کوئی جز کہیں مل جاتا ہے مگر نہ تو تسلسل کے ساتھ ملتا ہے اور نہ اس لطافت کے ساتھ جو اکبر نے پیش کیا۔ انھوں نے اپنے خیالات کو بغیر سوچے سمجھے عمل کا جامہ نہیں پہنایا، بدلتے ہوئے زمانے کو ایک نئی لے سے ہوشیار کرنے کا ارادہ شعوری تھا، وہ ظرافت کو ایک خاص اہمیت اور رول مقام کے ساتھ پیش کرنا چاہتے تھے کیونکہ اس کو محض تفریحات کے خانہ میں نہیں ڈال دینا چاہتے تھے بلکہ کسی خاص مقصد براری کا آلۂ کار بنانا چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ ان کی اس نظم سے بھی ہو سکتا ہے جو " نامہ بنام اودھ پنچ ۱۸۷۶ء " کے نام سے کلیات اکبر حصہ اوّل میں درج ہے۔

شوخی و ظرافت پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں ؎

باریک ہے گویا نکتہ اے دل — لازم ہے سمجھ لیں اسے عاقل
مرضی تھی خدائے جسم و جاں کی — محدود ہوں شوخیاں زباں کی
دل میں جو ہے بک نہ جاؤ — ہشیار چلو، بہک نہ جاؤ
دریائے خیال موجزن ہے — وقتِ یزداں و اہرمن ہے
ہے شارعِ عام حق و باطل — ناظر اس کی ہے فکرِ عاقل
گذرے جو خیال بد، بلا کد — بازوئے خرد سے بس کرو رَد
باطل پہ نہ جاؤ حق کو سن لو — کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لو

اکبر کی ذہانت اور دوراندیشی اسے دیکھ رہی تھی کہ دنیا بدل گئی ہے اور تیزی سے بدلتی جا رہی ہے اب جو طبقہ پیدا ہو رہا ہے اور سیلاب زمانہ جدھر لوگوں کو بہائے جا رہا ہے ...... اس کو آسودہ

کرنا یا ہو کتنا بھی نئے انداز سے چاہئے غزلوں سے یا تلخ نصیحت سے کام نہ بن سکے گا ، کیونکہ قدامت اور روایات نے ان حربوں کی دھار کو یا تو کند کر دیا ہے یا بے اثر کر دیا ہے اب لوگوں کی توجہ ادھر نہیں جاتی ، لہٰذا انھوں نے اپنی شاعری کو ملک و قوم کی خدمت کی طرف موڑ دیا اور ساتھ ہی ساتھ اس کو ایک نئے انداز سے ترتیب بھی دیا ۔ بظاہر تمسخر و ظرافت لیکن بباطن نصیحت و تنقید ۔ الفاظ زیادہ عام فہم لاتے ہیں ، لہجہ بھی ایسا نہیں ہوتا جسے آپ عالمانہ یا عامیانہ کہہ سکیں بلکہ درمیانی اور شریفانہ انداز بیان ہر جگہ ملتا ہے اور جس رخ پر اور مقصد کے لئے وہ اپنی شاعری سے چل رہے تھے ۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ لبِّ لہجہ کو اسی درجہ پر رکھتے ۔

اکبر کے انداز بیان و مقصد کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسا شخص ہمکلام ہے جس کے چہرے پر شگفتگی و تمسخر کے آثار ہیں مگر اس کی آواز میں ایک ایسی آنچ ہے جو ظرافت کو پگھلا کر دل نشیں ہونے تک متانت کا درجہ عطا کر دیتی ہے ہنسی ، اس لئے آتی ہے کہ اس کے تخاطب میں عموماً کسی ایک شخص کا مذاق نہیں ہوتا ، ہر شخص اس کے طنز کو دوسرے کے لئے مخصوص سمجھتا ہے مگر ہنسنے کے فوراً بعد ہی غور و فکر کا لمحہ آجاتا ہے اس وقت یہ راز کھلتا ہے کہ حقیقت میں اکبر نے ہم سبھوں کو مخاطب کیا تھا ، اور جس کو ہم مذاق و ظرافت سمجھے تھے اس کی تہ میں نصیحت و تنقید تھی جس سے سب فائدہ اٹھا سکتے ہیں ۔ بات کو اس نتیجہ تک پہنچانے میں اکبر نے بڑی صناعی سے کام لیا تھا ، لوگوں کے مذاق ، ادبی وابستگی ، زبان کی لطافت ، طرز بیان کی جدت اور مقصد کا تاثیر سے ہمکنار رہنے کو بڑی خوبی کے ساتھ ایک مرکز پر لانے کی سعی مشکور کی تھی یہ ان کے اس کاوش کا نتیجہ تھا جو انسان و ادب کی فطرت کے مطالعہ سے مدتوں کے بعد حاصل ہوتا ہے جب تک زبان و انسان کے رجحان کی نبض پر حساس انگلیاں نہیں ہوتیں تمام باتوں کو یکجا کر کے کسی فنکار کو اپنے فن کو کامیاب بنانے میں حسبِ دلخواہ کامیابی نہیں ہو سکتی ۔ اکبر کی فن کاری پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ایک بڑے مصور کی چابکدستی سے کام لیا ہے ۔ جس طرح مصوّر زیادہ سے زیادہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے تصویر کے پس منظر کے انتخاب میں فکر کرتا ہے اسی طرح اکبر نے بھی اپنی ظریفانہ شاعری کو دل و دماغ میں اتار دینے کی کوشش کی تھی انھوں نے ادب کی ان لطافتوں کو پس منظر بنایا جن کا ایک زمانہ گرویدہ تھا اور زندگی کے مختلف مسائل و رجحانات کی تصویر کو اپنے مخصوص انداز بیان کا رنگ دے کر دنیا کے سامنے پیش کر دیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر ایک کی نظر میں تصویر کھپ گئی ۔

میں نے جیسا ابھی عرض کیا کہ ایک مدت سے شاعری میں رعایت لفظی سے غیر معمولی دلچسپی لینے کا اردو شاعری کو چسکا ہو گیا تھا اور اکبر کے زمانہ میں یہ چیز عوام و خواص کو اپنا گرویدہ بنائے ہوئے تھی گو فرسودگی کے ساتھ تھی مگر لطف اندوزی میں غالباً اور باتوں سے اب بھی زیادہ اسی کی چاشنی کام آتی تھی ۔ اکبر خود بھی اس کے دلدادہ معلوم ہوتے ہیں ۔

چنانچہ انھوں نے اپنی ظریفانہ شاعری کو کامیاب بنانے میں رعایت لفظی کا بڑا سہارا لیا ہے ۔ اس کا ثبوت آپ کو اکثر مل جائے گا ۔ مثال کی ضرورت نہیں مگر چند اشعار اس قبیل کے احتیاطاً پیش کر دینا برا بھی نہ ہوگا ۔ اچھا ہے کہ دیکھتے ہی چلیے سے

بوڑھے ہوئے کتابت بوس و کنار ہے ۔ اپنے لئے الف ہی بس اب قدِ یار ہے

اپنی جبیں سے جبین کے مالک اگر ہو تم ۔ میں بھی ہوں شاہ روس کہ دل بیر ازار ہے

مجنوں کی پیاس کو بجھاتی ۔ لیلےٰ کچھ باؤلی نہیں ہے

پیری سے کمر خم ہے وہ فرماتے ہیں تن جا — قابو میں تمہیں ہاتھ تو کیا ہو سکے پنجا

کالج نے بٹھا دیا جو مانندِ شجر — کچھ پھول کھلے تھے اس نے پھلنے نہ دیا

کامیابی کا سودیشی پر ہر اک در بستہ ہے — چرخ طرارام نے کھولی مگر پر بستہ ہے

تکلف کے پکوان میں دن ڈھلا — ہماری تو پوری اسنزا ہو گئی

ہوئی جب آمدِ پیری ہوا میں سر کہ پیشانی — ترش روئی کی چٹنی جوڑتے داڑھی ہو جب کھچڑی

ایک دور اندیش فنکار کی طرح اکبر نے لوگوں کے ادبی ذوق کو پرکھ لیا تھا اور ایک خاص سلیقہ اور معتاد کے ساتھ اپنے فن کی آرائش میں صرف کرتے رہے ان کی صدیوں کی پسندیدگی کا جزو شامل کر کے نصیحت کی تلخی کو اشعار میں وہ دلکشی عطا کر دیتے تھے کہ ہر شخص نہایت خوشی سے شکر آلودگی کی طرح حلق سے اتار لیتا تھا۔

رعایت لفظی کے علاوہ اکبر کی فنکاری قافیہ پسندی سے بھی آراستہ ہوئی ہے ابتدائے آفرینش سے اردو کے شعراء کے یہاں 'قافیہ' کا خاص اہتمام تھا، اس کی رغبت و مقبولیت کا پتہ دورِ جدید سے پہلے کے ہر شاعر کے یہاں ملتا ہے۔ عموماً قافیہ ہی پر شعر کا دار و مدار ہوتا تھا۔ اسی کے محور پر تخیل و شعریت گھوما کرتی تھی۔ قافیہ اور ردیف کے باہمی امتزاج سے ذہن مختلف خیالات کی طرف منتقل ہوتا تھا اسی کے لحاظ سے تشبیہات و استعارات بھی لبقدرِ ذوق صرف کئے جاتے تھے۔

غرضکہ قافیہ پیمائی ہماری قدیم شاعری کا ایک خاص جزو بن گیا تھا بلکہ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اکثر قافیہ پیمائی ہی شاعری سمجھی جاتی تھی قافیہ پسندی اور اس کی اہمیت اکبر کے زمانے میں بھی کم نہ تھی۔ اکبر کے یہاں بھی قافیوں سے خیالات و اشعار کو زینت عطا کی گئی ہے اور کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قافیہ ہی کا سہارا لے کر اکبر نے اپنے خیالات کی ترتیب دی ہے۔ ایسے موقع پر عموماً ان کا بھرم کھل جاتا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ شعر کہنے کے لئے کہا گیا ہے۔ شاعر کے پاس کوئی خاص مواد نہ تھا۔ الفاظ سے فائدہ اٹھا کر طباعی کر دی گئی ہے لیکن چونکہ طرزِ تخیل میں ایک ندرت ہوتی ہے اس لئے قلعی زیادہ کھلنے نہیں پاتی۔ ملمع سازی نظر فریب ہو کر پردہ رکھ لیتی ہے۔ مثال کے لئے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کہا جو میں نے کہ ان کی ادا انوکھی ہے — کہا بتوں نے کہ اردو میاں کی چوکھی ہے

چند ذرے کیمیا سے رنگ کی پڑیا بنے — شیخ صاحب ہوش کھو بیٹھے اور گڑیا بنے

تیرے قدم سے رونقِ شہرِ پراگ ہے — یعنی ترے ہی دم سے بتوں کا سہاگ ہے

اے شیخ جب نکیل نہیں دستِ قوم میں — پھر کیا خوشی جو اونٹ ترے ریل ہو گئے

ہم بھی کلیل کرنے لگے گائے کی طرح　　اس ملک میں بھی حضرت گوکھیل ہو گئے

کچھ سین خوش آتے ہیں نہ بھلاتے ہیں بزجی　　میں زیل کا طالب ہوں نہ خواہانِ انرجی

سنتا نہیں لکچر میں پڑا رہتا ہوں دن رات　　لگتا ہے فقط لیڈروں میں وقت ڈزجی

اکبر کو قافیہ پیمائی کا چسکا اس حد تک تھا کہ ایک جگہ خود کہہ پڑے ہیں ؎

موج ہے دل میں مرے قافیہ پیمائی کی　　جا کے گنگا پہ کہا کرتا ہوں جے مائی کی

انگریزی کے ان الفاظ کو بھی وہ قافیہ بنا لیتے تھے جو بڑی حد تک اردو میں نامانوس تھے نتیجہ یہ ہوا تھا کہ کوئی خاص شعریت یا ظرافت بھی ان الفاظ میں نہیں پیدا ہوتی تھی مثلاً ایک جگہ کہتے ہیں ؎

واعظ کا جوار شاد ہے وہ ریزنیبل ہے　　رندوں کی یہ مستی بھی مگر سیزنیبل ہے

میں کیا کروں گا عزیز دیہ پارٹی لے کر　　مزہ تو جب ہے کہ آئے وہ پارٹی لے کر

مجھے اس سے اختلاف نہیں کہ اکبر نے انگریزی الفاظ استعمال ہی کیوں کئے۔ اردو اتنی وسیع النظر ہے کہ اس کو کبھی کسی زبان سے الفاظ لینے میں تکلف نہیں ہوا۔ مگر وہی الفاظ جو عام فہم ہو چکے ہوں اور اس کے ڈھانچے میں پوری طرح آجائیں یا جن کی معنویت اور ساخت اتنی زیادہ اور اتنی اچھی ہو کہ مفہوم و ترکیب کے لحاظ سے ان کا مترادف کوئی دوسرا الفاظ آسانی سے نہ بن سکے۔ اور وہ ہماری زبان کے مزاج کے موافق بھی ہوں، جیسے انگریزی کے الفاظ ناول، رومان، ریل، یونیورسٹی، تھرمامیٹر وغیرہ۔

حالی کی طرح غالباً اکبر کی بھی کوشش تھی کہ اور زبانوں کی طرح انگریزی سے بھی الفاظ لے کر اردو کے ذخیرہ کو بڑھایا جائے ان لوگوں کی یہ کاوش قابل قدر ہو سکتی تھی، بشرطیکہ اپنی زبان کی صلاحیت و انتخاب پسندی کا پورا خیال رکھتے مگر ان لوگوں نے اردو کے لسانی رجحان کو نظر انداز کر کے اجتہاد کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد ادب کی بارگاہ میں یہ فکر مردود ہو گئی اکبر کا اپنے فن کو ان الفاظ سے چمکانے کی سعی بھی نامشکور ہوئی، نہ ان کو کوئی فائدہ ہوا، نہ زبان کو،

کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اکبر قافیہ کے استعمال میں ہمیشہ بہک جاتے تھے، نہیں، جب کبھی ان کے یہاں آورد کے بجائے آمد ہوتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قافیہ اور ردیف اتنا اچھا اور برمحل شاید ہی کبھی کسی اردو شاعر نے اس فنکاری کے ساتھ کیا ہو، مثال کے طور پر ان کی مشہور نظم "جلوۂ دربار دہلی" اور ساودی کی نظم کا ترجمہ دیکھئے۔ ان نظموں میں قافیہ آرائی نے بیان و قوت بیان دونوں کو معراج کمال پر پہنچا دیا ہے، یہی قافیے مناظر کو آئینہ وار دل و دماغ کے سامنے پیش کرتے ہیں، منظر نگاری ان قافیوں کے درمیان ساری تفصیلات و خصوصیات کے ساتھ رواں دواں نظر آتی ہے۔

اکبر کی فنکاری کا جائزہ بالکل نامکمل رہ جائے گا اگر ان موضوعات کا ذکر نہ کیا جائے جو اکبر کی ظرافت کا مرکز تھے ـــ

---

(1) COKHALE (2) ZEAL (3) ENERGY (4) REASONABLE (5) SERSONABLE (6) TEA　لے

اسلوب نگارش اور لب و لہجہ کی پُرکاری بغیر مواد کی مطابقت کے کوئی خاص اہمیت نہیں حاصل کر سکتی ۔ فنی صلاحیت کا تقاضہ ہے کہ جو بات بیان کی جائے اسی کے لحاظ سے الفاظ و ترکیب بھی قائم کی جائے انداز بیان بھی موضوع سے ہم آہنگ ہو ورنہ ایک دوسرے سے الگ ہو کر یہ تکمیل و تاثیر پیدا کرنے کے بے اثری و نقص کا بھی شکار ہو سکتے ہیں، اس نظریہ کے تحت سوچنا ہے کہ اکبر نے بحیثیت فن کار کے کہاں تک کامیابی حاصل کی ہے ۔ اس سلسلہ میں میں ان کی صرف ظریفانہ شاعری پر نظر ڈالوں گا، جس وقت سے اکبر نے ظرافت کے میدان میں قدم رکھا شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو احساس تھا کہ ادب نام ہے حیات کی ترجمانی کا ۔ اور دائرۂ حیات میں سماج، سیاست، معاشرت سب ہی آتے ہیں، ان پر اظہار خیال شاعرانہ انداز میں نہ کرنا ادبی گناہ بھی ہے اور تنگ نظری بھی اور خود غرضی کا ثبوت بھی ۔

چنانچہ انھوں نے اپنے وقت کی ہر اس تحریک سے دلچسپی لی جو حیات عامہ سے متعلق تھی اور اپنے طور پر جو روش غلط سمجھے اس سے لوگوں کو متنبہ کرنے کے لئے اپنی شاعری کو آلۂ کار بنایا ۔ اس سے پہلے بھی اردو شعراء اس ضمن میں اپنی سعی کوشش کر چکے تھے لیکن ان کی چیخ پکار کا وہ اثر نہ ہو سکا تھا جو ہونا چاہئے تھا ۔ اکبر کو ایک نیا راستہ نکالنا تھا تاکہ عام و خاص دونوں اثر لیں اور بیکاری سے بیداری کا رُخ کریں ۔ ان کی سوجھ بوجھ اور ذہانت نے ایک نیا راستہ نکال ہی لیا ۔

غزل، قصیدہ، مستزاد، رُباعی سب ہی پر وہ اگلے زمانہ میں طبع آزمائی کر چکے تھے ۔ اس کے لئے یہ سب کے سب ڈھانچے مناسب نہ تھے بعض ان میں سے کارآمد ہو سکتے تھے، انھوں نے زیادہ تر قطعات و رباعی کو اپنی مہم کا وسیلہ منتخب کیا ۔ ویسے کبھی کبھی غزل کی بھی ٹکنیک کام میں لاتے رہے ۔ فرد پر طبع آزمائی کرتے تھے ۔ لیکن عام طور سے قطعات و فردیات ہی پر اکتفا تھی، غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عام مسائل کو طوالت کے ساتھ بیان کرنا نہیں چاہتے تھے، کیونکہ انکا پیرایۂ بیان اس کا متقاضی تھا کہ بات چٹکلے میں ادا کر دی جائے ۔ تسلسل کے ساتھ دیر تک کسی بات کو بیان کرنے میں ذہن پر بھی بار پڑتا ہے اور ہنسی ضبط کرنے میں ایک ایک بات کا اثر بھی کم ہو جاتا ہے ۔ ہنسنے والے چاہتے ہیں کہ جملہ ختم ہوتے ہی وہ ہنس لیں اور ہنسانیوالا بھی چاہتا ہے کہ وہ جلد از جلد بات کی داد پائے ۔ نہ ہنسنے والا دیر تک ہنسی ضبط کرنا چاہتا ہے اور نہ شاعر دیر تک ضبط تبسم کا متحمل ہو سکتا ہے ۔ پھر اس زمانے میں لوگوں کا سیاسی شعور اتنا بیدار نہ ہوا تھا کہ مسائل کی تہ کو پہنچنا ضروری سمجھتے علاوہ اس کے اکبر کے سامنے زیادہ تر ایسے مسائل تھے جن کو زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، مثلاً پردے کی موافقت، انگریزی لباس سے منافرت، نماز نہ پڑھنے والوں کی مذمت وغیرہ، ان باتوں کی مخالفت یا موافقت میں زیادہ کہنے سننے کی گنجائش نہ تھی اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ اکبر کسی فلسفیانہ صلاحیت کے مالک بھی نہ تھے کہ باتوں کو تبحر علمی کے ساتھ شاعری میں پیش کرتے ۔ چنانچہ ان کے یہاں تخیل کی بلندی بہت کم ملتی ہے ۔ ان دقتوں اور ضرورتوں کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اکبر نہایت دور اندیش فن کار تھا جس نے اپنی صلاحیت کا صحیح اندازہ کر کے زمانہ کی دلچسپی اور ضرورت کو ظریفانہ انداز میں پیش کر کے خراج تحسین وصول کر لیا ۔

اکبر چونکہ ایسے مسائل کو اپنی شاعری میں پیش کر رہے تھے کہ جن کا تعلق عوام و خواص دونوں سے تھا بلکہ عوام سے زیادہ تھا خواص سے کم ۔ اس لئے انھوں نے انداز بیان اور لفظوں کا انتخاب بھی ایسا رکھا جو دونوں طبقوں کو متوجہ کر سکے ۔ اگر ذرا غور سے ان کے اسلوب بیان پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عالمانہ انداز بیان اور عامیانہ انداز بیان کے درمیان سے اپنا راستہ نکالا تھا ۔ بین بین چلنے کی کوشش تھی، مگر راستہ کسی قدر دشوار گذار بھی تھا، اس لئے کہیں کہیں پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں، عموماً

اپنے خیالات کو وہ ایسے الفاظ میں پیش کرتے ہیں جو عام فہم و متین ہوتے ہیں۔ صرف ترتیب و لب و لہجہ سے مذاق و مزاح پیدا ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر وہ صنائع پر بھروسہ کرتے ہیں۔ کبھی ضرب الامثال قلمبند کر کے اپنے طور پر مذاق پیدا کر لیتے ہیں، کبھی محاورات سے طنز و تمسخر پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن کبھی کبھی ایسی ہی کوششوں میں عامیانہ پن بھی آ جاتا ہے۔ مثال کے لئے چند مقامات ملاحظہ ہوں ؎

پیٹ جلتا ہے آنکھ آئی ہے   شاہ اڈورڈ کی دُھائی ہے

دنیا ہی اب درست ہے قائم نہ دین ہے   زر کی طلب میں شیخ بھی کوڑی کا تین ہے

سینے پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے   پوائنٹ یہ سخت ہے اِسے پرچ نہ کرو

بوقتِ ختنہ میں رویا تو نائی نے کہا ہنس کر   مسلمانی میں طاقت خون ہی بہنے سے آتی ہے

بولے چپراسی جو پہنچا میں بامید سلام   پھانکئے خاک آپ بھی صاحب ہوا کھانے لگے

اکبر کی فنکاری کا یہ ہلکا سا عیب بھی نہ محسوس ہوتا اگر وہ کبھی کبھی اپنی پُر گوئی کو ناقدانہ انداز سے دیکھ بھی لیتے، مگر زیادہ شعر کہنے کی خواہش نے غالباً کاٹ چھانٹ پر مائل نہ کیا۔ اکثر شعرا کے یہاں ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب وہ اپنے سن و سال یا مرتبہ کی وجہ سے اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ دیں گے حدیث اور آیت کی طرح اٹل ہو جائے گا۔ میر نے تو پکار کر کہہ دیا تھا کہ ؎

"مستند ہے میرا فرمایا ہوا"

اسی خام خیالی نے اکبر کے فن کو بھی نقصان پہنچایا۔ ایک جگہ خود بھی فرماتے ہیں ؎

بس اتنی بات ہے سامع میں ہو مذاقِ سخن   مجال کیا ہے مرے شعر پر اچھل نہ پڑے

کافی ایسے اشعار ہیں کہ جن میں مزاح یا شعریت نہیں پیدا ہو سکی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعر کہنے کے لئے کہے گئے ہیں۔

اکبر اپنے فن کو انفرادیت تو حسبِ خواہش عطا کر سکے مگر ابدیت نہ حاصل ہو سکی جس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ان کی تخیل میں گہرائی بہت کم ہے، ایسے مسائل پر نظر نہ گئی جو ہر زمانے کے لئے یکساں نہیں تو کم و بیش دلچسپ و اہم ہوتے، اس کمی کی بڑی وجہ مواد کے دیرپا نہ ہونے کا سبب ہے۔ عموماً ان کی شاعری کے مواد کے لئے روزمرہ کے مسائل اور کچھ خاص خاص اشخاص ہیں جن کی خصوصیات وقتی طور پر فضا میں رہتی ہیں اور پھر زمانہ کی بدلتی ہوئی قدروں کے ساتھ ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن اگر ان ہی مسائل و اشخاص کو اور زیادہ اچھی لطافت کے ساتھ پیش کرتے تو غالباً فن اور اکبر دونوں ہمیشہ کی زندگی پا جاتے۔

نہ معلوم اکبر کی نظر اس طرف کیوں نہ گئی۔ حالانکہ نمونہ کی ضرورت بھی نہ تھی۔ خود اُن کے یہاں بعض نظمیں فنی لطافت پا کر ابدیت سے ہمکنار ہو گئی ہیں۔ مثلاً جلوۂ دربار دہلی اور رسادی کی نظم کا ترجمہ، یا فرضی لطیفہ، مگر ان کی مثالیں بہت کم ہیں۔ کاش اکبر نے دربار دہلی، اور فرضی لطیفہ کی طرح اور چیزیں بھی اُردو ادب کو دی ہوتیں۔

اکبر الٰہ آبادی بحیثیت غزل گو

(پروفیسر سید وقار عظیم)

اکبر کو لوگ عام طور سے غزل گو نہیں بلکہ ظریف شاعر کی حیثیت سے جانتے اور پہچانتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ گو تذکرہ نویسوں اور نقادوں نے ان کی غزل پر تفصیل و توضیح سے اظہار خیال کیا اور دوسرے نامور ہم عصروں کی محفل میں انھیں بھی اس مقام پر جگہ دی ہے جو ان کے رتبے اور بزرگی کے شایان شان ہے لیکن لوگوں نے اب بھی اکبر اور غزل کے رشتے کو اجنبیت، غیریت اور بیگانگی کی نظر سے دیکھنے کی عادت نہیں چھوڑی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ غزل کے ساتھ اکبر کا تعلق بڑی قریبی یگانگت کا ہے اور یگانگت کے اس رشتے میں قدامت پسندی کے سارے رسوم اور روایت پرستی کے سارے قیود اس طرح موجود ہیں کہ اکبر کے ہم عصروں میں سے کسی اور کے یہاں نہیں ملتے، اکبر کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی جس کا تہذیبی مزاج غزل اور غزل کی پیدا کی ہوئی روایت کے رنگ میں ڈوبا اور رچا ہوا تھا۔ گھر میں فارسی اور اردو کے اساتذہ کے دیوانوں کے مطالعہ کے علاوہ ایسی مجلسی زندگی سے سابقہ جس کا ہر گوشہ شعر و شاعری کے نغموں کی جھنکار سے گونج رہا ہو۔ گھر سے باہر شب و روز مشاعروں (اور خصوصاً طرحی مشاعروں) کی محفلیں اور ان محفلوں میں اساتذہ کی ہنرمندیوں کے معرکے، استادی شاگردی کے تعلق کے جملہ آداب کی پوری پابندی، زمانے کے مذاق کے مطابق مشق سخن اور تربیت و اصلاح کا اہتمام و احترام۔ مختصر یہ کہ غزل ہمارے معاشرے میں جن تہذیبی اور فنی رسوم و قیود کی پابندی کے ساتھ کہی جاتی ہے اور جس کی بنا پر ایک طرف غزل اور غزل گو کے درمیان اور دوسری طرف غزل گو اور اس کے تہذیبی ماحول کے درمیان رچی ہوئی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ سب اس وقت اکبر کے گرد و پیش موجود تھے جب انھوں نے غزل کہنی شروع کی اور اس کا نتیجہ ہے کہ ان کی غزل موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے روایت کی قدامت کا وہ نمونہ پیش کرتی ہے جس کا نام و نشان مومن اور غالب اور پھر حالی اور داغ کی غزلوں تک پہنچتے پہنچتے مٹ چکا ہے، اکبر کی غزل نے سارے بھولے ہوئے مضامین اور ان مضامین کے ادا کرنے کے اسالیب کو ایک بار پھر زندہ کیا اور غزل کی محفل ایک بار پھر قدامت اور قدامت کی آغوش میں پرورش پانے والی روایت کے چراغوں سے جگمگا اٹھی، اس غزل میں (خصوصیت سے اکبر کی شاعری کے ابتدائی دو دوروں کی غزل میں) حسن و عشق، حکمت و اخلاق، تصوف و معرفت کی دنیا سے تعلق رکھنے والے ہر قابل تصور مضمون کو، ان تمام شاعرانہ تشبیہوں، استعاروں، تلمیحوں، اشاروں اور علامتوں کے ذریعے اور ان تمام روایتی لفظوں اور ترکیبوں کی مدد سے شعر کے سانچے میں ڈھالا گیا۔ جو تین صدی سے غزل کے دامن سے بندھے چلے آرہے تھے۔ مثال کے طور پر چند شعر ملاحظہ ہوں :۔

وہ تو موسیٰ ہوا جو طالب دیدار ہوا　　پھر وہ کیا ہوگا کہ جس نے تمھیں دیکھا ہوگا

قیس کا ذکر مری شانِ جنوں کے آگے　　ننگے وقتوں کا کوئی بادیہ پیما ہوگا

وہ شناورِ ہوں جو ہر موج کو ساحل سمجھا　　　وہ مسافر ہوں جو ہر گام کو منزل سمجھا

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمرِ دراز　　　سینہ اک گنجینۂ داغِ عزیزاں ہو گیا

ہمسر اُس طرۂ مشکیں کی نہیں کوئی بلا　　　کوئی فتنہ نہیں اس نرگسِ جادو کی طرح

دلِ مایوس میں وہ شورشیں برپا نہیں ہوتیں　　　امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں

بڑھا کر آرزو اتنا گھٹایا عشق نے مجھ کو　　　کہ کانٹا رہ گیا میں اپنے گلزارِ تمنا کا

امانت عشق کی بعد اپنے کیا جانے ملے کس کو　　　نہیں معلوم جائے کس کے سر یہ دردِ سر اپنا
کہیں دیکھا نہ ہستی و عدم کا اشتراک ایسا　　　جہاں میں مثل رکھتی ہی نہیں اُنکی کمر اپنا
حباب آسا اُٹھایا بحرِ ہستی میں جو سر اپنا　　　بنا یا بس وہیں موجِ فنا نے ہمسفر اپنا
نزاکت کے اثر سے شعر میں بھی بندھ نہیں سکتا　　　بچا جاتا ہے پہلو مجھ سے مضمونِ کمر اپنا

تصور ان کے عارض کا زبس رنگین و نازک تھا　　　پری بن کر ہمارے شیشۂ دل میں اتر آیا
گیا تھا ہو کے رخصت صورتِ تسکین دل مجھ سے　　　برنگِ ہوش واں سے پھر کے اپنا نامہ بر آیا

تجربے کے بعد نسخے سے کٹا آخر گلاب　　　نکلنے میں تیرے عارض کا پسینہ ہی پڑا

نزع میں آئی تجلی روئے جاناں کی نظر　　　زہر سمجھے تھے جسے وہ شربتِ دیدار تھا

فطرت میں سلسلہ ہے کمالِ و زوال کا　　　گھٹتا ہے بدر کا تو ہے بڑھنا ہلال کا

الفتِ گیسو نے آخر دی مرے دل کو شکست　　　ہائے کیا انمول شیشہ تھا مگر بال آگیا

زلف نے پرتوِ دیں نام کو رہنے نہ دیا　　　آخراس لام نے اسلام کو رہنے نہ دیا

ان کی صورت دیکھ کر آنے لگی یادِ خدا　　　نورِ رُخ اُن کا چراغِ راہِ عرفاں ہو گیا

اس توقع پر کہ تیرے پیرہن میں صرف ہو ماہِ نو بھی چرخ پر شکلِ گریباں ہو گیا

یہ سب شعر کسی نہ کسی لحاظ سے غزل کی اُس قدیم روش کے مظہر اور ترجمان ہیں جسے اکبر کے عہد میں بھی فرسودہ سمجھا جانے لگا تھا، لیکن اکبر اس طرح کی غزلیں جس انہماک اور اہتمام اور ذوق و شوق سے کہتے ہیں، اس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ وہ بحیثیت غزل گو کے غزل کی قدیم روایت کی پابندی و پیروی کو اپنا فنی منصب جانتے ہیں اور اس روایت کو، اس کے جملہ متعلقات کے ساتھ، خواہ وہ زمانے کی نظر میں کتنے ہی مذموم و مردود ہوں، قبول کرتے، اسے محبوب جانتے اور اسے زندہ رکھ کر خوش ہوتے ہیں، معاشرت اور تہذیب اور اس کے ساتھ ساتھ اس معاشرت اور تہذیب کے اخلاق اور دینی عقائد سے اکبر کو جو قلبی تعلق ہے وہ انھیں غزل کی اس فرسودہ روایت کا پرستار بناتا ہے اور بحیثیت غزل گو کے اکبر کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے غزل گوئی کے ایک ایسے دور میں جب غزل کی فنی روایت کے خلاف آوازیں اٹھنی شروع ہو گئی تھیں اور جب غزل کے مزاج میں انقلابی تبدیلیاں پیدا ہونی شروع ہو گئی تھیں غزل کی قدامت کو اس کے سارے ظاہری اور باطنی عیبوں کے ساتھ زندہ رکھا، لیکن حقیقت میں اکبر کی عظمت کے دو پہلو اور بھی ہیں، ایک یہ کہ اس قدیم روایت سے پیمانہ ہو کر اور اس قدیم روایت کے عیبوں کو بھی نظر کو کم بھی انھوں نے ایسے شعر کہے ہیں جو اپنے شاعرانہ اور حسن و نزاکت کی بنا پر اچھے سے اچھے غزل گو شاعر کے لئے سرمایۂ افتخار بن سکتے ہیں اور دوسرے یہ کہ انھوں نے غزل میں نئے مضامین اور نئے اسالیب کا اضافہ کر کے اس کی روش میں ایک ایسا انقلاب پیدا کیا کہ اس کا مزاج ہی بدل گیا اور غزل کے اس نئے رنگ نے غزل کے فنی امکانات میں وہ وسعت، فراخی اور کشادگی پیدا کر دی جس کا تصور غالب کی غزل کے بعد پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ اکبر کے اس نئے رنگ کو دیکھ کر غزل کے شیدائیوں کے لئے یہ حکم لگانا آسان ہو گیا کہ غزل کے مضامین اور اس کے اظہار کے اسالیب کی کوئی حد نہیں اور روایت کی بے شمار قیدوں میں جکڑی ہوئی ہونے کے باوجود یہ صنف آزاد ہے۔ اس میں ہر بات کہی جا سکتی ہے اور نہ جانے کس کس طرح کہی جا سکتی ہے، بشرطیکہ بات کہنے والا (یعنی غزل گو) غزل کا صحیح مزاج داں ہو۔ اکبر کی قدامت پرستی نے انھیں غزل کا صحیح مزاج داں بنایا اور ان کی انقلاب پسندی نے اس قدیم صنف کے مزاج کے ایسے ایسے رخوں سے پردہ اٹھایا جو اب تک نظروں سے پوشیدہ تھے — یہ رُخ خیال کے بھی ہیں اور بیان کے بھی۔ پہلے چند شعر ایسے ملاحظہ فرمائیے جن کا تعلق اکبر کی عظمت کے اس پہلو سے ہے جس کی بدولت غزل میں خیال اور بیان کے حسن، نزاکت اور لطافت کے بے شمار نقش نمایاں ہوئے۔ یہ شعر اکبر کے رنگِ تغزل کے چند نمونے ہیں:-

ہوش بھی بار ہے طبیعت پر کیا کہوں حال ناتوانی کا

روشنِ دلِ عارف سے فزوں ہے بدن ان کا رنگیں ہے طبیعت کی طرح پیرہن ان کا
محرومِ ہی رہ جاتی ہے آغوشِ تمنّا شرم آ کے چرا لیتی ہے سارا بدن ان کا

اب کہاں اگلے سے وہ راز و نیاز مِل گئے، صاحب سلامت ہو گئی

خود سمجھتا ہوں کہ رونے سے بھلا کیا حاصل پر کروں کیا یونہیں تسکین ذرا ہوتی ہے

خدا پناہ میں رکھے کشاکشِ غم سے　　اسی سے تارِ نفس جلد ٹوٹ جاتا ہے

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول　　یہ بات منحصر ہے تمھاری نگاہ پر

شیخ جی آپ کو اللہ سلامت رکھے　　آپ کا دم بھی غنیمت ہے مسلمانوں میں

منہ ہم کو لگاتا ہی نہیں وہ بتِ کافر　　کہتا ہے یہ اللہ سے انکار تو کرلیں
سو جان سے ہو جاؤں گا راضی میں سزا پر　　پہلے وہ مجھے اپنا گنہ گار تو کرلیں

ہے ظاہری جو نکلے منہ سے لفظِ آرزو　　آنکھوں سے نکلے محبت کی نظر تو کیا کروں

اکبر ہنوز ان سے ہے امیدوارِ لطف　　بدلی ہوئی نگاہ کو پہچانتا نہیں

میں نے دیکھی ہیں غزالوں کی بہت چالاکیاں　　ہائے ان آنکھوں کی سی ان میں کہاں بیباکیاں

جستجو ہی میں وہ لذت ہے کہ اللہ اللہ　　کیوں میں پوچھوں وہ دلآرام ملے گا کہ نہیں

یارب ایسا کوئی بت خانہ عطا کر جس میں　　ایسی گزرے کہ تصور بھی گنہ گار نہ ہو

جنابِ شیخ پھر آخر بسر کروں کیوں کر　　جدھر اٹھاتا ہوں آنکھیں ادھر معاذ اللہ

جلوۂ گل نے چمن میں مجھے بے چین کیا　　مل ہی جاتے ہیں تری یاد دلانے والے

نگاہِ نازِ بتاں پر نثار دل کو کیا　　زمانہ دیکھ کے دشمن سے دوستی کرلی

زلف میں دل کی گرفتاری بری　　سب مرض اچھے یہ بیماری بری
ہوش سے عاشق کو بچنا چاہیے　　راہِ دل میں یہ گراں باری بری

بس اک گناہ کو منظور کیجئے تو مجھے　　تمام اور گناہوں سے اجتناب رہے

پاسِ خاطر تھا اگر تو رنج کیوں ہم کو دیئے　　اب عبث ہے اس کی پرسش، دل بھر آیا، رو دیئے

چمکا ترا جمال جو محفل میں وقتِ شام　　پروانہ بے قرار ہوا شمع جل گئی

سراپا اک نگاہِ سرگیں ہے وہ پری پیکر　　کجا آنکھیں اٹھانا آپ وہ مشکل سے اٹھتا ہے

تغزل کے ان شعروں میں ولیؔ سے داغؔ (امیرؔ اور اسیرؔ) کے عہد تک کے مختلف شاعروں کا رنگ بھی ہے اور اس رنگ میں اکبر کے تجربے اور احساس کا رنگ بھی شامل ہے اور یوں تغزل کی قدیم روایت میں جابجا ایک انفرادی شان بھی پیدا ہوئی ہے لیکن اس انفرادی شان کا مظہر حقیقت میں ان کی غزل کا وہ پہلو ہے جس میں اکبرؔ نے اپنے عہد کے سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی مزاج کو غزل کے سانچے میں ڈھالا ہے اور غزل کے پرانے خیالات کو نئے ماحول کے پس منظر میں پیش کرنے کے علاوہ اس میں ایسے خیالات کو جگہ دی ہے جو بظاہر غزل کے خیالات نہیں معلوم ہوتے، لیکن اکبرؔ نے ایک طرف غزل کے مزاج کی بنیادی خصوصیتوں کو اپنے سامنے رکھ کر اور دوسری طرف نئے خیالات یا نئی طرح کے خیالات کے لئے اظہار کا ایک نیا اسلوب اختیار کر کے اس "بدعت" کو فن کا نازک مقام دلایا ہے اور یوں اکبرؔ کی غزل مضامین کی وسعت اور تنوع کے اعتبار سے اور اس کے ساتھ بیان کی جدت اور معنویت کے نقطۂ نظر سے ایک نئی غزل کی پیش روبنی۔ اکبرؔ کے اس نئے رنگِ غزل کی ایک خصوصیت تو اس کے تجربے کی سچائی ہے اور دوسرے احساس کا خلوص۔ اکبرؔ نے اپنی اس نئی غزل کا پورا موضوع اپنے معاشرے سے لیا اور اسے ماضی کی روایت میں سمو کر اس طرح غزل کے سانچے میں ڈھالا کر موضوع اپنے نئے پن کے باوجود اور بظاہر غزل کا موضوع نہ معلوم ہونے کے باوجود بے گانہ اور غیر نہیں معلوم ہوتا۔ اکبرؔ کی غزل کے ایسے اشعار کو (جن کی تعداد ان اشعار کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ جن کا ذکر اب تک ہو رہا ہے) مضامین اور مضامین کے بیان و اظہار کے گوناگوں اسالیب کے اعتبار سے تقسیم کرنے کے بجائے کچھ ایسے اشعار پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں جو اکبرؔ کے فن کی اس نمایاں اور انفرادی خصوصیت کے مظہر ہیں جس کا ذکر میں اس وقت کر رہا ہوں:

بتوں کے پہلے بندے تھے مسوں کے اب ہوئے خادم　　ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے باخدا ہونا

پردہ توڑا آپ نے اس بت کو آیا کر دیا　　خود پری تھی اب اسے پریوں کا سایا کر دیا

ہر رنگ میں ہیں پاتے بندے خدا کی روزی　　ہے پینٹر تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا
منزل وہی ہے جس کو نبیوں نے ہے بتایا　　اسٹیم ہے تو پھر کیا جمیز ہے تو پھر کیا

مے خانۂ رفارم کی چکنی زمین پر　　واعظ کا خاندان بھی آخر پھسل گیا

تذکرۂ صاحب نسب نارے وہ وقت آیا ہے　　بے اثر ہوگی شرافت مال دیکھا جائے گا۔

اس کو چکر ہی رہا اور یہ خدا تک پہونچا دلِ پُرسوز جو ہاتھ آئے تو انجن کیسا

مری تقریر کا اس مس پہ کچھ قابو نہیں چلتا جہاں بندوق چلتی ہے وہاں جادو نہیں چلتا

قتل سے پہلے ہے کلورافارم شکر ہے ان کی مہربانی کا

ہر تعلق مرا سرمایہ ہے اک ناول کا میری ہر رات سے ہے ایک کہانی پیدا

وہی پریاں ہیں اب بھی راجہ اندر کے اکھاڑے میں مگر شہزادۂ گلفام پر شیدا نہیں ہوتیں

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں

اتنی آزادی بھی غنیمت ہے سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں

شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں میں تو انگریزوں ہی سے ڈرتا ہوں

ہیں کلکٹر نزع میں عملے کھڑے ہیں دم بخود جب خدا ہی ہو گیا حاضر تو ناظر کیا کریں

فتنہ ان آنکھوں سے اٹھا تو مچی واہ کی دھوم سچ یہ ہے صاحبِ اقبال کی ہر بات اچھی

کیا ذوقِ عبادت ہو ان کو جو مس کے لبوں کے شیدا ہیں حلوائے بہشتی ایک طرف ہوٹل کی مٹھائی ایک طرف

علمِ دیں مفقود ہے گم ہے صراطِ مستقیم خضرِ رہ بنتا ہے ہر غولِ بیاباں ان دنوں
اپنے اشتر کو یہ کیا لے جائے گا سوئے حجاز مست خود ہے بینڈ کی گت پر حُدی خواں ان دنوں

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہِ سید سے قفس میں ہیں تو اس اڈے کو چھوڑ جائیں کہاں

فریادی کے کاش طریقے ہوں منضبط یک لخت ظلم کی بھی تو وہ ٹھانتا نہیں

خط میں کیا لکھا ہے قاصد کو خبر کیا اس کی — پوچھتا ہے تجھے انعام ملے گا کہ نہیں

حرم والوں سے کیا نسبت بھلا ہم اہلِ ہوٹل کو — وہاں قرآن اترتا ہے یہاں انگریز اترتے ہیں

برباد و منتشر بھی ہو گے اسی ہوا سے — کس زعم میں اٹھے ہو تن کر تم اے بگولو!

کھل گیا مصحفِ رخسارِ بتانِ مغرب — ہو گئے شیخ بھی حاضر نئی تفسیر کے ساتھ

اس تماشا گہِ ہستی میں مجھے حیرت ہے — اک نیا فلسفہ ہو جاتا ہے ہر سین کے ساتھ

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا — انس اس وجہ سے کم رکھتے ہیں یاسین کیساتھ

حُسنِ مس پر کر نظر مذہب اگر جاتا ہے جائے — قدرداں کو نرخ کی کیا بحث اکبر مال دیکھ

مزاج شریف ان میں باقی نہیں ہے — تو کیا منھ سے الحمد للہ نکلے

مریدِ دہر ہوئے وضع مغربی کر لی — نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی،
جو حسنِ بت کی جگہ حکمِ مس ہوا قائم — تو عشق چھوڑ کے ہم نے بھی نوکری کر لی

اکبر مریض ہے تو دعا بھی اسے سکھاؤ — ایسا نہ ہو کہ صرف دوا ہی کا ہو رہے

میں تو انجن کی گلا بازی کا قائل ہو گیا — رہ گئے نغمے حُدی خوانوں کے ایسی تان لی

خوشی کیا ہو جو میری بات وہ بت مان جاتا ہے — مزا تو بے حد آتا ہے مگر ایمان جاتا ہے

بنوں کونسل میں اسپیکر تو رخصت قرأتِ مصری — کروں کیا ممبری جاتی ہے یا قرآن جاتا ہے

عقبےٰ کی باز پرس کا جاتا رہا خیال — دنیا کی لذتوں میں طبیعت بہل گئی

ان اشعار میں اکثر ایسے ہیں جن میں اکبر نے ایسے خیالات کو موضوع بنایا ہے جو ایک خاص عہد کی سیاسی و معاشرتی زندگی کے پیدا کئے ہوئے ہیں، ان خیالات کے اظہار کے لئے ایک طرف تو اکبر نے ایسے الفاظ کو علامت، اشارے اور اصطلاح کی صورت دی ہے جو بدلے ہوئے زمانے کے مزاج کی عکاسی و ترجمانی کرتے ہیں اور دوسری طرف ان الفاظ کے لئے ایک ایسی فضا تیار کی ہے کہ ان کے لغوی مفہوم میں تخیلی وسعت پیدا ہو جائے اور وہ اپنے لغوی مفہوم سے بہت آگے بڑھ کر ایک ایسی حقیقت کے مظہر بن جائیں جسے شاعر کے مشاہدے اور احساس نے شعر کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اکبر نے ان سیدھے سادے الفاظ کے ساتھ ایسے تصورات وابستہ کر دیئے ہیں کہ جب وہ شعر میں آتے ہیں تو بعض واضح خیالی پیکر اپنے ساتھ لاتے ہیں، ان اشعار میں سے بعض بظاہر ایسے بھی ہیں جن میں شاعر نے وہی بات کہی ہے جو اس سے پہلے بھی غزل کے شعروں میں کہی جاتی رہی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ بظاہر پرانی بات ماحول اور زمانے کے فرق اور بیان کے اسلوب اور انداز کے فرق سے بالکل نئی بن گئی ہے اور اس میں زندگی کے بدلے ہوئے طریقوں پر ایسی تیکھی طنز ہے جو کسی صاحب بصیرت ہی کو زیب دیتی ہے۔ اکبر نے اپنی غزل کے ذریعے (اصلاحی خدمت کے علاوہ) بیک وقت کئی خدمتیں انجام دی ہیں۔ انھوں نے بہت سے نئے الفاظ کو غزل کی زبان کا جزو بنا کر اسلوب اظہار میں وسعت پیدا کی۔ انھوں نے پرانے الفاظ اور اصطلاحوں کے مفہوم میں معنی کی نئی وسعتیں اور گہرائیاں پیدا کیں۔ انھوں نے غزل میں ایسے مضامین داخل کئے جنھیں اب تک غزل کے دائرے سے خارج سمجھا جاتا تھا اور سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے غزل کو بھی معاشرتی اصلاح کا ایک موثر ذریعہ بنا کر اس کے لئے ایک نئے رجحان کے دروازے کھولے اور غزل میں پہلی مرتبہ نظم کی شان پیدا ہوئی ——— اور لطف یہ کہ یہ سب کچھ اس طرح کیا کہ غزل کے نام کے ساتھ حسن و لطافت کا جو تصور وابستہ ہے اس میں کہیں کمی نہیں آئی، غزل کو اکبر نے ایک نئے مزاج سے آشنا کیا، لیکن اس طرح کہ غزل کی نزاکتِ طبع میں فرق نہ آیا۔ وہ ہماری سیاسی اور معاشرتی زندگی کے ایک بے حد اہم عہد کے تقاضوں کی مکمل ترجمان ہوتے ہوئے بھی غزل ہے۔

اکبر کی ظرافت اور اُس کی اہمیت

(پروفیسر آلِ احمد سرور)

میریڈتھ کا قول ہے کہ "کسی ملک کے متمدن ہونے کی سب سے عمدہ کسوٹی یہ ہے کہ آیا وہاں ظرافت کا تصور اور کامیڈی (طربیہ) پھلتے پھولتے ہیں یا نہیں اور سچے طربیہ کی پرکھ یہ ہے کہ وہ ہنسائے مگر ہنسی کے ساتھ فکر کو بھی بیدار کرے، اردو ادب کا سرمایہ اس سنجیدہ ظرافت کے لحاظ سے ہر طرح قابل قدر ہے، سودا کے ہجویات، نظیر کے چٹکلوں۔ غالب کی ذہنی پھلجھڑیوں اور فرحت اللہ بیگ، رشید احمد صدیقی، پطرس کے مضامین میں ہمیں اعلیٰ ظرافت کی جھلکیاں برابر ملتی ہیں۔ مگر اکبر کی ظرافت کا مطالعہ اس لحاظ سے سب سے زیادہ اہم ہے۔ اکبر کی شاعری کی عمر تقریباً ۵۵ سال ہے جس میں تقریباً پینتالیس سال مزاحیہ رنگ کے مظہر ہیں۔ اس مزاحیہ رنگ میں ایک سنجیدہ تہذیبی مقصد ہے جو اسے محض ہنسنے ہنسانے سے ممتاز کرتا ہے۔ اقبال کے الفاظ میں خندۂ تیغ اصل "گریۂ ابر بہار" بھی رکھتا ہے۔

اکبر کے تغزل تصوف اور مشرقیت کا علیحدہ علیحدہ مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان تین چیزوں کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو ان کی ظرافت کی بنیاد اور اس کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔ اکبر الہ آباد کے ایک قصبہ کے شرفا سے تعلق رکھتے تھے۔ انھوں نے مسل خوانی سے ججی تک ترقی اپنی ذاتی محنت اور کوشش سے کی۔ ان کی جوانی خاصی رنگین گزری، اور ان کے استاد وحید کی زندگی کا ان پر کافی اثر ہوا۔ اُن کی شاعری میں جس نئی تہذیب پر طنز ملتی ہے۔ اس کو اپنی زندگی میں بڑی حد تک انھوں نے اپنایا، یہاں تک کہ اپنے لڑکے عشرت حسین کو اعلیٰ تعلیم کے لئے یورپ بھیجا۔ ان کے یہاں ایک شدید جذباتیت شروع سے ہے اور گہری فکر، جو ساری زندگی کو اپنے حلقہ میں لے سکتی ہے اور وحدت نظر پیدا کرتی ہے، بہت کم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کو کوچہ و بام سے اور ملازمت کے فرائض سے اتنی فرصت نہ ملی کہ اس انقلاب پر غور کرتے جس کو غدر نے نمایاں کر دیا تھا۔ متوسط طبقہ جس طرح جاگیردارانہ تمدن کے لئے آب و رنگ مہیا کرتا تھا۔ اسی طرح اب مغربی سامراج کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ مگر ہندوستان کے مسلمانوں میں اس تبدیلی سے ایک غم و غصہ تھا وہ اپنی پچھلی شان و شوکت کو بھولے نہ تھے اکبر نے اس سامراج کی مشین بننے میں پس و پیش نہ کیا۔ مگر اُن کے ذہن کا ایک حصہ دوسرے حصے سے باغی رہا۔ وہ دونوں میں کوئی ربط پیدا نہ کر سکے اور یہ کہہ کر رہ گئے ؎

جج بنا کر اچھے اچھوں کے لبھا لیتے ہیں دل

ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

شروع کی غزلوں میں ان پر لکھنؤ کے مرصع فن کا کافی اثر ہے مگر اس کے باوجود چونکہ ان میں سچے رنگین اور شوخ جذبات بھی

ہیں اس لئے ان میں تاثیر اور کیفیت پائی جاتی ہے ۔ مگر انفرادیت کم ہے اودھ پنچ کے نکلتے ہی انھیں اپنی زندگی کے مقصد اور اپنی شاعری کی منزل کا احساس ہو جاتا ہے ۔ اودھ پنچ ظرافت اور قدامت دونوں کا علم بردار تھا ۔ اس کی طنز زیادہ تر وقتی اور اس کا فن بیشتر الفاظ کی طلسم بندی ہے ۔ مگر اکبر کی گہری مشرقیت اس سے زیادہ دقیع تھی ۔ انھیں آنے والے نئے طوفان کا احساس تھا اور اس کی اہمیت کو سمجھتے تھے ۔ اکبر نے سرسید کی تحریک کو ایک خطرہ سمجھا اور اس کا اپنے طنز کے تیروں سے مقابلہ کیا ۔ سرسید کے زمانے میں حاجی امداد اللہ ۔ علی بخش شرر ۔ مولانا رشید گنگوہی کی مخالفت کو زیادہ اہمیت دی جاتی تھی حالانکہ آج اکبر مشرقیت کے پرستار کی حیثیت سے سرسید کے سب سے بڑے مخالف مانے جاتے ہیں ۔ سرسید کے ملنے کے بعد اور ان کے اخلاق سے متاثر ہونے کی وجہ سے اکبر کی طنز میں زہرناکی کم ہوگئی اور صرف اصولی اختلاف باقی رہا ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں ؎

شیخ سیّد سے تو خالی نہیں ذکرِ شاعر
ذات سے ان کی مخاطب نہیں فکرِ شاعر

آخر میں محسن الملک کی شیریں زبانی کی وجہ سے انھوں نے علی گڑھ کالج کی تعریف بھی کی جو گزٹ میں شائع ہوئی مگر مغربی تعلیم و تہذیب پر ان کے اعتراضات باقی رہے ۔ سرسید کی تحریک کے مخالف کی حیثیت سے ان کی شاعری مشرقیت ۔ قدامت ، وضع داری کی قدروں کی علم بردار ہے ۔ وہ زمانے کا ساتھ نہیں دیتی ۔ زمانے پر طنز کر کے اپنا دل ٹھنڈا کرتی ہے اس کی اپنی قدریں رفتہ رفتہ اتنی محدود ہو جاتی ہیں کہ جب اقبال کی 'اسرارِ خودی' شائع ہوتی ہے تو اس کے دیباچہ اور حافظ کے متعلق اشعار سے وہ برہم ہو جاتے ہیں اور اقبال پر طنزیہ اشعار لکھتے ہیں ۔ آخر عمر میں ترک موالات کا ہنگامہ ان کی نگاہوں سے گزرتا ہے یہ وہ زمانہ تھا جب وہ دنیا میں رہتے ہوئے بھی اسے چھوڑ چکے تھے ، اسی لئے بعض اوقات اس تحریک سے ہمدردی ظاہر کرنے کے باوجود بحیثیت مجموعی وہ اس کو تنقید نہیں سمجھتے تھے ۔ اس تمہید کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر کی شاعری اور اس کی رفتار کو ہم سرسید کی تحریک ، اقبال کے نقطۂ نظر اور ترک موالات کی روشنی میں بھی سمجھ سکتے ہیں اور تینوں کے متعلق ان کا نقطۂ نظر ایک ہی ہے چند اشعار سے یہ بات واضح ہو جائے گی ۔

حاضر ہوا میں خدمتِ سیّد میں ایک رات — افسوس ہے کہ ہو سکی کچھ زیادہ بات
بولے کہ تجھ پہ دین کی اصلاح فرض ہے — میں چل دیا یہ کہہ کے کہ آداب عرض ہے

تیجری وعظ و مہذب کو لئے پھرتے ہیں — شیخ صاحب ہیں کہ تہذیب لئے پھرتے ہیں
ہم کو ان تلخ مباحث سے سروکار نہیں — ہم تو اک شوخ شکر لب کو لئے پھرتے ہیں

تقلیدِ غرب ترکِ عبادت پہ ہے خموش — بس چھیڑتے ہیں صوفیِ خانہ خراب کو
مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی — اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

مناسب تھی ہماری شاعری اک وقت میں اکبر — مگر اب وہ زمانے کے موافق ہو نہیں سکتی

غنیمت تھی اداۓ خانقاہ اسکی نگاہوں میں کمیٹی اور ریزولیوشن پہ عاشق ہو نہیں سکتی

حکام ہیں خزانہ و توپ و رفل کے ساتھ خدام ہیں شگوفۂ ترک و عمل کے ساتھ
بازو میں یاں نہ زور گلے کو نہ شوقِ شور ہم تو مشاعرے میں ہیں اپنی غزل کے ساتھ

اگر آپ اکبر کے خطوط کا مطالعہ کریں تو اکبر کی شخصیت کا ایک اور پہلو سامنے آتا ہے۔ زندگی انھیں اس طرح عزیز نہیں ہے جس طرح غالب کو عزیز ہے۔ یہ خط ان کی شاعری کے مقابلے میں پھیکے ہیں۔ ان میں بیماری، حالات کی ناسازگاری، چل چلاؤ کا ذکر زیادہ ہے۔ غالب نے بھی اپنی بیماریوں کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر وہ رنج و راحت کو ہموار کرنا جانتے ہیں۔ ان کے پھوڑے پھنسی بھی سرو چراغاں ہیں۔ اکبر کی بیماریوں کا تذکرہ ہمیں مکدر کر دیتا ہے۔ اکبر کے یہاں وہ گہری سنجیدگی وہ اعلیٰ ہار مینی نہیں ہے جو غالب کے یہاں ہے۔ وہ کسی نشے کے سہارے ہی چل سکتے ہیں رندی کا نہ سہی تصوف کا سہی وہ مادیت اور روحانیت۔ علم و عمل۔ اخلاق و تمدن کے مسائل سے دلچسپی ضرور رکھتے ہیں مگر وہ گہری دلچسپی نہیں جو ایک مستقل خلش بن جاتی ہے۔ جس سے آتش خانوں کی آگ روشن ہوتی ہے۔ جو ہمیں غالب اور اقبال دونوں کے یہاں ملتی ہے۔ اگر ان کے یہاں بے چینی اور خلش ہوتی تو وہ اول درجے کے شاعر ہوتے اور ان کا اسلوب حکیمانہ اور رفیع ہوتا، وہ دوسرے درجے پر ہیں اور زندگی کے مسائل سے دلچسپی ایک مزاحیہ پیرایہ اختیار کر لیتی ہے وہ تعمیر نہیں کر سکتے۔ ہاں طنز کر سکتے ہیں۔ ایک نقاد نے طنز کے ملکہ کو تخلیق کے مقابلے میں کمتر درجہ دیا ہے۔ ممکن ہے اس خیال میں کچھ مبالغہ ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ تخلیق ستاروں سے آگے دیکھتی ہے اور طنز ستاروں کو بھی زمین پر نوچ لاتی ہے۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ فکر کی کمی کے باوجود ان کے یہاں سچے اور پر خلوص جذبات کی فراوانی ہے۔ وہ ایک عاشق ہیں اور اپنے عشق میں سب سے منفرد۔ میر عشق سے محبت کرتے ہیں۔ حسرت حسن سے۔ غالب زندگی سے۔ نظیر اس کی نعمتوں سے۔ اقبال توانائی اور تخلیق سے۔ جوش شباب سے۔ اکبر ایک تہذیب ایک تمدن کے عاشق ہیں۔ حالی، شبلی، اقبال، ابوالکلام کسی نے مشرقیت سے اس طرح عشق نہیں کیا، جس طرح اکبر نے۔ ان کے زمانے میں اس تہذیب پر ہر طرف سے حملے ہوئے اور انھوں نے بڑی بے جگری سے ان حملوں کا مقابلہ کیا۔ آج ہم اس تہذیب کے خط و خال اس کی عظمت و رفعت اور اس کی کوتاہیاں جس طرح اکبر کے کلام میں دیکھ سکتے ہیں۔ دوسری جگہ ممکن نہیں۔ اس وجہ سے ان کے سارے نقطۂ نظر کو نہ مانتے ہوئے ہم ان کی تاریخی تہذیبی اور ادبی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ اکبر کے کلام میں ہمیں قدیم و جدید کی کشمکش اور اس کے سارے پہلو مل جاتے ہیں اور کچھ نہ کہنے کے انداز میں بہت کچھ آجاتا ہے۔ ان کے یہاں انیسویں صدی کی ذہنی زندگی اور اس کی کشمکش محفوظ ہو گئی ہے۔

اکبر کے یہاں جو لطیف اور رچا ہوا تغزل ہے اس کی بھی ہماری شاعری میں اہمیت ہے یہاں اتنا موقع نہیں کہ اس کی مثالیں پیش کی جائیں، لیکن یہ بات کہنی ضروری ہے کہ اس تغزل کی وجہ سے ان کی ظرافت ہمارے لئے بڑی دلکش اور پرکیف ہو جاتی ہے یہ ظرافت جب طنز بن جاتی ہے اور اس میں ایک مقصدی رنگ آجاتا ہے تو اس طنز کو ہم رجعت پرست کہنے پر مجبور ہیں، لیکن ظرافت کا سرمایہ ان کے یہاں کیفیت و کمیت کے لحاظ سے اتنا وقیع ہے کہ اس کی اہمیت باقی رہتی ہے یہاں طنز و ظرافت اور مزاح کے فرق کو واضح کرنا ضروری ہے۔

آسکر وائیلڈ لکھتا ہے کہ اگر کسی سے سچی بات کہلوانا ہو تو اسے ایک نقاب دیدو۔ ظرافت ایسی ہی ایک نقاب ہے۔ فرائیڈ نے ظرافت کی تعریف کرتے ہوئے اسے SENSE SENSO کہا ہے یعنی بے تکی باتوں میں تک کی بات۔

اس کے خیال کے مطابق تمام طور پر دلی جذبات کا اظہار آسان نہیں ہوتا ظرافت کے ذریعے سے انسان کی فطرت ان جذبات کے اظہار کا ذریعہ تلاش کر لیتی ہے، وہ ہنسی ہنسی میں تنقید کرتی ہے۔ عقلیت سے فرار اور بالغ ذہنیت کے بجائے طفلانہ ذہنیت کو بروئے کار لا کے وہ الجھانے اور سلجھانے کا ایک نیا کھیل کھیلتی ہے۔ ظرافت (Wit) کے ذریعہ سے الفاظ کو الٹ پلٹ کرتی ہے۔ مقولوں اور محاوروں سے نئے کام لیتی ہے۔ وقتی عنصر کو صرف میں لاتی ہے۔ جانے پہچانے واقعات میں نیا حسن دریافت کرتی ہے۔ جنسی دباؤ کی نکاسی کا راستہ تلاش کرتی ہے۔ ذہنی ظرافت میں غلط منطق سے کام لیا جاتا ہے۔ اداروں اور رسم و رواج پر تنقید ہوتی ہے۔ اسی طرح عقلیت اور تنقیدی شعور اور نفسیاتی دباؤ تینوں سے انتقام لیا جاتا ہے۔ یہ انتقام صحت مندانہ ہے۔

معمولی ظرافت الفاظ سے پیدا کی جاتی ہے اعلیٰ ظرافت کے لئے خیال کی ندرت ضروری ہے۔ بات کہنے کے تین طریقے ممکن ہیں۔ ایک بات کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔ دوسرے اسے ہلکا کرکے دکھانا۔ یہ دونوں طریقے مشہور مزاح نگاروں نے استعمال کئے ہیں۔ بعض بڑے مزاح نگاروں نے تیسرا یعنی صاف بات کہنے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ برنارڈ شا کہتا ہے کہ سچی بات سب سے زیادہ ظریفانہ ہوتی ہے۔ یہاں بھی غور سے دیکھئے تو پہلا طریقہ ملتا ہے۔ رومان اور شاعری میں بھی مبالغہ کام کرتا ہے۔ مگر ظرافت کا مبالغہ اس کی مخالف سمت کا ہے۔ سوئفٹ نے GULLIRERS TRAVELS میں ایک سفر میں انسان کو بونوں کے ملک میں دکھایا۔ دوسرے سفر میں دیوزادوں کے۔ اس نے صرف آئینے بدل دئے اور تصویر مضحکہ خیز ہوگئی۔ آغاز میں ظرافت مبالغے کے سہارے چلتی ہے۔ سودا کے ہجویات اس کی مثال ہیں۔ اس دور میں جسمانی کمزوریوں، شخصی خامیوں کا ذکر زیادہ ہے، ہنگامے۔ مار پیٹ۔ بھاگ دوڑ۔ شدید جذباتیت یا رومانیت سے بھی مزاح پیدا کیا جا سکتا ہے۔ نظیر اور عظیم بیگ چغتائی کے یہاں یہ رنگ نمایاں ہے۔ مگر اس کی اپیل زیادہ تر وقتی ہے غور سے دیکھئے تو ہنسنے میں ہم کسی سے برتری کا احساس ظاہر کرتے ہیں۔ ہم کچھ اونچے ہو جاتے ہیں وہ کچھ نیچا نظر آتا ہے۔ ظرافت ایک ایسا کیمرہ ہے جس میں ہر تصویر چھوٹی کچھ کچھ پھیلی ہوئی نظر آتی ہے اور نفسیات کے عجیب و غریب قاعدوں کے ماتحت جذبات کی اس نکاسی کے بعد ہم نارمل یا صحت مند ہو جاتے ہیں۔ رشید صدیقی نے ایک جگہ کہا ہے کہ طنز و ظرافت کی مثال سفلی عمل کی سی ہے اگر عمل پورا نہ ہو تو عامل خود ہی اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح بعض اوقات لوگوں کے ہنسنے پر رونا آتا ہے اور ان کے رونے پر ہنسی۔ ظریف عام خیال کو الٹ کر کسی چیز پر زیادہ زور دے کر کسی تشبیہ کے ذریعہ سے ایک پہلو کو نمایاں کر کے۔ بات میں بات پیدا کرکے ذہن کے سامنے ایک ایسی انوکھی اور رنگین تصویر لاتا ہے کہ طبیعت شگفتہ ہو جاتی ہے۔ قاعدہ ہے کہ جب تہذیب و تمدن پھیلتے ہیں تو ان کا عمل ایک طرح کی ہمواری اور یک رنگی کا ہوتا ہے۔ افراد کو یہ ایک سماج بناتا ہے۔ اشخاص کو مجمع کے صفات عطا کرتا ہے جو شخصیتیں کسی کمزوری یا اپج کی وجہ سے خیالات یا عمل کی یہ یکسانی اور وحدت قبول نہیں کرتیں، ظرافت ان پر وار کر کے انھیں مجمع میں واپس لانا یا انھیں مجمع سے نکال دینا چاہتی ہے۔ تہذیب یا کلچر کے نمائندے چند افراد ہوتے ہیں۔ کلچر کو تمدن یا CIVILISATION بننے میں دیر لگتی ہے۔ اسی لئے مہذب افراد تو ہر دور میں عام لوگوں پر ہنستے ہیں مگر تمدن میں

ظرافت کا عنصر اسی وقت آتا ہے جب وہ ایک ٹھہراؤ کی حالت میں ہوتا ہے۔ لکھنؤ کی درباری تہذیب نے ایک ظرافت بھی پیدا کی، مگر اس میں اعلیٰ ظرافت کم تھی۔ سستی ہنسی، الفاظ کی طلسم بندی۔ زبان کی بازی گری زیادہ، ظرافت کی اعلیٰ حس جسے SENSE OF HUMOUR کہتے ہیں، تہذیب کی پختگی کی علامت ہے۔ اردو میں غالب سے ہمارے یہاں یہ رنگ ملتا ہے۔ اکبر کا کمال یہ ہے کہ ان کے یہاں ظرافت کے سبھی رنگ ملتے ہیں، طنز و ظرافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اچھی ظرافت میں ایک پوشیدہ طنز ضرور ہوتی ہے۔ طنز کے لئے ظرافت ضروری نہیں۔ رشید صدیقی کی ظرافت میں طنز کی لہریں ہیں۔ مولانا عبدالماجد اور سجاد انصاری کی طنز میں ظرافت ہر جگہ نہیں ملتی۔ اعلیٰ طنز میں ظرافت اور ادبی حسن دونوں ضروری ہیں خالص ظرافت نشیب و فراز کا احساس دلا کر ایک مسرت یا انبساط پیدا کرتی ہے۔ طنز میں مسرت اور خوشی ملی جلی ہوتی ہے۔ اسلوب کی طرح طنز و ظرافت کا حسن بھی یہی ہے کہ اس کے غازہ و رنگ پر نظر نہ پڑے ؎

کر جائے کام اپنا لیکن نظر نہ آئے

ظرافت کی اعلیٰ قسم جس کی سب سے اچھی مثال اس مجرم نے پیش کی جو پھانسی کے تختے پر جاتے وقت زکام سے بچنے کے لئے گلے میں مفلر ڈالے ہوئے تھا، یا اس امریکن نے جو ایک اندھی کے متعلق کہہ رہا تھا کہ یہ آپ کو خدا بھی فائدہ نہیں پہنچا سکیگا۔

غالب کے یہ اشعار بھی اعلیٰ ظرافت کی مثالیں ہیں ؎

کہاں مے خانے کا دروازہ غالب اور کہاں واعظ　　پر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

قرض کی پیتے تھے مے لیکن سمجھتے تھے کہ ہاں　　رنگ لائے گی ہماری فاقہ مستی ایک دن

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی　　سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

اکبر کی ظرافت کے سب سے اچھے نمونے وہ ہیں جہاں وہ نشیب و فراز پر نظر ڈالتے ہیں روحانیت۔ جوش اجذبے، اندھی تقلید غلامانہ ذہنیت، بدمذاقی پر وار کرتے ہیں۔ جہاں ان کا مقصد صحت و اصلاح ہے۔ جہاں وہ نشتر سے علاج کرتے ہیں۔ جب وہ اس سے آگے بڑھ کر تاریخی حقائق۔ واقعات کے بہاؤ۔ زندگی کے تقاضوں پر طنز کرنے لگتے ہیں تو ان کی طنز پر لطف رہتی ہے۔ مگر وقتی ہو جاتی ہے، انکا کیف و انبساط۔ خیال کی گہرائی نہ ہونے کی وجہ سے کچھ عرصہ کے بعد زائل ہونے لگتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اکبر کا آخری دور شاعری اگرچہ مولانا عبدالماجد کے الفاظ میں اسرار و رموز کی وجہ سے ان کی پختگی کو ظاہر کرتا ہے مگر شاعری کے نقطۂ نظر سے اس میں انحطاط ملتا ہے۔ شاعر واعظ کا جامہ پہن لیتا ہے۔ ایک دلچسپ رفیق کے پیچھے سے ایک ناصح مشفق برآمد ہوتا ہے جو زندگی اور اس کی بہاروں سے مایوس ہو چکا ہے اور جس کے یہاں مزاج خانقاہی اتنا بڑھ جاتا ہے کہ محفل اسے چھوڑ کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ پہلے ظریف اکبر کے وہ اشعار دیکھئے۔ جن کا لطف ہر دور میں باقی ہے ؎

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر　　مجھے تو ان کی خوشحالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں　　نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس
کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے　　کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم۔ اے پاس
تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے　　بلا دقت میں بن جاؤں تری ساس

کہا مجنوں نے یہ اچھی سنائی — کجا عاشق - کجا کالج کی بکواس
بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے ؟ — ہرن پر لادی جاتی ہے کہیں گھاس
دل اپنا خون کرنے کو ہوں موجود — نہیں منظور مغز سر کا آماس
یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ — تو استعفیٰ مرا با حسرت و یاس

ملکی ترقیوں میں دو دانے نکالئے — پلٹن نہیں تو خیر رسالے نکالئے
بوٹ ڈاسن نے بنایا میں نے اک مضموں لکھا
ملک میں مضموں نہ پھیلا - اور جوتا چل گیا
یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی — شاید نرے لیڈر رہتے زلیخا کے میاں بھی

خوب فرمایا یہ شاہِ جرمنی نے پوپ سے — وعظ ہم بھی کہتے ہیں لیکن دہانِ توپ سے

پری کی زلف میں الجھا نہ ریشِ واعظ میں — دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

شیطان نے دیا یہ شیخ جی کو نوٹس — بالکل ہی گیا ہے زور اب آپ کا ٹوٹ
آئندہ پڑھیں گے آپ لاحول اگر — فوراً داغوں گا اک ڈفیمیشن کا سوٹ

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں — مگر اندھیرے اجالے چوکتا بھی نہیں

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں — کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

دعویٰ بہت بڑا ہے ریاضی میں آپ کو — طولِ شبِ فراق کو تو ناپ دیجئے

اجل آئی اکبر گیا وقتِ بحث — اب الف کیجئے اور نہ بٹ کیجئے

ہم تو کالج کی طرف جاتے ہیں اے مولویو — کس کو سونپیں تمھیں اللہ نگہبان رہے

ظاہر ہوئی کمیٹی دکالج کی اک لکیر — آخر اسی لکیر کے سب ہو گئے فقیر

کتنے ہی بے وقار ہوں مرزا کو غم نہیں　　کافی ہے یہ شرف کہ دفاتی سے کم نہیں

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں　　فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

مس سے بیگم نے کہا کل تو کہاں اور ہم کہاں　　بوٹ کی چرچر میں کیا رکھا ہے یہ چھم چھم کہاں
مس یہ بولی بڑھ کے نکلو تو ذرا اسکول سے　　اور ہی چالیں نظر آئینگی یہ عالم کہاں

باپ ماں سے شیخ سے اللہ سے کیا ان کو کام　　ڈاکٹر جنوا گئے ۔ تعلیم دی سرکار نے

کمیٹی میں چندے دیا کیجئے　　ترقی کے ہیجے کیا کیجئے

تاکیدِ عبادت پہ یہ اب کہتے ہیں لڑکے　　پیری میں بھی اکبر کی ظرافت نہیں جاتی

وصل ہو یا فراق ہو اکبر　　جاگنا ساری رات مشکل ہے

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم　　یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں　　گفتنی درجِ گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب رَدّی　　بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

کیا پوچھتے ہو اکبر شوریدہ سر کا حال　　خفیہ پولس سے پوچھ رہا ہے کمر کا حال

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کیساتھ　　رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کیساتھ

کی تھی پاپوش زنی جب ہوئی نالش دائر　　کہہ دیا صلح کر لیتا ہوں جوتا واپس
واپسی گو تھی زبانی ہوئی نالش ڈسمس　　ہو گیا کورٹ سے وہ شوخ اچھوتا واپس

کمزور ہے تیری صحت بھی، کمزور تری بیماری بھی　　اچھا جو رہا کچھ کر نہ سکا بیمار پڑا تو مر نہ سکا

ظاہر کا ادب ملحوظ رہا باطن بھی مگر محفوظ رہا　　واعظ سے ادھر اک بات سنی ساقی سے ادھر اک جام لیا

خدا کے باب میں کیا آپ مجھ سے بحث کرتے ہیں　　خدا وہ ہے کہ جس کے حکم سے صاحب بھی مرتے ہیں

اکبر کی ظرافت یہاں دو باتوں کی وجہ سے پر لطف ہے ۔ اول تو وہ انتہا پسندی شدت، اور تقلید پر طنز کرتے ہیں جو ہر دور میں لطف رکھتی ہے ۔ دوسرے وہ اپنے دور میں مغرب کی نقالی اور اس کی وجہ سے نئی نسل کی اپنے ماضی سے یکسر بیگانگی کا پردہ فاش کرتے ہیں، تیسرے وہ اپنے دور کی تہذیبی زندگی کے نقش و نگار پیش کرتے اور ان سے ظرافت کا سامان اخذ کرتے ہیں، اکبر کے زمانے میں دراصل جاگیردارانہ تمدن کو رفتہ رفتہ نئے سرمایہ دارانہ تمدن کے مقابلہ میں شکست ہو رہی تھی ۔ سرمایہ داری لازمی طور پر زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی نہیں ہے ۔ یہ شروع میں افراد کو آزادی عطا کرتی ہے وہ خاندان کے رسم و رواج اور اس کے شکنجے سے نکل کر تازگی محسوس کرتے ہیں مگر یہ انھیں ایک اور لعنت میں گرفتار کر دیتی ہے وہ ان سے انسانیت چھین کر انھیں مطلب پرستی دیدیتی ہے یہ ان کے اخلاق کو بگاڑتی ہے ۔ انھیں خود غرض بناتی ہے ۔ ان کو مشین کی غلامی سکھاتی ہے ۔ ان کی ابتدائی آزادی کو رفتہ رفتہ اپنی تجارت کے تقاضوں پر قربان کر دیتی ہے ۔ شعر و ادب، تہذیب، اخلاق، انسانیت اور علم کے اعلیٰ معیاروں کو اپنے مقاصد کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے ۔ مارکس نے ایک جگہ اس بورژوا تہذیب کی غارتگری کا بڑے اچھے انداز سے ذکر کیا ہے ۔ اس لئے اکبر جب نئی نسل کی غلامانہ ذہنیت مغربی سیاست کی شعبدہ گری، سامراجی چالوں، بازاری اور سرکاری تعلیم، محبت ۔ اخلاق ۔ قومی تاریخ سے بیگانگی کا ذکر کرتے ہیں تو ایک صالح اور رفیع تہذیبی مقصد کی موجودگی کی وجہ سے ان کی ظرافت پر لطف اور اس کی شگفتگی صدا بہار ہے ۔ مشکل یہ ہے کہ اکبر اس پر اکتفا نہیں کرتے، ان کے یہاں صرف روایت پرستی TRADITIONALISM نہیں ۔ رسم پرستی بھی ہے وہ نل کے پانی ۔ ترقی تعلیم، ٹائپ کے حروف ۔ عورتوں کی تعلیم ۔ سیاسی جدوجہد، سائنس، عقلیت، فطرت پر تسخیر کا بھی مذاق اڑاتے ہیں ۔ نئی تہذیب اپنے ساتھ جو برکتیں لائی، اکبر نے ان پر نظر نہیں کی ۔ سرسید کی تحریک کے ذریعہ سے جو تعلیمی، تہذیبی، علمی و ادبی قدریں ملیں اکبر ان سے خوش نہیں، اقبال کے تصوف پر اعتراضات سے بھی وہ خفا ہیں، حالانکہ اقبال درویشی اور سادگی کے دلدادہ تھے، روحانیت کے قائل تھے ۔ وہ صرف عجمیت اور گوسفندی اور مروج خانقاہی کے خلاف تھے جو قوموں کو حرکت عمل اور جدوجہد سے دور لے جاتا ہے اور خواب فنا میں غرق کر دیتا ہے ۔ اکبر نے خاص طور پر معاشرت، تعلیم نسواں اور عورت پر طنز کی ہے اس سلسلہ میں ایک واقعہ بیان کرنا ضروری ہے ۔ چند سال ہوئے میں نے ایک فلم دیکھا جس کا نام "فیشن" تھا ۔ اس میں مغربی تعلیم کا مذاق اڑایا گیا تھا ۔ گویا فلم اکبر کے خیالات کا آئینہ تھا، ایک جگہ ایک شریف گھریلو قسم کی خاتون نے بے پردگی کی برائی کرتے ہوئے اکبر کا یہ مشہور قطعہ پڑھا ؎

بے پردہ کل جو چند نظر آئیں بی بیاں　　اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا　　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پورے ہال میں چوتھے مصرع پر شاید دو یا تین اشخاص نے تالیاں بجائی ہوں ورنہ زیادہ تر اشخاص خاموش رہے اور یہاں اکبر کی طنز خود اکبر پر لوٹ گئی ہے ۔ وقت کی طنز، شاعر کی طنز سے بڑی ہوتی ہے ۔ چنانچہ اکبر جب پردے کو تمکنت، اقبال، میاں پن، عزت و حمیت کی علامت بتاتے ہیں تو ان کی مشرقیت میں جاگیردارانہ رئیسانہ اور

ایرانی تمدن کی خوبصورت دکھائی دیتی ہے، جو مردوں اور عورتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ نظام اخلاق مقرر کرتی ہے اور آبادی کے نصف حصے کو گھر کی چار دیواری میں ساز دلبری کا اسیر دیکھتی ہے۔ اپنی ایک نظم میں نادانستہ انھوں نے یہ بات بھی کہہ دی ہے سے

خود تو گٹ پٹ کے لئے جان دئے دیتے ہو ہم پہ تاکید کہ پڑھ بیٹھ کے قرآن مجید

دولہ بھائی کی ہے رائے یہ نہایت عمدہ ساتھ تعلیم کے تفریح کی حاجت ہے شدید

اکبر عورت کے جنسی پہلو سے بہت کم نکلتے ہیں۔ عورت کا وہ تصور جو مثلاً گوئٹے کے فاؤسٹ میں ملتا ہے اور جو مرد نوشت کو انسانیت کی تکمیل کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ اکبر کے یہاں نہیں۔ وہ ماں ہے یا بیوی یا بیٹی یا پھر طوائف۔ مگر صرف عورت کم ہے جو ادب اور آرٹ کی تخلیق کا سرچشمہ اور حسن کاری اور لالہ کاری کا منبع ہے۔ حالی تو ماؤں، بہنوں، اور بیٹیوں تک پہونچے۔ اقبال اور جوش کے یہاں بھی مشرقی تصور زیادہ ہے۔ قرۃ العین، فلورنس نائٹ اینگل اینی بیسنٹ اور مسز نائیڈو کی اہمیت کو اب جاکر سمجھا گیا ہے۔ اکبر کا تصور جو ان کے جاگیردارانہ ذہن کا غماز ہے۔ یورپ میں سرسید کے خاکوں میں اور مغربی عیش و عشرت کی پرکیف داستانوں میں خوب جھلکتا ہے۔ مغربی اور مشرقی عورت۔ مس۔ بت۔ بیگم کا ذکر انھوں نے مزے لے لے کر کیا ہے۔ مگر انداز بیان کی شوخی اور برجستگی نے ان اشعار میں لطف بھی پیدا کر دیا ہے سے

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے

سائے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن اس شوخ کے گھنگرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

بتوں کے پہلے بندے تھے مسوں کے اب ہوئے خادم ہمیں ہر عہد میں مشکل رہا ہے باخدا ہونا

ان کی "برق کلیسا" میں جہاں مرکزی خیال بڑی خوبی سے بیان ہوا ہے وہاں مغربی حسینہ کے سراپا میں اکبر نے بڑی رنگین اور شوخ زبان استعمال کی ہے۔ عورت کا نام آتا ہے تو اکبر اکثر پھسل جاتے ہیں۔ یہ ان کی جوانی کی حسن پرستی اور رنگینی کا عطیہ ہے۔ اکبر سائنس۔ عقلیت۔ فلسفہ۔ تجربات۔ فطرت کی تسخیر۔ انسانی سعی و عمل کی وسعتوں کے قائل نہیں ہیں۔ یہیں اکبر انکی ظرافت بجائے پرلطف ہونے کے خطرناک ہو جاتی ہے اور یہ خطرہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ جاتا ہے کہ انھوں نے اردو شاعری کی ساری رمزیت سے اس سلسلہ میں خوب کام لیا ہے اور زبان پر پوری قدرت کی وجہ سے بڑی اچھی تشبیہوں کے ذریعہ سے اپنے خیال کو واضح کیا ہے۔ چنانچہ زیور کی کثرت بعض اوقات حسن کا معیار ہو جاتی ہے۔ میں نے جان بوجھ کر اکبر کی ظرافت کے بیان میں ان کے موضوعات اور افکار کا زیادہ تذکرہ کیا ہے۔ ان کے فن اس کے آداب اور اس کی خصوصیات کو بیان نہیں کیا۔ عام طور پر نقادوں نے اس چیز کو سراہا ہے۔ حالانکہ میرا خیال یہ ہے کہ کوئی فن یا فارم یونہی وجود میں نہیں آتا اس کے پیچھے ایک فکر اور نظر ضرور ہوتی ہے۔ اکبر کے یہاں ظرافت الفاظ کا حسن زیادہ ہے۔ گو بعض اوقات ان کا خیال بھی پرلطف ہوتا ہے وہ خود اپنے توانی کی اپنے حلقے سے داد چاہتے ہیں۔ انھیں احساس ہے کہ سے

اکبر کا قلم صنعت لفظی میں ہے کامل

وہ اگرچہ شاعر ہیں مگر اس کے ساتھ مزاح نگار بھی ہیں۔ شاعری جذبہ کی زبان ہے۔ نثر خیال کی۔ ظرافت میں خیال مضحکہ خیز ہوتا ہے اس لئے ظریف شاعر کو شاعری کے جذبہ کے ساتھ خیال کی وضاحت بھی کرنی پڑتی ہے۔ ظریفانہ اشعار میں اگر خیال واضح نہیں ہے تو طنز کا وار بیکار جاتا ہے۔ اکبر کے فن کی خوبی کی دلیل یہ ہے کہ ان کے یہاں خیال ہیرے کی طرح تراشا ہوا ہے جیسے جوہری

نے ایک مناسب جگہ جڑ دیا ہے۔ اکبر نے بات کہنے کا انداز اپنے مخالف سرسید سے سیکھا۔ اور صرف بات کہنے کا انداز ہی نہیں اور بھی بہت کچھ۔ اکبر نے اپنی شاعری میں انگریزی کے بہت سے الفاظ استعمال کئے۔ بعض اصطلاحات وضع بھی کیں۔ بعض ناموں کو علامات ٹھہرایا۔ بعض ایسے لفظ برتے جو بول چال میں آتے تھے۔ مگر شاعری میں ٹکسال باہر تھے۔ اکبر نے مغربی تہذیب کی بڑی سختی سے مخالفت کی مگر اپنی شاعری میں اس سے خوب کام لیا۔ یہ فن کاری کی واعظ پسند فتح کو ظاہر کرتا ہے اکبر کی ظرافت کا حسن ان کی مرصع کاری۔ ان کی موزوں تشبیہات۔ ان کے قوافی۔ انگریزی الفاظ کے برمحل استعمال۔ ان کی علامات۔ اساتذہ کے اشعار میں بامزہ تصرف اور ان کے نکھرے اور ستھرے اسلوب کا رہین منت ہے۔ مگر اس سے زیادہ اس تازہ کار و تازہ خیال شعور کا جو عام زندگی کے سیلاب میں اپنے کام کے موتی دیکھ لیتا ہے جو ہلکے اور گہرے ہر قسم کے رنگوں سے تصویریں بنا سکتا ہے جسے عبارت۔ اشارات ادا۔ تینوں کا راز معلوم ہے۔ ان کے ذہن میں کہیں الجھن نہیں ہے۔ اشعار ان کے منہ سے اس طرح نکلتے ہیں جیسے باجے سے راگ۔ شعر کہنا ان کی طبیعت ثانیہ ہو گیا ہے۔ اکبر کے زمانے میں ادب کو اتنی اہمیت حاصل ہو چکی تھی کہ مصنف اور شاعر ایک سماجی رتبہ رکھتا تھا۔ اکبر کی ان کے زمانے نے کافی قدر کی۔ انھیں کے الفاظ میں اُن کا خون جگر مال تجارت بھی بنا۔ میں اس اجمال کی وضاحت کرتا مگر شاعر کا یہ قول آڑے آتا ہے ؎

تفصیل نہ پوچھ ہیں اشارے کافی　　　یونہیں یہ کہانیاں لکھی جاتی ہیں

میں نے اوپر کہا تھا کہ اکبر جب سائنس۔ عقلیت اور علم و فن کا مذاق اڑاتے ہیں تو ان کا کلام رجعت پرستی کے ہاتھ میں اک آلہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ سیاسی اور تعلیمی جدوجہد کو بھی بیکار سمجھتے ہیں اور صرف توکل اور قناعت کا پرچار کر کے ایک مجہول اور مریض روحانیت کے علم بردار بن جاتے ہیں ؎

نہ کتابوں سے نہ کالج کے ہے دَر سے پیدا　　　دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا

وہ حافظ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے　　　خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

فلسفی تجربہ کرتا تھا ہوا میں رخصت　　　مجھ سے کہنے لگا وہ آپ کدھر جاتے ہیں
کہہ دیا میں نے ہوا تجربہ مجھ کو تو یہی　　　تجربہ ہو نہیں سکتا ہے کہ مر جاتے ہیں

تڑپوگے جتنا جال کے اندر　　　جال گھسے گا کھال کے اندر
کیا ہوا تین ہی سال کے اندر　　　غور کرو اس حال کے اندر

طفل کالج کو سمجھ لیجئے اک پن نائف　　　بس قلم ہی کے لئے اس میں بہت تیزی ہے

بھول جائیں گی ترقی خواہیاں لاحول تک　　　ہم کو یہ تہذیب پہنچے گی براڈ وبول تک

یہ پولیٹکل مرض یہ ہنگامہ ہے بے سود — اس سے کوئی چیز اپنی جگہ سے نہ ہلے گی

کیونکر کہوں کہ کچھ بھی نہیں فر کے سوا — سب کچھ علوم غرب میں ہے خیر کے سوا

کالج و اسکول و یونیورسٹی — قوم بیچاری اسی میں مر مٹی

تہذیب قدیم کے جب ارکان تھے چست — ملکی حالات سب تھے صاف و درست
تعلیم جدید نے کیا فتنہ بپا — اے باد صبا ایں ہمہ آوردۂ تست

یہی نہیں کہ اکبر کی صلح پسندی اور سکون آشنا طبیعت کو ہر قسم کے ہنگامے بے سود نظر آتے ہیں۔ وہ مشرق کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کو مضر اور نئی تہذیبی غذا سے کچھ زندگی اور قوت اخذ کرنے کو موت سمجھتے ہیں کلیات اکبر حصہ چہارم میں یہ شعر دیکھئے ؎

ہو تیزی انور کی جو ہوس، ہنگامہ کرو توپوں سے بھنو
گاندھی کی جو حکمت خوش آئے چپ چاپ گزی کے تھان بنو
صاحب کی رفاقت ہو جو پسند۔ آسام میں جا کر چائے چنو
اکبر کی جو مانو بیٹھ رہو، جو کچھ بھی ہو لیکن صبر کرو

یہی وجہ ہے کہ اکبر کے یہاں تصوف مشرقیت اور جذباتیت ان کے آخری دور کو ایک المیہ بنا دیتی ہے انھیں اپنے مشن کی ناکامی کا احساس ہو جاتا ہے اور وہ دنیا کی محفل سے منھ موڑ کر کنج عافیت تلاش کرتے ہیں ؎

موزوں نہ انجمن میں میدان کے نہ لائق
اس وقت مجھ کو گھر کا کونہ ہی چاہیے تھا

شعر اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب — یہ اسے معلوم ہے "ملتی نہیں آئی ہوئی

اک بار نظر آیا خزاں کا جو تصرف — پھر ہم نے کبھی سوئے گلستاں نہیں دیکھا

ہمیں اس انقلاب دہر کا کیا غم ہے اے اکبر — بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ ہم ہونگے نہ تم ہوگے

غریب اکبر نے بحث پردے کی کی بہت کچھ مگر ہوا کیا — نقاب الٹ دی یہ اس نے کہہ کر کر ہی لیگا موا کیا

نہ اکبر کی ظرافت سے رکے یاران خود آرا — نہ حالی کی مناجاتوں کی پروا کی زمانے نے

میری اس ساری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ اکبر کی ظرافت کا لطف اب بھی باقی ہے۔ خصوصاً جہاں وہ مزاحیہ انداز میں نئی نسل کی انتہا پسندی اور مغرب کی کورانہ تقلید کا ذکر کرتے ہیں۔ جب وہ گہرائی میں جاتے ہیں اور وہ افکار و اقدار سے بحث کرتے ہیں تو ان کی نظر کی کوتاہی واضح ہو جاتی ہے اور ان کے پیام کا محدود رنگ ظاہر ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ پیامی شاعر کے لئے جس مفکرانہ سنجیدگی کی ضرورت

ہے وہ اکبر کے یہاں نہیں ملتی ۔ ان کی نظر ماضی کی طرف ہے حال میں بھی انھیں پرانی قدریں عزیز ہیں ۔ حالانکہ دنیا کے بڑے مزاحیہ ادب پر نظر ڈالنے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ ان میں ماضی پر طنز ملتی ہے اور قدیم روایات کا خاکہ اڑایا گیا ہے اسی لحاظ سے سرشار تک اکبر سے آگے ہیں ۔

مگر اکبر کی ظرافت کا ایک ثمرہ ہمارے لئے بڑا قابل قدر ہے ۔ یہ ہے انیسویں صدی کے آخر اور جنگ عظیم کے بعد تک تقریباً پچاس برس کی تہذیبی زندگی کا ایک نقشہ یہ وہ دور ہے جب پہلی دفعہ نئے اور پرانے کی کشمکش ایک واضح رنگ اختیار کرتی ہے ۔ اکبر کے اشعار میں ہمیں اس کا ایک اک نقش نظر آتا ہے ۔ اکبر اس معنی میں اپنے دور کی پوری ترجمانی کرتے ہیں کہ ان کے کلام میں اس زندگی کا ہر پہلو نظر آتا ہے ، نظام اخلاق ، معاشرت مذہبی اور سیاسی اقدار کے متعلق چند باتیں میں کہہ چکا ہوں زبان کے متعلق چند باتیں خاص طور پر کہنا چاہتا ہوں ۔

ہندوستان میں قومیت کی تحریک نے احیا پسندی کو فروغ دیا ۔ مغربی سیاست نے اس کے ساتھ ہندو مسلم اختلاف کو بڑھایا اور اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا ۔ اکبر مغرب دشمنی کے ساتھ انگریز کے بھی دشمن رہے وہ مغرب کی اس چال کو سمجھتے تھے چنانچہ زبان و ادب کے مسائل اردو اور ہندی اور شاعری کے اسالیب پر جتنا اکبر نے لکھا ہے کسی اور نے نہیں لکھا ۔ ہندی کے متعلق اکبر کے خیالات ہر جگہ صحیح نہیں ان میں کہیں کہیں تنگ نظری بھی ہے مگر ہندی کی تحریک نے قدیم تہذیب کی آج جو علمبرداری اپنے ذمے لی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر کے اندیشے کچھ ایسے بے جا نہ تھے ؎

اردو میں جو سب شریک ہونے کے نہیں — اس ملک کے کام ٹھیک ہونے کے نہیں
ممکن نہیں شیخ امرالقیس بنیں — پنڈت جی والمیک ہونے کے نہیں

بس کر بھاشا ئے امسال مرا ہندی میں — کوئی بڑھ ہی نہ سکا ل کُمّی فی الفور نجات

محو تھا عشقِ بتاں میں خبر اکبر کو نہ تھی — ناگری کو بھی کرے گی ۔ یہی ناگن پیدا

وصل کی شب میں نے اس بت سے لڑائی تھی زباں — اس کا یہ ثمرہ ملا ۔ اردو سے ہندی لڑ گئی

بام اردو توڑ کر ہندی کی چھت پر آگئی — ساز اُپج کو چھوڑ کر اپنی ہی گت پر آگئی

بابو جی کا وہ بت ہوا نوکر — غیر اس کو پیام دیتا ہے
بابو کہتا ہے وہ نہ جائے گا — میرے انڈر میں کام دیتا ہے

اردو کو وہ عربی کیوں نہ کریں ، ہندی کو وہ بھاشا کیوں کریں — بحثوں کے لئے اخباروں میں مضمون تراشا کیوں کریں

ان کی ایک مسلسل غزل کے یہ اشعار بھی دیکھئے ؎

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہو گی — لغات مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
نہ پیدا ہو گی خطِ نسخ سے شانِ ادب آگیں — نہ نستعلیق حرف اس طرح سے زیبِ رقم ہوں گے

اس سلسلہ میں موجودہ سیاست کے متعلق ان کے یہ اشعار بھی کچھ کہتے ہیں ؎

شیخ صاحب برہمن سے لاکھ برتیں دوستی | بے بھجن گائے تو مندر سے ٹکا ملتا نہیں

ان کی ایک غزل کے چند شعر بھی یہاں بے محل نہ ہوں گے ؎

ہوں میں پروانہ مگر، شمع تو ہو رات تو ہو | جان دینے کو ہوں موجود کوئی بات تو ہو
دل بھی حاضر سرِ تسلیم بھی خم کو موجود | کوئی مرکز ہو کوئی قبلۂ حاجات تو ہو
دلکشا بادۂ صافی کا کسے ذوق نہیں | باطن افروز کوئی پیرِ خرابات تو ہو
گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصہ لیکن | کس سے کہئے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو

داستانِ غمِ دل کون کہے ۔ کون سُنے
بزم میں موقعِ اظہارِ خیالات تو ہو

برنارڈ شا نے کہا ہے کہ اسے ادب میں شخصیت سے زیادہ تصورِ حیات سے دلچسپی ہے، یہ نقطۂ نظر صحیح ہے اکبر کی شخصیت بڑی دلکش ہے وہ سوائے آخر دور کے ایک اچھے اور دلچسپ رفیق ہیں۔ ان کے دلچسپ فقرے اور لطیف جملے ۔ پھڑکتے ہوئے اشعار اور پُر معنی اشارے ہمارے ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ ادب میں شخصیت سب کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اہمیت کچھ ہے۔ وہ آج غالب کے بعد سب سے بڑے مزاح نگار ہیں۔ انھوں نے خود کہا ہے کہ اگر وہ بدخود گورنمنٹ نہ ہوتے تو گاندھی کی گوپیوں میں پائے جاتے یہ صحیح ہو یا نہ ہو مگر یہ واقعہ ہے کہ سرکاری نوکری فکر و نظر کے راستے بند کر دیتی ہے۔ وہ جہاں صاف دل کی بات نہیں کہہ سکتے تو شاذ معنی کو ظرافت کا لحاف اوڑھا دیتے ہیں۔ وہ اپنی تہذیب کے سچے عاشق تھے اور عاشق سے آپ اتفاق کریں یا نہ کریں اس کا احترام کرنے پر آپ مجبور ہیں ۔

موجودہ نسل اکبر کی ادبی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے یہاں انبساطِ ذہنی کی جو چاندنی ہے اس کے حسن کو مانتے ہوئے ان کی تمدنی اور تہذیبی مصوری کے قائل ہوتے ہوئے بھی ان کے نقطۂ نظر اور ان کے پیام کو مان نہیں سکتی۔

انھیں کے ایک لطیف اور بلیغ شعر میں اس کا جواز موجود ہے ؎

وہی نگاہ جو رکھتی ہے مست رندوں کو
غضب یہ ہے کہ بڑی محتسب بھی ہوتی ہے

اکبر کے ذہنی رُجحانات

(پروفیسر سید احتشام حسین)

اکبر کی شاعری ادب اور مقصد کے تعلق کی ایک نمایاں اور دل نشیں مثال ہے۔ ان کا مطالعہ خالص فنی نقطۂ نگاہ سے ایک انفرادی مطالعہ ہوگا۔ کیونکہ ابتدائی غزل گوئی کے سوا اکبر نے جو کچھ بھی لکھا ہے۔ وہ اپنی مثال آپ ہے اور جب تک فن اور ٹکنیک کے مطالعہ میں موازنہ اور مقابلہ کی صورت نہ پیدا ہو۔ تنقید کے ایسے اصول اخذ کرنا ناممکن ہو جاتا ہے جو فن کے لوازم کو پیش نظر رکھ کر تیار کئے جائیں۔ اکبر اپنی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری میں منفرد ہیں اس لئے ان کے فنی شعور کی کسوٹی ان شعراء سے مختلف ہوگی جو کسی روایت کے پابند ہو کر مخصوص حدوں کے اندر ہی اپنے خیالوں کی جولانگاہ بناتے ہیں۔ وہ بھی روائیتوں کے پابند تھے۔ لیکن فن اور ٹکنیک میں انھوں نے اپنی روایتیں خود بنائیں۔ معنی کو صورت سے ہم آہنگ کر دیا۔ بھدّے اور نامانوس الفاظ کو خاص جگہوں پر رکھ کر نئے معنی دیئے۔ نئی علامتیں تراش کر اسلوب میں نئی راہیں پیدا کیں، اور "گفتم و شد" کا نعرہ لگا کر "سند" سے پیچھا چھڑا دیا، لیکن ان بتوں کی پرستش سے آزاد نہ ہو سکے جو قدما ان کے لئے ورثے میں چھوڑ گئے تھے۔ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ محض معنی کے پرستار ہیں صورت سے انھیں سروکار نہیں ؎

قاعدوں میں حسنِ معنی گم کرو شعر میں کہتا ہوں ہجے تم کرو

لیکن نہ جانے کتنے شعر ایسے ملیں گے جن میں محض ردیف، قافیہ اور لفظ ہیں "حسنِ معنی" کا کہیں پتہ نہیں۔ فن کا یہ تضاد نتیجہ ہے۔ خیالوں کے تضاد کا، لیکن جس طرح فن میں اکبر نے نئی راہ اور نیا اسلوب اختیار کر کے فن کی خامیوں پر پردہ ڈال دیا اسی طرح خیالات میں بعض حقائق پر غیر معمولی زور دے کر ان کے تضاد کو کمزور بنا دیا۔ موضوع اور اسلوب کے تعلق کا مطالعہ بھی اکبر کی شاعری میں بڑی دلچسپی سے کیا جا سکتا ہے، لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب اکبر کے خیالات کی بنیاد اور تصورات کے سوتے کا پتہ ہو، کیونکہ اکبر نے جو مواد شاعری کے لئے استعمال کیا ہے اردو کے کسی اور شاعر نے ٹھیک اسی شکل میں استعمال نہیں کیا۔ بھدّے اور ان گھڑ واقعات اور خیالات کو شاعرانہ حسن اور جادو کے ساتھ پیش کرنا آسان نہیں تاہم اکبر نے "قیامت روانی کے ساتھ" اسی مواد کو سڈول اور خوبصورت بنا کر شعر کے سانچے میں ڈھال لیا ہے۔ اکبر اپنی ابتدائی شاعری میں رعایت لفظی کے جس گورکھ دھندے میں پھنس گئے تھے وہ اگر سنجیدہ غزل گوئی کے لئے قائم رہتا تو اکبر کا نام تیسرے درجے کے غزل گویوں کے ساتھ لیا جاتا لیکن وہی رعایت لفظی اور ضلع جگت ظریفانہ شاعری میں ان کے کلام کا زیور بن گئے۔ اور انھیں اردو شعرا کی صف اول میں جگہ مل گئی۔ یہاں پھر یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے موضوعات کو ان کے اسلوب اور ٹکنیک نے چمکایا اور ان کے فن میں گرمی اور جان اس مواد کی وجہ سے پیدا ہوئی جو وہ کام میں لائے زندگی ہی کے خزانے سے تو ہر شاعر اپنے جیب و دامن بھرتا ہے۔ لیکن زندگی کو سمجھنے اور اس کو شعر و سخن کے کام میں لانے

کی صلاحیت ہر شاعر میں نہیں ہوتی، کوئی زندگی کے نہاں خانے میں اُتر کر غالب بنتا ہے، کوئی میر کوئی اقبال بنتا ہے کوئی نظیر، کوئی شاہ ظفر بنتا ہے، کوئی ناسخ۔ مواد اور موضوع کے انتخاب اور اس کے سانچے کے انتخاب پر شاعری کی کامیابی اور ناکامی کا انحصار ہے جو ایک شاعر اپنے فنی شعور کی رہنمائی میں اظہار خیال کے لئے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ اسی وجہ سے اکبر کے فن سے پہلے ان کے موضوع کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ جس خام مواد سے دوسرے شعراء نے جہان پھٹک کر خیالی حقائق اخذ کئے اور انھیں فلسفیانہ تصورات اور معتقدات کی شکل میں پیش کیا اسی خام مواد کو اکبر نے خود حقائق بنا کر پیش کر دیا اب یہ کہ وہ ان حقائق کے متعلق کیا زاویۂ نگاہ اختیار کرتے تھے ایک الگ بحث کا محتاج ہے۔

تنقید اگر محض اشعار کے فنی محاسن اور معائب کے شمار کر لینے کا نام نہیں ہے، اگر شعر سن کر محض واہ کر دینے یا منھ بنانے تک محدود نہیں ہے تو یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ شاعر کے دل اور روح تک رسائی حاصل کر لینے کے لئے اس کی ذہنی سیاحت میں اس کا ہم سفر بنا جائے۔ اور ہر خیال کی مادی بنیاد کا پتہ لگایا جائے۔ اسی طرح اس کے فنی شعور کا تجزیہ بھی ہو سکے گا اور اس کے محرکات شعری کا علم بھی۔ یہ بات تنقید کو آسان بھی بناتی ہے اور مشکل بھی، نتائج کے لحاظ سے آسان اور تجزیے کے لحاظ سے مشکل کیونکہ فن اور قدرت بیان کے پردے میں شاعر کا خلوص اس طرح پوشیدہ ہو جاتا ہے کہ جب تک اصل خیالات اور عقائد کا علم نہ ہو شاعر کے روایتی اور حقیقی تصورات میں تمیز کرنا تقریباً ناممکن ہے، پھر تنقید کس چیز کی ہوگی؟ محض لفظوں کے حسنِ استعمال کی، عروض یا نحو کی، صنائع کے برمحل یا بے جا صرف کی؟ یا شاعر کے شعور اور اس کے اظہار کی؟ شاعری کے بنیادی تصورات کا پتہ نہ چلے تو شعر کی معنویت کے متعلق بھی قطعی اور یقینی رائے قائم نہیں کی جا سکتی۔ اکبر کا موادِ شعری ان کے فن سے اتنی گہری مناسبت رکھتا ہے کہ ان کے بعض اہم خیالات کی حقیقت پر نگاہ ڈالنا ان کے فنی شعور کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے؛ خود اکبر نے بھی تو کہا ہے ؎

شعرِ اکبر میں کوئی کشف و کرامات نہیں   دل پہ گذری نہ ہو جو ایسی کوئی بات نہیں

فن اور خلوص کے اس تعلق کو قدماء سے لے کر اس وقت تک کے ناقدین نے مختلف شکلوں میں تسلیم کیا ہے۔ جو چیز شاعری کو ساحری اور بے جان لفظوں کو چلتی ہوئی تلوار بناتی ہے اسے الفاظ میں نہیں۔ شاعر کے دل میں تلاش کرنا چاہئے۔ اپنا اور دوسرے شاعروں کا تقابل کرتے ہوئے انھیں خود اس کا احساس ہوا ہے ؎

وہاں الفاظ خضر رہ ہیں یاں معنی ہیں منزل پر   زباں کا ان کو دعویٰ ہے تو مجھ کو ناز ہے دل پر

اکبر نے الفاظ کو خضر رہ بنا کر بہت سی منزلیں طے کیں، لیکن جس شاعری کی بنا پر ان کی عظمت کا اندازہ لگایا جاتا ہے وہ محض لفظی کرتب نہیں، بلکہ ان کا "خونِ جگر" ہے جو بقول اقبال "سل کو دل" بناتا ہے۔ اس خونِ جگر کا سرمایہ کیا ہے؟ یہ آگ کہاں سے بھڑکتی ہے؟ اظہار خیال کے بنیادی محرکات کیا ہیں؟ اور تصورات کا سرچشمہ کہاں ہے؟ یہ مطالعہ صرف شاعر کے اعترافات اور بیانات کی روشنی میں درست نہیں ہو سکتا، بلکہ خارجی حقائق کے ساتھ ان کی ہم آہنگی اور مسائلِ حیات کے بارے میں شاعر کا رویہ اس کے خیالات کی اصل حقیقت کا پتہ دے گا۔

اکبر ۱۸۴۶ء میں پیدا ہوئے۔ سرسید، حالی، آزاد اور نذیر احمد پیدا ہو چکے تھے، شبلی بارہ سال بعد عالم وجود میں آئے۔ ان بزرگوں کے دور میں، اور خود ان کے ہاتھوں ہندوستان کی ـــ اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی، زندگی میں جو تغیرات ہوئے۔ اکبر کے مطالعہ میں بھی انھیں پیش نظر رکھنا چاہئے، گو اکبر اس کارواں میں نہ تھے۔ جو سرسید کی رہنمائی

میں آگے بڑھ رہا تھا، بلکہ اس کے پُر جوش اور پُر جگر مخالف تھے۔ لیکن جو شخص سرسید اور ان کی تحریکوں کو نظر انداز کرے گا۔ وہ اکبر کو سمجھ ہی نہ سکے گا۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ اکبر صرف ان تحریکوں کے مخالف نہ تھے بلکہ سرسید سے ذاتی مخالفت رکھتے تھے، لیکن اس منفی انداز نظر سے اکبر کی پسندیدگی کا راز معلوم ہوگا۔ موافقت اور مخالفت دونوں سے شعور کی مختلف منزلوں کا سراغ ملتا ہے۔

بہر حال اکبر کے ارتقائے شعور کا دور غیر معمولی کشمکش کا دور ہے اور اکبر نے اس کشمکش کو چھپایا نہیں ہے بلکہ اسے ہر پہلو سے پیش کر دیا ہے، اگر اکبر کی شاعری کا تاریخی حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو مشکل ہی سے عصری تاریخ ہند کا کوئی ایسا واقعہ ہوگا جس کی طرف اشارے نہ مل جائیں، یہی نہیں بلکہ اس کے متعلق اکبر کا ردِ عمل بھی معلوم ہوگا، روز مرہ کے واقعات سے شاید ہی کسی شاعر نے اتنا فائدہ اٹھایا ہو، اور پھر اکبر کی شاعری، واقعات کا سرسری یا سپاٹ بیان نہیں ہے بلکہ اکثر واقعات ان کے تصور زندگی میں منسلک ہو کر کسی بڑے خیال کی ایک کڑی بن جاتے ہیں اور ہم چاہے ان سے متفق ہوں یا نہ ہوں اکبر کے سمجھنے میں وہ ضرور ہماری مدد کرتے ہیں۔

اکبر ایک متوسط مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ گھر کی حالت اچھی نہ تھی اس لئے انھیں شروع ہی سے زندہ رہنے کے لئے جد و جہد کرنا پڑی اور زندگی کے بہت سے تجربے انھوں نے حاصل کئے۔ جب اکبر نے ہوش سنبھالا اسوقت ہندوستان پر باقاعدہ برطانوی اقتدار قائم ہو چکا تھا اور غدر کے مصائب جھیلنے کے بعد مسلمانوں کا وہ طبقہ جس سے وہ وابستہ تھے، انگریز دوستی کو فخر کی نظر سے دیکھنے لگا تھا، اکبر بھی اِدھر اُدھر کے نشیب و فراز دیکھنے کے بعد سرکاری ملازمت اختیار کر چکے تھے اور جوانی کا وہ لاابالی پن جو رقص و سرود کی محفلوں میں چمکا تھا۔ زمانہ شناسی پر مجبور ہو گیا تھا۔ نوکری کے چکر میں پھنس کر آزادی کی قدر ہوئی اور نئی زندگی کے تقاضوں کو دیکھ کر کبھی ماضی میں پناہ لینے کی خواہش پیدا ہوئی اور کبھی ان کے سامنے پسپا ہو جانا پڑا۔

اکبر نے اپنی شاعری کا پہلا دور ۱۸۶۶ء تک قرار دیا ہے۔ اس میں غزل گوئی کا وہ عام رنگ ہے جو لکھنؤ کے رنگ کے نام سے اس زمانے میں ہر دلعزیز ہو رہا تھا۔ اکبر وحید الہ آبادی کے شاگرد تھے اور وحید آتش لکھنوی کے شاگرد رہ چکے تھے۔ اس لئے لکھنؤ کے رنگ میں تصوف کی آمیزش اکبر کے یہاں ملتی ہے۔ اس دور کی شاعری میں مستقبل کے اکبر کا نشان بھی نہ ملتا، اگر بعد میں رعایتِ لفظی سے اکبر نے اتنا فائدہ نہ اٹھایا ہوتا اور صوفیانہ رنگ کو برقرار نہ رکھا ہوتا دوسرا دور چالیس سال کی عمر پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں پہلے دور کا نکھار ہے۔ غزل کے دلکش اشعار ملتے ہیں اور معرفت کا رنگ نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہاں بھی اس جانے پہچانے اکبر کا پتہ نہیں جس نے بعد میں طنز و ظرافت کے تیر و نشتر سے کام لیا۔ اس دور کے اشعار میں کہیں کہیں مزاح کی جھلک ملتی ہے، لیکن وہ ایک طرح کے ہلکے پن کا احساس پیدا کرتے ہیں، اس وقت تک اکبر غزل گوئی کی اس عام راہ پر چل رہے تھے، اور گو وہ اپنے تجربوں کی صداقت کی وجہ سے پُر اثر اشعار بھی نکال لیتے تھے لیکن وہ زندگی کے وسیع خام مواد کو ایک تجربہ کار اور چابکدست فنکار کی طرح استعمال کرنے پر قدرت نہ رکھتے تھے۔ یہ بات یقینی طور پر (کم سے کم مجھے) نہیں معلوم کہ اکبر نے اپنا رنگ کیوں بدلا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ یہ تبدیلی ان کے لئے آبِ حیات بن گئی۔ ۱۸۸۵ء سے انھوں نے باقاعدہ اپنی ظریفانہ شاعری شروع کر دی جو ان کا سرمایۂ افتخار ہے۔

یہاں کچھ دیر ٹھہر کر ان عناصر پر نظر ڈال لینا چاہیے جو ان کی شاعری میں ملتے ہیں اور ان خارجی حقائق کا ایک سرسری خاکہ اپنے سامنے رکھ لینا چاہیے جن سے اکبر کا ذہن اپنی شاعری کے لئے غذا فراہم کرتا تھا۔ غدر کے بعد ہندوستان ایک نیم جاگیردارانہ نیم صنعتی دور میں داخل ہو چکا تھا، متوسط طبقہ کے اندر فرقہ پرستی کا زہر پھیل چکا تھا۔ مسلمان اپنے ماضی کو سینے سے چمٹائے ہوئے وقت کے ساتھ چلنے سے انکار کر رہے تھے۔ اور نئے سرمایہ دارانہ نظام کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے، کچھ لوگ ایسے تھے جو انگریزی حکومت کی سیاسی اور معاشی نوعیت کو نظر انداز کر کے اسے محض ایک عیسائی حکومت سمجھتے تھے۔ بعض دونوں حیثیتوں کو ملا دیتے تھے۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت بڑی تھی جو حکومت اور طاقت کو کھو کر مذہب سے اور زیادہ وابستہ ہو گئے تھے اور انھیں قدیم قدروں کو سدِ راہ بنا کر سارے طوفانِ تغیر کو روک دینا چاہتے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ اگر قدیم اخلاقی اور مذہبی تصورات کو برقرار رکھ کر اپنے روحانی سرمایہ کو محفوظ رکھا جائے تو گئے ہوئے دن پھر واپس آسکتے ہیں، مادی زوال روحانی زوال کا نتیجہ ہے۔ جیسے اچھے دنوں کے بعد برے دن آتے ہیں اسی طرح برے دنوں کے بعد اچھے دن آئیں گے، اور قدرت مسلمانوں کے ساتھ اپنے وعدے کو پورا کرے گی۔ بعض اوقات یہ خیالات بالکل کھوکھلے ہوتے تھے اور محض خیال پرستی پر مبنی، لیکن ان کے پیچھے یہ معاشی تصور بھی کام کرتا رہتا تھا۔ کہ حکومت پھر مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے گی۔ غدر سے پہلے یہ خیال عام تھا۔ غدر کے بعد بڑی حد تک مایوسی میں بدل گیا، کچھ لوگ ماضی اور مستقبل کے درمیان فیصلہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ ماضی اور حال کے درمیان اس کے لئے تاریخی نقطۂ نظر اور سماجی تجزیہ کی ضرورت تھی جو ہندوستان کی پس ماندہ تعلیمی اور علمی حالت نے فراہم نہیں کیا تھا، وقت کی منطق اچھے سے اچھے مفکر کی نگاہوں سے اوجھل تھی اور انھیں بندھے ٹکے قدیم فلسفہ کی روشنی میں حالات کو سمجھنا پڑتا تھا، اس دفعہ جو حالات بدلے تھے۔ وہ اس قدر انقلابی تھے کہ قدیم فلسفہ میں ان کے تجزیہ کے اصول ہی موجود نہ تھے۔ اس لئے شدید کشمکش اور پیچیدگی کا سامنا مسلمان مفکروں کو کرنا پڑا، اکبر کے پاس بھی حال کے سمجھنے کے لئے کوئی معقول علم موجود نہ تھا، وہ کبھی اپنے مشاہدے سے یا کبھی ماضی کی تاریخ سے اور زیادہ تر اپنے وجدان سے کام لیتے تھے اور تغیر کا علم رکھتے ہوئے بھی تغیر کی اصل نوعیت سے واقف نہ تھے۔ ان کے انقلاب کا تصور ایک زوال پذیر صوفی کا تصور تھا جو ذہنی قوت سے اپنے گرد و پیش کی دنیا بدل لینا چاہتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

همیشہ ہوتے یہاں انقلاب ہی دیکھا — بنائے کارِ جہاں کو خراب ہی دیکھا
کہ انقلاب کو بھی انقلاب ہی دیکھا — ہم انقلاب کے شائق نہیں زمانے میں

یہ تو بہت اچھی بات تھی کہ اکبر انقلاب کو بھی ایک متحرک واقعہ تسلیم کرتے تھے لیکن وہ زمانے کو اپنے اندازِ نظر اور اپنی خواہشات کا پابند بنائے رکھنا چاہتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ دنیا جیسی تھی ویسی ہی ہو جائے یا کم سے کم اتنا تو ہو کہ اب کوئی نئی بات اس میں ظہور پذیر نہ ہو۔

اکبر نے ان باتوں کو سمجھنے سمجھانے کے لئے مشرق و مغرب کا ایک میکانکی تصور قائم کر لیا تھا اور زندگی کے ہر شعبے کو انہی کی روشنی میں دیکھ لیتے تھے۔ یہ کہنا تو صحیح نہیں کہ مشرق و مغرب دو جداگانہ تصورات نہیں ہیں، لیکن جب ان سے زندگی کی بدلتی ہوئی رو اور بڑھتے ہوئے دھارے کو روکنے کی کوشش کی جائے تو یہ تصور رجعت پسندانہ اور غیر سائنٹفک بن جاتے ہیں۔ وہ اس بات کے سوا کہ مغرب زیادہ طاقتور ہے اور کسی شکل میں مشرق کے مقابلہ میں اس کی برتری تسلیم کرنے

کے لئے آمادہ نہیں تھے۔ کپلنگ نے سامراجی محرکات کی بنا پر کہا تھا کہ "مشرق مشرق ہے، مغرب مغرب، اور دونوں کبھی ایک نہ ہوسکیں گے" لیکن اکبر اس خوف سے دونوں کو الگ الگ سمجھتے تھے کہ مغرب کی نقل مشرق کی روحانیت کا گلا گھونٹ دے گی اور اگر مذہب نہ رہا تو پھر زندہ رہنے سے کیا فائدہ۔ وہ مغرب کی ہر چیز کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے تھے اور محسوس کرتے تھے کہ جس طرح شیطانی وسوسے انسان کے دل میں جگہ بنا کر اسے ایمان کی راہ سے ہٹا دیتے ہیں اسی طرح آہستہ آہستہ مغرب مشرق کے سینے میں سیاہ داغ ڈال رہا ہے، ان کے قلم میں جتنی طاقت، ان کے الفاظ میں جتنا زہر اور ان کے خیالات میں جتنی گرمی تھی وہ سب صرف کر کے اکبر مشرق کو مغرب سے دور رکھنا چاہتے تھے، اور جو لوگ ان میں کسی قسم کا سمجھوتہ چاہتے تھے اکبر ان کا مذاق اڑاتے تھے ؎

مغربی ذوق ہے اور وضع کی پابندی بھی
اونٹ پر بیٹھ کے تھیٹر کو چلے ہیں حضرت

پیتا ہوں شراب آبِ زمزم کے ساتھ
رکھتا ہوں اک اوٹلی بھی ٹم ٹم کے ساتھ
ہے عشقِ حقیقی و مجازی دونوں
قوال کی بھی صدا ہے چھم چھم کے ساتھ

ان اشعار میں اکبر کا اعتراف شکست بھی ہے۔ انھوں نے مغربی سیلاب کو روکنے کے لئے بہت سے بند باندھے لیکن اس میں رخنے پڑ ہی گئے اور خود انھیں ٹم ٹم کی سواری اختیار کرنا پڑی، اور جس مغربی تعلیم سے وہ اس قدر متنفر تھے اسی کے حاصل کرنے کیلئے عشرت کو لندن بھیجنا پڑا۔ عملی زندگی میں یہ سمجھوتہ ان کے تصور پرست ہونے اور شکست کھانے کا پتہ دیتا ہے۔ اکبر کے لئے مشرق، مذہب، اخلاق، نیکدلی، روحانی پاکیزگی، خودی کا سرچشمہ ہے اور مغرب اس کا عکس اس لئے دونوں کو اکٹھا کرنا اکبر کے خیال میں حقیقتوں سے لڑنا ہے ؎

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ میں تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

اگر غور سے اکبر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ اکبر کی تان ہمیشہ مذہب پر ٹوٹتی ہے۔ ہر چھوٹے سے چھوٹا تغیر انھیں مذہب پر حملہ معلوم ہوتا ہے، کیونکہ مذہب ناقابلِ تغیر حقیقت ہے اور زمانہ کی رفتار تغیر پذیر۔ اسی بات کو سمجھانے کے لئے وہ سیاست، تعلیم، پردہ، سائینس، ارتقا، ایجادات، جھوٹی عزت اور شان کا فریب، مغرب کی نقل، چندہ، کالج، بدھو، جمن، اونٹ، غرضکہ ہر چیز کا تذکرہ کرتے ہیں۔ اکبر کا مذہب، مذہب کی ظاہری پابندی اور تصوف کے امتزاج سے بنا ہے، وہ تصوف سے دلچسپی لیتے تھے لیکن تصوف سے پیدا ہونے والی بے عملی کے مخالف تھے۔ تصوف پر کسی قسم کا حملہ برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ اقبال سے کبیدہ خاطر تھے لیکن ان کا تصوف اسلامی تصوف سے مماثلت رکھتا تھا، حالانکہ وہ حافظ شیرازی کو بھی اسی میں شمار کرتے تھے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر نے تصوف کا علمی مطالعہ نہیں کیا تھا اور نہ عملاً اسے برتا تھا۔ لیکن اسلام سے غیر معمولی محبت رکھنے کی وجہ سے وہ تصوف سے متاثر تھے اور وہاں تک بھی ان کی رسائی محض وجدان کی راہ سے تھی۔ ان کا ایک شعر ہے۔ جسے ہم ان کا اعتراف سمجھ سکتے ہیں ؎

تصوف کے بیاں کو ہوش نے روح آشنا پایا
معانی کچھ نہ سمجھا پر قیامت کا مزا پایا

تصوف کے معنی نہ سمجھا پھر بھی اسے روح آشنا پایا، پوری طرح ان کی تصوف دوستی کا ترجمان ہے۔ ان کے اس عقیدے

کا پتہ ان اشعار سے بھی چلتا ہے۔ جہاں انھوں نے عقل سے کام لینے کی مخالفت کی ہے اور علم کو بے معنی بتایا ہے ؎

عقل کو کچھ نہ ملا علم سے حیرت کے سوا　　دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا
آئے گی تجھ کو نظر صانعِ عالم کی جھلک　　سامنے کچھ نہ رکھو آئینۂ فطرت کے سوا!

کتابِ دل مجھے کافی ہے اکبر درسِ حکمت کو　　میں اسپنسر سے مستغنی ہوں مجھ سے مل نہیں ملتا

یہیں ایک عجیب طرح کا تضاد سامنے آتا ہے، اکبر روزمرہ کی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہوئے ایک حقیقت پسند نظر آتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اردو شعراء کے بہت سے مفروضات کا مذاق اڑاتے ہیں، لیکن جب زندگی کو مجموعی طور پر دیکھنے اور اس کو ترقی کی راہ پر لگانے کا سوال آتا ہے تو وہ عام طور سے محض تصوف پرست رہ جاتے ہیں۔ چند اشعار سے ان کی حقیقت پسندی کا اندازہ ہوگا ؎

میں نے اکبر سا بھی ذہبی نہیں دیکھا کوئی　　کہتا ہے ان کی کمر مجھ کو نظر آتی ہے

مغرب نے خوردبیں سے کمر ان کی دیکھ لی　　مشرق کی شاعری کا مزا کِرکِرا ہوا

کچھ صنعت و حرفت پہ بھی لازم ہے توجہ　　آخر یہ گورنمنٹ سے تنخواہ کہاں تک

عزت ملی ہے شرکتِ کونسل سے شیخ کو　　غازہ ملا گیا ہے رُخِ فاقہ مست پر

ان حقائق پر نظر رکھنے کے باوجود وہ بالکل تصور پرست تھے اور کائنات اور اس کے تغیرات کو بالکل بے حقیقت سمجھتے تھے۔ یہی چیز ان کی حقیقت پسندی اور تیز نگاہی کے باوجود انھیں ان تمام لوگوں سے دور کرتی ہے جو کسی نہ کسی شکل میں تغیر کے قائل تھے اور اپنی جدوجہد سے دنیا میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کا عزم اور حوصلہ رکھتے تھے۔ سرسید اپنی بہت سی کوتاہیوں کے باوجود ایک نئی دنیا کا خواب دیکھ رہے تھے، لیکن اکبر اس ساری بیداری اور زندگی کو محض وقتی ہنگامہ آرائی سمجھتے تھے جو ان کے دور میں تاریخی وجوہ سے طوفانی شکل میں رونما ہوئی تھی ؎

ہرگز نہ مستقل سمجھ اس انقلاب کو　　رکھ راہِ راست بھونکنے دے ان کلاب کو

ہزار سائینس رنگ لائے ہزار قانون ہم بنائیں　　خدا کی قدرت یہی رہے گی ہماری حیرت یہی رہے گی

بحثِ کہن و نو میں سمجھتا نہیں اکبر　　جو ذرّہ ہے موجود وہ ہے روزِ ازل سے

منتشر ذروں کو یکجائی کا جوش آیا تو کیا　　چار دن کے واسطے مٹی کو ہوش آیا تو کیا

یہ اکبر کے بہترین اشعار نہیں ہیں لیکن یہ ان کے خیالات کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں اور ہندوستان کے باہر انقلابات دیکھتے رہتے تھے۔ ان سے ڈرتے تھے، ان کے مقابلے میں ہار مانتے تھے، لیکن یہ یقین رکھتے تھے کہ یہ تمام

باتیں وقتی ہیں، انسان اور دنیا فانی ہے۔ آخر کار بہت کچھ ان کے تصورات کے مطابق ہوگا، ایک طرف انھیں یہ احساس تھا کہ ؎

اس انقلاب کو حیرت سے دیکھتا ہوں میں　　زمانہ کہتا ہے دیکھا کرو ابھی کیا ہے

میں جو روتا ہوں کہ افسوس زمانہ بدلا　　مجھ پہ ہنستا ہے زمانہ کہ تمھیں وہ نہ ہے

وعظ کالج میں جو کہہ آتے ہیں اکثر اکبر　　کیا یہ گرتی ہوئی دیوار کو تھام آتے ہیں

تو دوسری طرف انھیں اپنے عقیدے کی مضبوطی اور پختگی پر ناز تھا ؎

حضرتِ اکبر کے استقلال کا ہوں معترف　　تا بہ مرگ اس پر رہے قائم جو دلمیں ٹھان لی

اکبر کے تصورات کی یہ فلسفیانہ بنیاد ہے، اسی چوکھٹے میں ان کی ساری شاعری بٹھائی جاسکتی ہے اسی کی مدد سے ان کے خیالات کی تہ تک رسائی ہوسکتی ہے، اگر وہ مغرب سے متنفر ہیں تو اسی لئے کہ وہ اپنی تعلیم اور سائنس سے ان تصورات پر ضرب لگاتا ہے جو اکبر کو عزیز تھے، اگر وہ نئی تعلیم سے گھبراتے ہیں تو اس لئے کہ انھوں نے مسجد کی جگہ چھین لی ہے۔ اکبر کے طنز میں جو تلخی ہے وہ حقیقتاً اس بے بسی کی تلخی ہے جو ایک تصور پرست کے یہاں ہوتی ہے، پھر بھی یہی بے بسی انھیں عمل کے میدان سے ہٹادینے پر بھی آمادہ کرتی ہے۔ زمانہ کا رنگ دیکھ کر انھوں نے مسلمانوں کو جو مشورہ دیا وہ ان کے عینیت پسند فلسفہ سے پوری مطابقت رکھتا ہے ؎

رفتار اور سمت میں موج ہوا کی ہے　　اے قصہ گوئے بدر ضرورت چراغ کی ہے

اسی عینیت پسندی نے انھیں ہر قدم پر مذہب کا سہارا لینے کی راہ دکھائی اور اس کو بچانے کے لئے انھوں نے ہر طرف اونچی دیواریں کھڑی کرنے کی کوشش کی تاکہ اسے نقصان نہ پہنچ سکے عملی زندگی میں یہ اس طبقہ کے تحفظ کی تدبیر تھی جس سے خود اکبر کا تعلق تھا۔ وہ انقلاب کے قائل بھی تھے، انقلاب سے گھبراتے بھی تھے۔ انقلاب کی حقیقت سے انکار بھی کرتے تھے، اپنی نگاہوں سے انقلاب کا تماشا بھی دیکھتے تھے اور ان ساری باتوں کو اپنے فلسفۂ خیال سے ہم آہنگ بنا سکتے تھے کیونکہ تصور میں باہر نکل بھاگنے کی کافی گنجائش ہوتی ہے، یہ نہیں ہے کہ اکبر حالات سے واقف نہیں تھے۔ مسلمانوں کی زوال آمادہ تہذیب کا علم نہیں رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت کے معاشی استحصال کا اندازہ نہیں کرسکتے تھے۔ تہذیبوں کی اس ٹکر سے بے خبر تھے جو سیاسی میدان کے باہر تعلیمی دنیا میں ہو رہی تھی۔ یہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی کسی مادی فلسفہ کا سہارا نہ ہونے کی وجہ سے اکبر کوئی اثباتی تجویز پیش نہیں کرسکتے تھے وہ مسلمانوں کے زوال کی جستجو مادی حقائق میں نہیں اخلاقی کمزوریوں میں کرتے تھے، اس لئے وہ گھوم پھر کر داخلی تصورات کی مدد سے خارجی حقائق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ادراکِ حقیقت کا یہ طریقہ رجعت پسندی کی طرف لے جاتا ہے اور انسان کی اجتماعی اور عملی جدوجہد سے فلسفہ اور سائنس کے جو قابل عمل طریقے وجود میں آئے ہیں ان سے نظریں چراتا ہے۔ اکبر کا تصوف بھی اس رجعت پسندی سے آزاد نہیں ہے۔ اس لئے اس میں بھی اس طبقے کے دکھ درد کا علاج نہیں ملتا۔ جس کی ترجمانی وہ کر رہے تھے۔

مشاہدے کی سچائی اور ادراکِ حقیقت کے تضاد کی اتنی دلچسپ مثال اکبر کے سوا شاید اقبال ہی کے یہاں مل سکتی تھی دونوں میں بڑا فرق ہے۔ لیکن کئی حیثیتوں سے اکبر اقبال کے پیشرو ہیں، خودی، مغرب کی نقالی کی مخالفت، علم اور عقل

کے مقابلہ میں وجدان اور عشق کی ترجیح، ملت کا تحفظ، نئی تعلیم کی سطحیت، سماج میں عورت کی جگہ۔ ان تمام مسائل پر غور کرتے ہوئے اقبالؔ اور اکبرؔ کا خیال ساتھ ساتھ آتا ہے۔ مگر یہاں اس تقابلی مطالعہ کا موقع نہیں ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ اکبرؔ کی وہ بنیادی خامی کیا تھی جس کی وجہ سے وہ حقائق کا تصور کرنے کے باوجود نتائج نکالنے میں غلطی کرتے تھے، اس کا جواب گو اوپر کی سطروں میں موجود ہے لیکن اس کو واضح کرنا ضروری ہے۔

اکبرؔ انگریزوں کے غلام ہندوستان میں کیا دیکھتے تھے۔ اس کا تجزیہ کس طرح کرتے تھے، اس سے قومی زندگی میں جو انتشار پیدا ہو رہا تھا اسے کیسا سمجھتے تھے، یہاں کی تہذیب پر جو ضرب کاری لگ رہی تھی اسے کس نظر سے دیکھتے تھے۔ انگریزوں کے تعلیمی نظام کے کھوکھلے پن کو کس طرح ہندوستان کے لئے مضر سمجھتے تھے۔ انگریزی سیاست اور چالبازی کی تہیں کس طرح کھولتے تھے۔ ان کی نقالی میں کیا کیا نقصانات انھیں نظر آتے تھے۔ انگریز ہندوستانیوں کو کھلونے دے دے کر کس طرح بہلاتے تھے، مذہبی اختلاف پیدا کر کے فرقہ پرستی کو کس طرح ہوا دیتے تھے۔ اکبرؔ ان تمام باتوں سے واقف تھے ؎

کر گئی کام نگاہِ بتِ پُرفن کیسا تج چلے دیر و حرم شیخ و برہمن کیسا

انجن آیا نکل گیا زن سے سُن لیا نام آگ پانی کا

بات اتنی اور اس پہ یہ طومار غل ہے یورپ کی جانفشانی کا
علم پورا ہمیں سکھائیں اگر تب کریں شکر مہربانی کا

نئی تعلیم سے کیا واسطہ ہے آدمیت کو جنابِ ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

اب اور چاہیئے نیٹو کے واسطے کیا بات یہی بہت ہے مشرف ہوئے سلام سے ہم

نیشنل وقعت کے گم ہونے کا ہے اکبر کو غم آفیشل عزت کا اسکو کچھ مزا ملتا نہیں

ملک میں مجھ کو ذلیل و خوار رہنے دیجئے آپ اپنی عزت دربار رہنے دیجئے
ٹیمز میں ممکن نہیں نظارۂ موجِ فرات ایسی خواہش کو سمندر پار رہنے دیجئے

پہونچنا داد کو مظلوم کی مشکل ہی ہوتا ہے کبھی قاضی نہیں ملتے کبھی قاتل نہیں ملتا

کیا کہوں اُسکو میں بدبختیِ نیشن کے سوا اِسکو آتا نہیں اب کچھ اِمی ٹیشن کے سوا

یہ بات غلط کہ ملک اسلام ہے ہند — یہ جھوٹ کہ ملک لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش — یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

گولیوں کے زور سے کرتے ہیں وہ دنیا کو ہضم — اس سے بہتر اس غذا کے واسطے چورن نہیں

مغربی کل نے مجھ کو پیسا ہے — میرا چونا ہے اور کلیسا ہے

کونسلوں میں سوال کرنے لگے — قومی طاقت نے جب جواب دیا

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام — یہ نہ ارشاد ہوا آپ سے کیا پھیلا ہے

توپ کھسکی پروفیسر پہونچے — جب بسولا ہٹا تو رندا آیا،

ایسے ہزاروں اشعار اکبر کے دواوین میں مل سکتے ہیں جن میں انگریزی حکومت، طرز حکومت، ان کے غصب العین استحصال، بے انصافی وغیرہ پر سخت تنقید کی گئی ہے، ہندوستانیوں کو نااتفاقی پر لعنت ملامت کی گئی ہے اور اپنی بے بسی کا ماتم کیا گیا ہے ؎

جو میری ہستی تھی مٹ چکی تھی — نہ عقل میری نہ جان میری
ارادہ ان کا دماغ میرا — خیال ان کا زبان میری

سانس لیتے ہوئے بھی ڈرتا ہوں — یہ نہ سمجھیں کہ آہ کرتا ہوں
اتنی آزادی بھی غنیمت ہے — سانس لیتا ہوں بات کرتا ہوں
شیخ صاحب خدا سے ڈرتے ہیں — میں تو انگریزی سے ڈرتا ہوں

اکبر یہ سب کچھ جاننے کے بعد بھی ایسی زنجیروں میں گرفتار ہیں کہ کچھ کہہ نہیں سکتے، انھیں اس کا احساس ہے کہ وہ "مخولۂ گورنمنٹ" ہیں، تاہم اکبر کی تعریف و توصیف میں اتنا کہنا ضروری ہے کہ ان حالات میں کسی دوسرے شاعر کے امکان میں یہ نہیں تھا کہ وہ انگریزی استحصال اور سیاسی چالبازی کا پردہ اس طرح چاک کر سکے اور طنز کے پردوں میں چھپا کر ایسے زہریلے نشتر انگریزوں اور ہندوستانیوں دونوں پر لگائے۔ گو انھوں نے یہ کہا کہ ؎

بتانِ مغربی کی مدح و ذم کی بحث نازک ہے
سکوت اس وقت اولیٰ ہے نہ "یس" کہئے نہ "نو" کہئے

لیکن بڑی جرأت سے یہ بھی کہہ سنایا ؎

جو بات بتائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط بازاری ہے — جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

نہ ہو مذہب میں جب زورِ حکومت　　تو وہ کیا ہے فقط اک فلسفہ ہے

اسلامی حکومت کا خیال بھی اس اندازِ ذکر کا لازمی نتیجہ کہا جا سکتا ہے جو اکبرؔ کے یہاں پایا جاتا ہے۔ مغرب اور اسکی تمام خصوصیات سے نفرت، سائینس اور ارتقا کا خوف، سب کی بنیادیں ایک ہی ہیں۔ وہ ہر موقع پر انھیں کمتر کر کے دکھاتے ہیں تا کہ مشرق، بلکہ اسلام کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ کی برتری کا نقش روشن ہو سکے، ایسے موقع پر ان کی اپیل مذہبی جذبات ہی سے زیادہ ہوتی ہے، کیونکہ اسی لنگر کے سہارے اکبر کی کشتی ٹھہری ہوئی ہے اور مخالف ہوائیں اسے ڈانوا ڈول کر رہی ہیں ؎

نئی تہذیب میں وقت زیادہ تو نہیں ہوتی　　مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا　　ذہن کو تپ آگئی، مذہب کو فالج ہو گیا

اکبر کی نگاہیں وہ سب کچھ دیکھ سکتی ہیں جو ہونے والا ہے، اور وہ ہواؤں کے رُخ کو پہچانتے ہیں، لیکن ان کا مقابلہ کرنے کے لئے کھڑے ہوئے ہیں اور پھر یہ مقابلہ بھی محض خیال کی دنیا میں ہوتا ہے اور وہ ذہن میں سمجھوتہ کر کے فتح کے خیال سے خوش ہو لیتے ہیں، یہ اشعار دیکھئے ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے　　نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی　　نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے　　نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ ملت سے　　نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلیدِ مغرب کے　　مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال و سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی　　لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں　　زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب کے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا　　ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے

تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہو گے نہ ہم ہوں گے

یہ پوری غزل یا نظم ایک تفصیلی تبصرہ چاہتی ہے کیونکہ اس میں تغیرؔ کے احساس کی تصویر کشی کے ساتھ ساتھ اس سے آنکھیں چرانے اور مقابلے سے بچنے کے احساس کا بیان بھی ہے، لیکن اس کی گنجائش نہیں، عمر کے ساتھ ساتھ اکبرؔ کے یہاں مایوسی، غم، خواہش مرگ، بے ثباتیِ دنیا، طاعتِ حق، عقبیٰ، قناعت وغیرہ کے خیالات بڑھتے گئے ہیں۔ سیاسی طنز، مشرق مغرب کے جھگڑے کم ہوتے گئے ہیں اور نوبت یہاں تک پہونچی ہے کہ انھیں ماضی بھی مشکوک نظر آنے لگا ہے ؎

پرانی روشنی میں اور نئی میں فرق ہے اتنا　　انھیں کشتی نہیں ملتی انھیں ساحل نہیں ملتا

وہ اس شکل میں سمجھوتے پر بھی رضا مند ہو گئے ؎

قائم یہی بوٹ اور موزا رکھئے　　دل کو مشتاقِ مس ڈی سوزا رکھئے
ان باتوں پہ معترض نہ ہوگا کوئی　　پڑھئے جو نماز اور روزہ رکھئے

اکبر کا ذہن جس نا آسودگی کا شکار تھا وہ جذباتی تھی ۔ مغرب سے آئی ہوئی ہر چیز کے مقابلہ نے انھیں اور ان کے مقصد کو کمزور بنا دیا۔ وہ ٹائپ کے حرف اور پائپ کے پانی ، ٹم ٹم اور بائیسکل ، ریل اور انجن ہر چیز کی شکایت پر اتر آئے، اور گو انھوں نے ہندوستان کو مغرب کی کھوکھلی اور غلامانہ نقالی سے بچانے کے لئے مبلّغانہ انداز میں بڑا کام کیا لیکن اس دھن میں انھوں نے مغربی علوم اور سائنس کی مخالفت کرکے ہندوستان پر معاشی ترقی اور نئے سیاسی شعور کے دروازے بند کرنے کی کوشش کی ۔ ان کا طبقاتی شعور ایک تصور پرست کا شعور تھا ، ان کے خیالوں میں حقیقت کی آمیزش تھی ۔ لیکن بنے بنائے عقائد کے نیچے دبی ہوئی تھی ، اکبر کا فن ان کے خلوص اور جوش کی وجہ سے غیر معمولی قوت رکھتا ہے ، اور اس کی بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی انفرادی آسودگی کے لئے نہیں ، بلکہ جماعتی آسودگی کے لئے اسے استعمال کر رہے تھے۔ حالانکہ جماعتی مفاد کا مادی تصور نہ ہونے کی وجہ سے وہ عملاً صرف ان کی انفرادی آسودگی تک محدود رہ جاتا تھا ، یہی تضاد انھیں ناکامی اور شکست کا احساس دلاتا ہے جس کی تہ تک وہ نہ پہونچ سکے ۔ اکبر کی شاعری اور فن کا مطالعہ انیسویں صدی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے ابتدائی بیس سالوں کے سمجھنے میں بہت معاون ہوگا۔ اور ان کا کلام خاص کر مسلمان خواص اور متوسط طبقہ کی بے بسی اور ذہنی کیفیت کا ترجمان بن کر اس دور کی معاشی اور تہذیبی کشمکش کا اندازہ لگانے میں بڑی مدد کرے گا ۔

اکبر کی شوخ نگاری اور درسِ اخلاق

(پروفیسر اویس احمد ادیب - ایم - اے)

اکبر نے جب اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں قدم رکھا تو ان کے شعور میں بھی یہ بات نہ تھی کہ قدرت ان سے اور ان کی شاعری سے وہ کام لینے والی ہے جو معلم اخلاق سے لیا جاتا ہے۔ شاعری کا آغاز وہی زلف و کاکل اور گل و بلبل کی داستانوں سے کیا مگر جلد ہی انھوں نے قدرت کی منشا اور اپنی طبیعت کے اقتضا کو سمجھ لیا اور ایک نیا راستہ نکال لیا۔ مطالعہ اور مشاہدہ نے ماضی کے آئینہ میں مسلمانانِ عالم کی سطوت کے بلند پایہ مناظر دکھائے۔ زمانۂ حال نے ان کی پستی کا خوفناک منظر پیش کیا اور مستقبل نے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ حالت اُس قعرِ مذلت میں پیش کی جس کو وہ خود اپنی حرکتوں سے اور زیادہ عمیق بنا رہے تھے۔

وہ بلندی اور یہ پستی اکبر نے دیکھی۔ قوم کی زبوں حالی پر وہ دل گرفتہ ہوئے ان کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ ایک معمولی انسان کی آنکھوں کی طرح نہیں دیکھا۔ ان دردناک مناظر کو دیکھ کر انھوں نے اپنے دل پر اثرات مرتب کئے۔ قوم کے مستقبل پر غور کیا۔ جذبات پراگندہ ہونے لگے، مگر انھوں نے ان میں ایک نظم پیدا کیا۔ زبانِ قلم اظہارِ جذبات کے لئے بے چین ہوگئی ــــــ اس وقت اگر وہ اپنے تخیل کی کارفرمائیوں سے مغلوب ہو جاتے تو ان کا کلام بے اعتدالیوں کا گلزار بن جاتا اور اکبر ایک معلمِ اخلاق ہونے کے بجائے ایک مرثیہ گو ہو کر رہ جاتے۔

اکبر نے محسوس کر لیا تھا کہ اگر وہ اس زبوں حالی کا مرثیہ کہیں گے تو مسلمانوں کی پستی کی وجہ سے ان پر اس کا کوئی اثر نہ ہوگا۔ اس لئے انھوں نے نہ تو فریاد کی اور نہ آہ و بکا۔ وہ جانتے تھے کہ "یہ خود کردہ" ہے مگر اس کا علاج ممکن ہے وہ "علاج نیست" کے قائل نہ تھے۔ وہ یہ تسلیم ہی نہ کرتے تھے کہ بجھتی ہوئی شمع "تیز لو" دے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ اس پر ایمان رکھتے تھے کہ "مردہ قالب میں بھی زندگی کی روح پھونکی جاسکتی ہے ــ" پھر قوم کے مردہ قالب کو کس طرح چھوڑا جاسکتا تھا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ خدا شناس تھے اور ایک عارف کی حیثیت سے بہت بلند مرتبہ رکھتے تھے۔ مگر وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کے قائل نہ تھے۔ قوم کی پستی اور مذموم حالت کو "خدا کی مصلحت" کہہ کر نہیں چھوڑا بلکہ اس سوز و گداز اور درد و تکلیف سے جو قوم کی حالت دیکھ کر ان کے دل میں پیدا ہوئی انھوں نے قوم کے مختلف رجحانات کو تعلیمات اسلام کے مطابق تبدیل کرنے کا عہد کیا اور اپنے منشا میں ایک بہت بڑی حد تک کامیاب بھی ہوئے۔

اکبر اور دوسرے شعرا میں ایک نمایاں فرق تھا اور وہ یہ کہ بعض شعرا تو "قوم کا مرثیہ" لکھ کر خاموش ہوگئے۔ بعض نے اس حالت کا نقشہ پیش کر کے اپنے آپ کو مطمئن کر لیا۔ "اطمینان اور وہ بھی قوم کی طرف سے اکبر کو زندگی بھر حاصل

نہ ہو سکا۔ ان کا طریقۂ کار دوسروں کے طریقۂ کار سے مختلف تھا۔ وہ "شاعری" کی قوت سے واقف تھے۔ ان کے سامنے وہ انقلابات موجود تھے جو ایک شاعر اپنے کلام سے عکاظ کے بازار میں عوام کے دلوں میں پیدا کر دیا کرتا تھا۔ اس وجہ سے انھوں نے اِس "دردِ دل" اور سوزشِ مسلسل کے اظہار کے لئے کسی "فرضی معشوق" کا انتخاب نہیں کیا۔ اظہارِ جذبات کے لئے بالواسطہ طریقہ بھی منتخب نہیں کیا بلکہ بلاواسطہ طور پر قوم کے مرض کی تشخیص کر کے اس کی دکھتی ہوئی رگوں پر ایسی لطیف ضربیں لگائیں کہ خود بخود اس کی خرابیاں دور ہونے لگیں۔

اُردو کے بعض شعراء نے قوم کی اصلاح کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ انھوں نے شکایت روزگار میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دئے۔ کچھ نے خود رو کر، دوسروں کے رلانے میں قوم کی فلاح و بہبود دیکھی۔ بعض نے فلکِ کج رفتار کو بُرا بھلا کہا مگر اکبر نے ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔ اِس ہنسی میں قوم کے زوال کی مکمل داستان پوشیدہ ہوتی، مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کے انھوں نے قصیدے بھی نہیں گائے اور محیر العقل اور مافوق العادت باتیں کہہ کر قوم کے ذہن میں ارتعاش بھی پیدا نہیں کیا۔

اکبر کے ماہرِ اخلاقیات ہونے میں کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ انھوں نے اپنی تمام تر شاعری کی بنیادیں "اخلاق" پر استوار کی ہیں۔ ان کے مکمل کلام کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مسلمانوں میں اخلاقی پستی نہ آتی تو وہ ہرگز ہرگز غلام ہو کر قعرِ مذلت میں نہ گرتے ان کے نزدیک حقوق و فرائض کی ادائیگی کا نام اخلاق تھا اور مسلمان انکی ادائیگی سے بیگانہ ہو چکے تھے۔ اس بیگانگی نے ان سے اسلامی اخلاق چھینا اور وہ اس نظامِ زندگی سے محروم ہو گئے جو انھیں مسلمان کی حیثیت سے حاصل ہونا چاہئے تھی۔ زندگی کے نظم سے محروم ہونے کے بعد وہ غلامی کے شکار ہوئے اور وہ خوشی اور خوش حالی جو ان کے قدم چومتی تھی ان سے رخصت ہو گئی۔

معلّمینِ اخلاق مختلف گروہ میں منقسم کئے جا سکتے ہیں۔ اول وہ جنھوں نے اپنی اخلاقی تعلیم کی بنیادیں "آخرت کی زندگی" پر رکھیں، دوسرے وہ جنھوں نے انسانی عقل اور فلسفہ کو اپنی تعلیم کا ماخذ قرار دیا۔ اکبر نے اپنی تعلیم "احکام خداوندی" کے تابع کی۔ وہ اخلاقی اصول جو پیغمبر اسلامؐ نے مسلمانوں کو بتائے تھے اور جن پر عمل پیرا ہو کر مسلمانوں کے قدم استقلال میں کبھی جنبش نہیں آنے پائی وہ قانون اکبر نے یوں پیش کیا ہے ؎

ارشادِ لاجواب تو قرآن ہی کا ہے   قانونِ بے مثال تو رحمان ہی کا ہے

پھل پھول پتیوں پہ ہے تیری نظر نثار   جڑ پر نظر نہیں ہے کہ جس کی ہے سب بہار

اگر بنیادی طور پر اسلام کی اخلاقی تعلیم پر مسلمان عمل پیرا رہتے تو انھیں وہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا جس کی طرف اکبر نے اشارات کئے ہیں۔ مسلمانوں نے عقلی دلائل پر اس تعلیم کی بنیادیں استوار کرنا چاہیں، حالانکہ ان کو یہ معلوم ہے کہ تعلیماتِ اسلام اس قدر جامع اور مکمل ہیں کہ ان میں نہ بحث و تکرار کی گنجائش ہے اور نہ عقلی حکمتوں کی۔ اسلامی اخلاق، اسلامی آداب، اسلامی معاشرت کی جگہ "مغربی اخلاق"، مغربی آداب اور مغربی معاشرت نے لے لی تھی۔ اکبر نے اس وقت کی حالت یوں پیش کی ہے ؎

مذہب کو لیا بحث میں تو سر ٹوٹا   چاہی اپنی اصلاح تو خدا ہی چھوٹا

شکوہ ہم غیر کا کریں کیا اکبر اپنوں ہی نے ہم کو ہر طرح سے لوٹا

مسلمانوں نے ایک دوسرے کو ذلیل کرنے اور اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے ناجائز طریقے اختیار کئے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ اس ابتری کے دور میں نفسا نفسی پڑی ہوئی تھی، اتفاق، یگانگت اور اتحاد سب بے معنی الفاظ ہو چکے تھے ؎

عزیز لڑتے ہیں آپس میں یہ ستم کیا ہے خدا کی مار ہے دونوں کی مار کم کیا ہے

اکبر کو یہ افراتفری بہت زیادہ پریشان کئے ہوئے تھی۔ انھوں نے اسی موضوع کو دوسری دھن میں یوں پیش کیا ہے ؎

قوم کے دل میں کھوٹ ہے پیدا اچھے اچھے ہیں ووٹ کے شیدا
بھائی بھائی میں ہاتھا پائی
سیلف گورنمنٹ آگے آئی

یہ تھی وہ کیفیتِ اتحاد ـــــ یہ انقلاب محض مغربی تعلیم کا نتیجہ تھا کیونکہ مغرب کا اصول یہی تھا کہ ان کی ایک قومیت ایک مذہب اور ایک برادری کے پرزے بکھیر دو۔ وہ خود ایک دوسرے کے دشمن ہو کر کمزور پڑ جائیں گے اور پھر ان میں سے ہر ایک فرنگی تہذیب و تمدن کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کرے گا مگر وہ سہارا کمزور ترین سہارا ہوگا۔ وہ سہارا اسے کسی قابل نہیں رکھے گا۔ وہ نظم و انتظام جسے اسلام نے قوم کی زندگی بتایا ہے۔ مغربی نظم و انتظام پر قربان کر دیا جائے گا۔ اس طرح ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ شیرازہ بندی کے لئے مغربی تعلیم کو پیش کیا گیا "علم" کو ہر درد کی دوا سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ علم مسلمان قوم کے لئے زہر ثابت ہوا۔ اس نے ضبط، خودداری، بلند ہمت اور وسعتِ نظری، صداقت و حق پرستی اور قناعت و ایثار جیسی بے بہا چیزیں اس سے چھین لیں۔ اسے عیاشی اور نفس پرستی کا سبق اسی سے ملا۔ وہ ظلمت اور ضلالت کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ گیا۔ اس تعلیم کے متعلق اکبر نے اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا ہے ؎

حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

یا

یہ بات تو کھری ہے ہرگز نہیں ہے کھوٹی عربی میں نظم ملت۔ بی۔ اے میں صرف روٹی
لیکن جناب لیڈر یہ شعر سن کے بولے بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے موٹی

اس تعلیم نے قوم میں نئی خصوصیات پیدا کر دیں اور وہ تھیں حرصِ مال و زر، طلبِ دنیا اور جاہ و حشمت۔ وہ ان کے غلام ہو گئے۔ قوم کی ذہنیت بدلی اور اس طرح بدلی ؎

پھرتے ہیں تذکرۂ کالج و اسکول کے ساتھ خیر مقدم ہے ہمارا اُڈیر اور پھول کے ساتھ
معترض گر نہیں دینے کے کبھی بھول کے ساتھ مستقل چال میں ہم اپنی ہیں معمول کے ساتھ
عمر گزری ہے اسی بزم کی اطراری میں دوسری پشت ہے چندے کی طلبگاری میں

اس تعلیم سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اکبر کی زبان سے سنئے ؎

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے بی۔ اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

اس طرح مسلمان نئی تہذیب اور نئے تمدن کے گرویدہ ہو گئے۔ اکبر اس تہذیب نو کے بارے میں یوں لکھتے ہیں ؎

تہذیب نو جسے تم کہتے ہو اس سے اکبر دنیا بگڑ رہی ہے اب یا سنور رہی ہے
نقشوں کو تم نہ جانچو خلقت سے مل کے دیکھو کیا ہو رہا ہے آخر کیسی گذر رہی ہے

قوم کی زندگی میں جو ارتعاش پیدا ہوا اس سے اکبر نے یہ محسوس کیا کہ مسلمان خواتین کی عزت زیادہ کرنے لگے ہیں۔ عورت، جو مرد کا سرمایہ تصور کی جاتی تھی۔ جس کو مسلمانوں نے غلام بنا رکھا تھا۔ جس کو مردوں کے ساز کی لے پر ناچنا پڑتا تھا اب بدل گئی۔ اس نے تعلیم حاصل کی مگر ایک دوسرے انداز میں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اکبر خواتین کی تعلیم اور آزادی کے خلاف تھے۔ نہیں۔ وہ اس تعلیم کے خلاف تھے جو اسے غلط راستے پر ڈال سکتی تھی۔ وہ اس آزادی کے خلاف تھے جو اسے بے عصمتی۔ بے حجابی اور خیا سوزی کے مناظر پر لے آنے والی تھی۔ اکبر تعلیم نسواں کے حامی ہیں ؎

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

یا پھر ان کا یہ شعر ؎

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

عورتوں کی تعلیمی ضرورت پر دلالت کرتا ہے۔ مگر وہ تعلیم کیسی ہو۔ یہ ایک زبردست سوال ہے۔ اکبر نے مختلف اشعار میں اس کو یوں پیش کیا ہے ؎

نئی تہذیب کی عزت میں کہاں دین کی قید بے حجابی جو ہو اس میں تو قباحت کیا ہے

یا یہ شعر ؎

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

دراصل اکبر عورت کو "کاغذی پھول" بنا کر اسے ذریعۂ آرائشِ انجمن بنانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ اعتدال پسند تھے۔ وہ عورتوں کو عضو معطل کی حیثیت سے بھی دیکھنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ وہ ان کو اسلامی تعلیم سے آراستہ کر کے انھیں مسلمان مردوں کا معاون بنانا چاہتے تھے۔ وہ ان میں مشرقی عناصر کے ساتھ مشرقی تعلیم کی برکات دیکھنا چاہتے تھے۔ اعتدال سے بڑھ جانے کے نتائج انھوں نے یوں پیش کئے ہیں ؎

حد سے جو بڑھ گیا تو ہے اس کا عمل خراب آج اس کا خوش نما ہے مگر ہو گا کل خراب

اکبر نے جو کچھ دیکھا۔ وہ زبان بندی کے باوجود زبان پر لے آئے آپ بھی اُن کی زبانی سنئے ؎

خامشی سے نہ تعلق ہے نہ تمکین کا ذوق اب حسینوں میں بھی پاتا ہوں میں اسپیچ کا شوق
شانِ سابق سے یہ مایوس ہوئے جاتے ہیں بت جو تھے دیر میں ناقوس ہوئے جاتے ہیں

اور سچ تو یہ ہے کہ ؎

شیطاں نے ترکیب تنزل یہ نکالی ان لوگوں کو تم شوقِ ترقی کا دلا دو

صرف مردوں ہی میں نہیں بلکہ عورتوں میں بھی انگریزی رسم و رواج، انگریزی طرز بود و باش، انگریزی وضع قطع انگریزی فلسفہ۔ انگریزی قانون۔ غرض از سر تا پا۔ انگریزیت، مسلمانوں پر غالب نظر آنے لگی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں انتشار اور اضطراب پیدا ہو گیا اور طمع حرص و ہوا، ریاکاری، اوباشی۔ بدچلنی۔ خوشامد اور حسد سب اس قوم کے اجتماعی کردار کا جزو اعظم

بن گئے۔ بدچلنی کے سلسلہ میں اعلیٰ طبقہ کے افراد کا کردار یوں پیش کیا ہے ؎

پا کر خطاب ناچ کا بھی ذوق ہو گیا　　سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

اسلام کے اخلاقی نظام میں "آداب" کا بہت بڑا درجہ ہے۔ فضائلِ اخلاق میں اپنے آپ کو تعلیماتِ اسلام کے مطابق سنوارنا ضروری ہے۔ مجلسی آداب بھی روز مرہ کی .... زندگی میں مدِنظر رکھنا ضروری ہیں۔ اکبر اپنی قوم میں اُن کی تلاش کرتے ہیں تو مایوس ہو کر یوں گویا ہوتے ہیں ؎

ملت کا ادب اٹھ گیا جس قوم کے دل سے　　اقبال کی سمت اس نے کبھی راہ نہ پائی

ایک جگہ پر ملت کی وضاحت کی ہے ؎

اسلام ہی کو بس اپنی ملت سمجھو　　بے گانہ روش میں اپنی ذلت سمجھو

اکبر قوم کی خرابیوں پر صرف تنقید کر کے خاموش نہیں ہو گئے وہ انھیں مشورہ دینے کے علاوہ میدانِ عمل بھی دکھلاتے ہیں ؎

اعمال کے حُسن سے سنورنا سیکھو　　اللہ سے نیک امید کرنا سیکھو
مرنے سے مفر نہیں ہے جب اے اکبر　　بہتر ہے یہی خوشی سے مرنا سیکھو

اور یہ صرف اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ؎

خاطر مضبوط، دل توانا رکھو　　امید اچھی خیال اچھا رکھو
ہو جائیں گی مشکلیں تمھاری آساں　　اللہ پر بھروسا رکھو

کلمۂ توحید پر ایمان رکھنے والا کبھی ذلیل و خوار، مایوس اور دل شکستہ نہیں ہو سکتا۔ اِس ایمانی قوت سے اسے غیر معمولی تسکین اور قوت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھروسہ مومن میں صحیح اسلامی شان پیدا کر دیتا ہے۔ اُولو العزمی اور استقلال دونوں اس کے قدم چومنے لگتے ہیں۔ بساطِ سیاست کے ماہرین بھی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ مذہبی اخلاق سے جب کبھی سیاسی کانٹوں نے گستاخی کی تو اکبر کے جذبات اور خیالات میں ایک طوفان پیدا ہو جاتا تھا اور وہ مغربی سیاست پر ایسا کاری وار کرتے تھے کہ اس کی تمام طنابیں کٹ جاتی تھیں۔ اشاعتِ اسلام پر مغرب زدہ لوگوں نے "زورِ شمشیر" کا رنگ چڑھایا۔ اکبر نے اس کا جواب یوں دیا ؎

یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام　　یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

اکبر نے ایک جگہ کہا ہے ؎

وہ اس کو محوِ کلیسا بنا کے چھوڑیں گے　　اس اونٹ کو خرِ عیسیٰ بنا کے چھوڑیں گے

انگریزوں نے جب مسلمانوں میں انتشار پیدا کر کے ان کو کمزور کر دیا تو انھوں نے ہندوؤں کو ان کے خلاف ابھارا۔ ______ ہندو جو دوبارہ طاقت اور حصول حکومت کے خواہاں تھے ان کی سیاسی چالوں کا شکار ہو کر اس ٹکراؤ کے لئے تیار ہو گئے۔ اکبر نے ان کو یوں آگاہ کیا تھا ؎

تم ملو یا نہ ملو مجھ سے ملو یا نہ ملو　　ساتھ رہنا ہے اسی ملک میں اے ہم وطنو
اہلِ مغرب سے بھی کہتا ہوں مبارک ہو یہ قد　　آسماں تنگ ہو تم پر مگر اتنا نہ تنو

اکبر نے اس اسلامی اخلاقی تعلیم کو ظرافت، زندہ دلی، شوخ نگاری اور لطیفہ گوئی سے زندۂ جاوید بنا دیا۔ اس تعلیم کو جدید انداز میں پیش کرنے کے لئے نئے الفاظ تلاش کئے۔ لطفِ زبان کو قائم رکھا اور تراکیب کی ندرت کو فنا نہ ہونے دیا۔ انھوں نے کسی مخصوص طبقہ کا اس تعلیم کے لئے انتخاب نہیں کیا۔ بلکہ امیر و غریب، عالم و جاہل۔ رند و پارسا سب کو لطیف اشارات کے ساتھ ہدایات دیں۔ انھوں نے شوخ نگاری کے تحت بہت سی نئی مصطلحات استعمال کیں۔ مثلاً سیّد صاحب۔ مس۔ صنم۔ حرم۔ کالج۔ برہمن۔ اللہ۔ کلیسا۔ اونٹ۔ گائے۔ وغیرہ وغیرہ سے خاص خاص باتیں مراد لیں۔ اس طرح اکبر نے اپنی شاعری کے لئے نئی لغت تیار کی اور اس کے لئے ایک نیا اور وسیع میدان تیار کیا، ظریفانہ کلام کے تحت اکبر نے مسلمانوں کے پست اخلاق پر جو طنز کئے ہیں، وہ کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کئے جا سکتے، کیونکہ ان کی ظرافت کے پردے میں کوئی نہ کوئی اخلاقی تعلیم ضرور مدِ نظر رہتی تھی۔

معلّمِ اخلاق کی حیثیت سے اکبر نے دوسرے شعراء سے اپنا یوں مقابلہ کیا ہے ؎

میں اپنے آپ میں، ان شاعروں میں فرق پاتا ہوں — سخن اُن سے سنورتا ہے سخن سے میں سنورتا ہوں

ایک اور مقام پر اکبر نے اپنی اسلامی اخلاقی تعلیم اور اپنی شاعری کے مقصد کی وضاحت کر کے اپنے آپ کو دنیا کے بہترین معلّمینِ اخلاق میں یوں شامل کیا ہے ؎

تنخواہ کے لئے ہے نہ ہے واہ کے لئے — ہے میری شاعری دلِ آگاہ کے لئے
ہے یہ دعا کہ ترکِ فضولی نصیب ہو — جو کچھ کہوں وہ ہو فقط اللہ کے لئے

کیا اکبر تنگ نظر تھے؟

(سلیم احمد)

اکبر تنگ نظر تھے۔ نیک نیتی کے باوجود انکے دل میں وسعت نہ تھی۔ اس لئے انھوں نے "جدید" کی کوتاہیوں اور خامیوں کمزوریوں اور لغزشوں پر نکتہ چینی کی۔ اس کی خوبیوں کا اعتراف نہ کیا۔ ان کے مزاج میں جذباتیت تھی حقیقت پسندی نہ تھی۔ اس لئے انھیں ماضی سے عقیدت اور لگاؤ تھا اور حال سے نفرت اور بیزاری ۔ وہ تغیر کو، زندگی کی تبدیلیوں کو۔ مستقبل اور اس کے امکانات کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اس سے آگے بڑھنے والوں کا مذاق اڑا کر رہ گئے۔ ان کی رہنمائی نہ کر سکے — لیکن اس سب کے باوجود وہ "لسان العصر" تھے اور قبول خاطر اور لطف سخن، میں ان کا کوئی حریف نہ تھا۔ اور یہ چیزیں خداداد ہونے کے ساتھ اپنے پیچھے کچھ اسباب اور کچھ وجوہ رکھتی ہیں۔ خدا کسی کو موت بھی بغیر بہانے کے نہیں دیتا۔

اکبر کو مقبولیت حاصل نہ ہوئی ہوتی، زندگی نے آگے بڑھنے والے سماج نے انھیں رد کر دیا ہوتا، تو بھی میں ذاتی پسند کے بل بوتے پر اکبر کی تعریف کرتا۔ مگر اب تو میری قوم اور میری تہذیب کی طرف سے بھی مجھ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ میں اس کے مزاج، اسکی اجتماعی پسند اور ناپسند کی توجیہہ اور تاویل کروں، اسے معنی پہناؤں ——— یہ مختصر سا مضمون اسی فرض کی ادائیگی ہے۔ ممکن ہے اِس میں سائنٹفک حقیقت نگاری کی کمی محسوس ہو۔ مجھے اس کا دعویٰ بھی نہیں — میں انسان کے خیال، فکر، احساس اور جذبہ کے حسن اور قوت کو دیکھتا ہوں، ورنہ سائنٹفک حقیقت تو اتنی سی ہے کہ آدمی بھی حیوان ہے۔ جسے دوسرے حیوانوں کی طرح چارہ اور ہم جنس کی صحبت کی ضرورت ہوتی ہے اور بس — باقی سب کچھ تو بھرے پیٹ کی ڈکار ہے۔

اکبر تنگ نظر ضرور تھے۔ مگر اپنی عام زندگی میں نہیں۔ عام زندگی میں وہ بڑے صلح کل، رواداراور غیر متعصب تھے۔ تنگ نظری کا سب سے بڑا پردہ پوش مذہب ہے۔ اور مذہب میں بقول سکینہ "اکبر وسیع النظر موحد تھے" اور مذہب و ملت کے جزوی اختلافات کو در خور اعتنا و خیال نہ کرتے تھے۔ ان میں جدید سے بھی تعصب نہ تھا۔ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ خود جج تھے۔ خان بہادر تھے۔ فیلو آف الٰہ آباد یونیورسٹی تھے۔ ان کی اولاد نے کالج میں تعلیم پائی۔ عشرت حسین انگلینڈ گئے اور کلکٹر ہوئے۔ اکبر کی تنگ نظری اخلاقی، مذہبی اور سیاسی نہ تھی۔ اس کی نوعیت کچھ اور ہے۔

پہلی قابلِ غور بات یہ ہے کہ اکبر طنز نگار شاعر تھے اور طنز نگاری کے لئے "تنگ نظری" غالباً اتنی ہی ضروری ہے جتنی تنقید کے لئے خشک دماغی یا اخبار نویسی کے لئے ابتذال — طنز نگار زندگی کو — انسان کو — ایک وسیع النظر فلسفی، ایک وسیع القلب شاعر کی طرح جوں کا توں قبول نہیں کر سکتا۔ اگر اسے زندگی کے ادھورے پن اور انسان کے نامکمل ہونے کا احساس نہ ہو۔ اگر وہ زندگی کے۔ مقدس شعلہ، کی حمد و ثنا میں یہ بھول جائے کہ انسان کو، موت میں پیدا ہوتا ہے۔ اگر وہ انسان کی عظمت اور حسن کی تعریف

ہیں یہ فراموش کردے کر بڑے بڑے جوان رعنا کھوسٹ بڈھے بن جاتے ہیں۔ مرجاتے ہیں۔ تو وہ پیغمبری سے لے کر لیڈری تک دنیا کا ہر کام کرسکتا ہے ـــــ طنز نگاری نہیں کرسکتا ـــــ طنز نگار کے لئے اتنی تنگ نظری ضروری ہے کہ وہ زندگی کو لو الانسان کو اس کی موجودہ حالت میں مکمل نہ سمجھے۔ اس کی تمام فتوحات کے باوجود ناقابلِ شکست نہ خیال کرے۔ اکبر انھیں معنوں میں تنگ نظر تھے۔ اکبر کی تنگ نظری عام آدمیوں کی تنگ نظری ہوتی تو وہ کسی مسجد کے پیش امام، کسی مکتب کے معلم ہوتے ـــــ خان بہادر اور لسان العصر نہ ہوتے۔

اکبر کی تمام ظرافت، طنز، تمسخر اور استہزا کا رُخ اجتماعی حرکت کے بے ڈھنگے پن کی طرف ہے۔ افراد کی طرف نہیں وہ اس زندگی کو جو ان کے سامنے بے تکے پن سے بکھری پڑی تھی، جس میں اکڑفوں تھی، ڈینگ تھی۔ ترقی کے نعرے تھے ـــــ ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تزک بھڑک تھی، کمتری کا احساس تھا، مرعوبیت تھی اور ان سب کے چھپانے کے لئے ہزار طرح کی خود فریبیاں تھیں ـــــ اس معاشرت کو جس کا پرانا نظام درہم برہم ہوچکا تھا، جس کی تمام روایات اور رسومات ٹوٹ چکی تھیں جس کے پاؤں کے نیچے سے زمین سرک چکی تھی اور جو توازن برقرار رکھنے یا نیا توازن پیدا کرنے کے لئے خلا میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی، کسی طرح قبول نہیں کرسکتے تھے ـــــ اجتماعی زندگی کی یہی بے ربطی، انتشار اور بے تکا پن ان کی شاعری کا موضوع ہے ـــــ اس موضوع کے ہزار ہا پہلو ہیں اور اکبر نے اُس کے ہر پہلو کو سیکڑوں زاویوں سے دیکھا اور دکھایا ہے ؎

ان کی بیوی نے فقط اسکول ہی کی بات کی　　　یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے　　　اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے

پوچھا میں نے کہ تیرا مذہب کیا ہے　　　کہنے لگا اِس سے تیرا مطلب کیا ہے
میں نے یہ کہا کہ غول بندی کے لئے　　　بولا کہ شکست کھاچکے، اب کیا ہے

پہن لے سایہ مری جاں اتار کر شلوار　　　زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز

کمالِ محنت سے پڑھ رہے ہیں، کمالِ غیرت سے بڑھ رہے ہیں　　　سوار مشرق کی راہ میں ہیں تو مغربی راہ میں پیادے

قومی ترقی کی رادھا پیاری　　　بیٹھی ہیں پہنے جوڑا بھاری
قومی تیل کی فکر ہے طاری　　　چندے کی تحصیل ہے جاری

جمع ہیں ممبر بھولے بھالے　　　جاڑوں کا موسم، بھولے بھالے
آنکھیں پھاڑے دانت نکالے　　　چندہ دے کر پھنسنے والے

بعض ہیں بادہ و جام کے خواہاں بعض نمود و نام کے خواہاں
بعض فقط آرام کے خواہاں کم ہیں فیضِ عام کے خواہاں

ہندو تنتے ہیں تھام کر گنگے کی سینگ آغا گرمی دکھاتے ہیں پیچ کر ہیٹنگ
لیکن حضرت کو ہے یہ کس چیز پہ ناز کالج میں ڈٹے ہوئے اڑاتے ہیں جوڈینگ

ہیں عمل اچھے مگر دروازۂ جنت ہے بند کر چکے ہیں پاس لیکن نوکری ملتی نہیں

گو بہت اونچی ہے پروازِ حریف شیخ بھی کچھ کم نہیں ہیں جمپ میں
ان کا طوطی بولتا ہے عرش پر اپنا مرغا بولتا ہے کمپ میں

اکبر مزاج کے اعتبار سے جزرس اور تفصیل بیں آدمی تھے۔ وہ زندگی کی حرکت کو، اس کے تغیر کو خارجی مظاہر کی روشنی میں دیکھتے تھے، حرکت اور تغیر کے فلسفیانہ پہلو سے انھیں زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ مذہب بھی ان کے یہاں حقائق فلسفہ کا نام نہیں بلکہ ان رسوم و روایات کا جو مذہب کی روح نے پیدا کیں اور جن کے بغیر کوئی عقیدہ، کوئی نظریہ یا خیال خارجی زندگی میں اپنی نمود نہیں کر سکتا۔ اکبر کے یہاں پردہ اور اسی قسم کے دوسرے موضوعات کی کثرت بھی ان کی اسی تفصیل بینی کا نتیجہ ہے۔ یہ تفصیل بینی اور جزرسی جو ان کے مزاج اور شاعری کا ایک اہم جزو ہے۔ ان کی بدنامی کا باعث بھی ہوئی ہے۔ اسی سے ان کے ناقدوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں میں پھنس کے رہ گئے ہیں۔ زندگی اور زمانہ کی ان گہری، دوررس اور عظیم تبدیلیوں کو نہ سمجھ سکے جو ہندوستان میں صنعتی انقلاب کے ظہور سے پیدا ہو رہی تھیں۔ انھوں نے عورتوں اور مردوں کی بے راہ روی۔ ان کی مغرب زدگی سطحیت، شہرت طلبی، تن آسانی، مذہب سے بے پروائی اور معاشرتی احساسِ کمتری کا اس طرح ذکر کیا ہے کہ اس سے "نئے ہندوستان" کی یک رخی تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ہم ان باتوں میں پھنس کر اس ترقی کو بھول جاتے ہیں جو ان سب باتوں کے باوجود ہندوستان کی معاشرتی اور تہذیبی زندگی میں واقع ہو رہی تھی۔ لیکن ایک طنز نگار کی حیثیت سے اکبر کے لئے یہ تفصیل بینی انتہائی ضروری تھی۔ اکبر زندگی کو "فلسفیانہ حقائق" اور "سائنٹفک کلیوں" کی روشنی میں دیکھتے تو ممکن ہے وہ ہمارے ناقدوں کے مطالبات کو پورا کر دیتے لیکن پھر طنز نگار شاعر نہ ہو سکتے تھے۔ اکبر کی طرح حالی بھی جو نئی زندگی اور اس کی فتوحات اور برکات کے بہت بڑے مبلغوں میں سمجھے جاتے ہیں۔ جب اس زندگی کے قابلِ اعتراض حصوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں تو انھیں بھی اسی تفصیل بینی سے کام لینا پڑتا ہے اور وہ بھی اکبر کی طرح جزئی چیزوں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ "پولیٹیکل اسپیچیں"۔ "فیشن کی تعریف"۔ "ایک کالے اور گورے کی صحت کا میڈیکل امتحان" "رفارم کی حد"۔ اور "جھوٹی نمائش"۔ ان کی اسی قسم کی منظومات ہیں۔

حالی کی ان نظموں کا انداز اکبر کی طنزیہ شاعری سے بہت ملتا جلتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ حالی کی اس قسم کی شاعری ان کے مزاج سے ہم آہنگ نہ ہونے کے باعث ناکام شاعری ہے۔ اس میں وہ لطف اور مزا وہ کاٹ اور "بھرپور"

دار نہیں، جو اکبر کے اشعار میں ہے، ورنہ اس کا موضوع، اس کی تفصیل اور جزرسی، بالکل وہی ہے جو اکبر کی شاعری میں ہے۔ حالی اکبر کے معتقد نہ تھے، ان کی نظر چھوٹی چھوٹی جزئی باتوں میں محدود رہ جانے والی بھی نہ تھی۔ اُن میں اکبر کی سی "تنگ نظری" اور "کم نگاہی" نہ تھی۔ پھر اپنی "راست بینی، اصول پرستی اور ہموار طبیعت" کے باوجود، انکی شاعری کے اس حصہ میں یہ رنگ کیوں پیدا ہو جاتا ہے؟ ——— دوسرے اس سوال کا جو بھی جواب دیں۔ میرے نزدیک اس کی وجہ طنزیہ شاعری کے مطالبات ہیں۔ ورنہ حالی اور خود اکبر جب نئی زندگی، نئی معاشرت، اور نئے ہندوستان سے متعلق غیر طنزیہ شاعری کرتے ہیں تو ان کا لب و لہجہ بالکل دوسرا ہوتا ہے ——— اور عجیب بات ہے کہ اس میں بھی انتہا درجہ کی مماثلت ہے۔ حالی کے ایک قصیدے کے اشعار ہیں جو انھوں نے "جشن جوبلی" کے موقع پر لکھا تھا۔

جمشید پہ جب آگ ہوئی سنگ سے ظاہر ایراں میں کیا جشن سدہ اُس نے مقرر
اس عہد ہمایوں میں ہزار ایسے کرشمے ظاہر ہوئے اس طرح کہ عقلیں ہوئیں ششدر
یہ جشن مبارک ہے بہت جشن سدہ سے وہ آگ نکلنے کا یہ بجھنے کا ہے مظہر
اس دور خجستہ میں وہ سب بجھ گئے شعلے تھی جن کی جہاں سوز لپٹ آگ سے بڑھ کر
اس عہد نے وہ خون بھرے ہاتھ کئے قطع جو پھیرتے تھے بیٹیوں کے حلق پہ خنجر
اس عہد نے کی آ کے غلاموں کی حمایت انساں کو نہ سمجھا کسی انسان سے کمتر
دی اس نے مٹا ہند سے یوں رسم ستی کی گویا کہ ستی ہو گئی وہ عہد کہن پر
نابود کیا اس نے زمانے سے ٹھگی کو اک قہر تھا اللہ کا جو نوع بشر پر

اور اکبر بھی ایک اسی طرح کے قصیدے میں لکھتے ہیں ؎

ہزاروں مدرسے قائم ہوئے ہیں سیکڑوں کالج جہاں فکر ارسطو بھی بس اک طفل دبستاں ہے
جہاں چلتا نہ تھا کچھ زور واں اب ریل چلتی ہے میسر خاکساروں کو بھی اب تخت سلیماں ہے
نہ کچھ کھٹکا ہے چوروں کا نہ قزاقوں کی دہشت ہے رواں بے زحمت خوف و خطر ہر سمت انساں ہے
تجارت کی بھی ایسی ہو رہی ہے گرم بازاری کہ سامان معیشت جنس دل سے بھی اب ارزاں ہے
طلسم تازہ دیکھا کارخانہ تار برقی کا زبان تار پر وہ بات ہے جو دل میں پنہاں ہے
رعایا کے حقوق اب ہر طرح محفوظ رہتے ہیں اِدھر قانون حامی ہے اُدھر حاکم نگہباں ہے

یہ ضرور ہے کہ اکبر کے اس قسم کے اشعار ان کی کامیاب شاعری کے نمونے نہیں، ان میں وہ لطف اور کیفیت نہیں ہے جو ان کی طنزیہ شاعری میں ہے اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ اکبر کی شاعری کا اصلی محرک اجتماعی زندگی کے انتشار بے ربطی اور بے ڈھنگے پن کا احساس ہے اور اُن کی کامیاب شاعری وہی ہے، جس میں یہ احساس اپنا اظہار کرتا ہے۔ عہد جدید کی "فتوحات" کے متعلق انھوں نے صرف ضرورتاً شاعری کی ہے۔ اور ضرورت ایجاد کی ماں ہو تو ہو، شاعری کو نہیں جنم دے سکتی ——— لیکن اکبر کے ساتھ ساتھ حالی کے بھی اس قسم کے اشعار کچھ ایسے زیادہ کامیاب نہیں ہیں حالی اپنی نثر میں اپنی عام زندگی میں "جدید" کے کتنے ہی بڑے مبلغ رہے ہوں، لیکن ان کی اصل شاعری ان کی غزلوں میں ہے۔ یا مسدس کے ان حصوں میں، جہاں وہ اسلام کی گذشتہ "فتوحات" اور "ماضی" کی عظمت کا نقشہ کھینچتے ہیں

اس کے ساتھ "برکھارت" اور "مناجات بیوہ" قسم کی دو چار نظموں کو اور شامل کر لیجئے۔ باقی سب کچھ محض خانہ پُری ہے ـــ حالی نے نئی زندگی کی فتوحات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اتنا ہی بے جان اور پھسپھسا ہے، جتنی اکبر کی تحریریں ـــ اس سلسلہ میں یہ بات بھی کچھ کم قابلِ غور نہیں ہے کہ اکبر کی طرح حالی کی بھی ان نظموں کا تقریباً تمام حصہ کسی نہ کسی وقتی ضرورت کے ماتحت لکھا گیا ہے۔ کبھی "جشن جوبلی" کے لئے۔ کبھی ایجوکیشنل کانفرنس کے لئے ـــ اور وقتی ضرورت اور مصلحت کے وقت کسی چیز کے متعلق تعریفی بیان تو دیا جا سکتا ہے۔ شاعری نہیں کی جا سکتی۔

حالی اور اکبر کا موازنہ میرا موضوع نہیں ہے۔ لیکن اس بحث سے غالباً یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اگر اکبر کی شاعری عہدِ جدید کی فتوحات پر روشنی نہیں ڈالتی تو اس کی وجہ ان کی تنگ نظری اور جزئیات پرستی نہ تھی ـــ بلکہ طنزیہ شاعری کے مطالبات ـــ ورنہ جب وہ عہدِ جدید کے متعلق طنزیہ شاعری کرتے ہوں، تو ان کی اور حالی کی نظموں میں کوئی فرق نہیں رہتا ہے۔

(ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی)
(صدر شعبۂ فارسی و اردو، ڈھاکا یونیورسٹی)

تعلیم انسان کے لئے جتنی ضروری ہے اتنی ہی خطرناک بھی۔ اس کے مفید اور مضر ہونے کا انحصار محض اسی بات پر نہیں کہ تعلیم دی کیسے جاتی ہے بلکہ اس پر بھی ہے کہ نصاب کیا اور کیسا ہے، اور معلمین کس پائے یا رتبے کے ہیں، اساتذہ کی اخلاقی حالت کیسی اور کس قسم کی ہے، ان کا مطمعِ نظر اور طریق فکر و کار کیا ہے۔ انھیں اپنے مضامین سے جنھیں وہ پڑھاتے ہیں ہمدردی بھی ہے یا نہیں۔ ہے تو کتنی اور نہیں ہے تو کس حد تک؟

پہلا زمانہ کچھ اور تھا۔ موجودہ زمانہ کچھ اور ہے۔ زمانہ بدلا، زمانے کے مطالبات بدلے اور ان دونوں نے مل جل کر خود ہمیں بھی بڑی حد تک بدل ڈالا۔

تعلیم جو کبھی "مقصد" تھی، اب "حصول مقصد" کا ذریعہ بن گئی یا بنالی گئی ہے پہلے علم، علم کی خاطر سیکھا اور سکھایا جاتا تھا، اب پیٹ اور پیٹ کی خاطر اس کی پناہ کالی جانے لگی ہے۔

فطرت تغیر پسند ہے، تغیر کے بغیر زندگی کا تصور، جو حرکت سے عبارت ہے ناممکن ہے "تغیر" کا مفہوم "ارتقاء" کے مفہوم سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ ارتقا سے تغیر کا ایک ہی رُخ (روشن) ذہنوں میں آتا ہے۔ تغیر سے روشن اور تاریک دونوں "تغیر" حرکت کے دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے۔ حرکت کا رُخ اگر عروج کی طرف ہے، یا یوں کہہ لیجئے کہ حرکت "مائل بہ خیر" ہے تو ارتقا ہے، ورنہ تنزل، انحطاط، اور پھر موت، بدقسمتی سے آج "حرکت" کو ہی، چاہے وہ مائل بہ شر ہی کیوں نہ ہو "ارتقا" سمجھا جانے لگا ہے۔

یہ سچ ہے کہ آگے بڑھنے والا پیچھے کی طرف مڑ کر نہیں دیکھتا اور دیکھنے کی بظاہر اسے ضرورت بھی نہیں ہوتی، لیکن اگر کبھی کبھار ایک نظر دیکھ لیا کرے تو اس میں سچ پوچھئے تو اس کا فائدہ ہے۔ نقصان بالکل نہیں۔

ماضی کی زیادہ گہرائیوں میں اترنے کی ضرورت نہیں۔ صرف ۱۸۵۷ء اور اس کے فوراً بعد کے زمانہ پر نظر رکھئے اور یاد کیجئے کہ اپنوں میں سے صرف ایک سر سید نے ہمارے آپ کے لئے ملک اور قوم کے لئے۔ اسلام اور مسلمانوں کے لئے کیا کیا کچھ نہیں کیا، اور ایسے وقت میں کیا جب بقول مولانا حالی مسلمانوں پر "عجیب وقت پڑا تھا۔"

یہ وہ زمانہ تھا جب امیدوں کے سارے دیئے تیل کو ترس رہے تھے، مایوسیوں کی گرفت مسلمانوں پر روز بروز مضبوط تر ہوتی جا رہی تھی، حوصلے پست، ارادے مضمحل، قویٰ مفلوج، جیبیں خالی۔ ملک، مال، حکومت اور اقتدار تو جا ہی چکے تھے۔ ایک "مذہب" رہ گیا تھا، اس پر بھی ہر طرف سے یورشیں تھیں اور بظاہر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اب اس کی بھی خیر نہیں۔

مسلمان، حملوں کو دیکھ رہے تھے، حملہ آوروں کو دیکھ رہے تھے۔ ان حربوں اور ہتھیاروں کو بھی دیکھ رہے تھے جن سے "ایران تثلیث لیس" تھے لیکن کرتے دھرتے کچھ نہ بن پڑتا تھا۔ کیونکہ غفلت اور لاعلمی کے سبب سے جب انھیں اپنے اسلحہ خانوں تک کا علم نہ تھا تو وہ یہ کیسے جان سکتے تھے کہ ان میں نہ صرف مدافعت کا پورا پورا سامان موجود ہے۔ بلکہ ایسے ہتھیار بھی ناپید نہیں جن کی مدد سے حملہ آوروں کو منہ توڑ جواب دیا جا سکتا ہے۔ کیسا بھیانک تھا یہ وقت؟ اس کا اندازہ حالی کے ان چار مصرعوں سے ہی لگایا جا سکتا ہے:۔

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

کیا یہ دعاؤں کا وقت نہ تھا؟ اور کیا حالی ہی کی وہ نظم جس کا پہلا شعر یہ ہے:۔

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے — امّت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

ایک فریاد بہ دامن درخواست نہیں جسے حالی نے برصغیر کے سارے مسلمانوں کی طرف سے "دعاؤں کے لئے" "خاتم المرسلین" کی بارگاہِ نبوت میں بروقت پیش کر کے سعادتِ دارین حاصل کر لی۔

تباہی اور بربادی کے اس منجدھار میں، مسلمانوں کی ٹوٹی ہوئی کشتی کی ناخدائی کے لئے مشیئت نے سرسید کو منتخب کیا، اور سرسید، عواقب اور نتائج کی پروا کئے بغیر اس فرض کی ادائیگی میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ بے خلوص، نیک نیتی اور قوت ارادی کا کرشمہ نہ کہئے تو اور کیا کہئے کہ مخالفت کی ہر لہر جس نے اس کوہِ گراں سے ٹکر لینے کی کوشش کی، پاش پاش ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور وہ قطب اپنی جگہ سے نہ ہٹنا تھا، نہ ہٹا۔

مسلمانوں میں مغربی تعلیم پھیلانے کا احساس سب سے پہلے سرسید کو ہوا۔ کیوں ہوا؟ اس کے وجوہ یوں تو بہت ہیں، لیکن ان میں سے ایک جو بڑی اہم ہے اور جس کے بغیر سرسید کی اصلاحی کوششوں کو صحیح طور پر سمجھنا آسان نہیں رہ جاتا یہ ہے:۔

وہ دیکھ رہے تھے کہ حاکم اور محکوم کے درمیان نفرت کی جو خلیج بری طرح حاصل ہو گئی ہے وہ اگر بروقت پر نہ کر دی گئی تو مسلمانوں کے لئے انتہائی مہلک ثابت ہوگی، اور وہ معاشی اعتبار سے بھی کہیں کے نہ رہیں گے۔

اس خلیج کو پاٹنے کی صرف ایک ہی صورت تھی، اور وہ یہ تھی کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر آمادہ کیا جائے، سرسید کو اس بات کا یقین تھا کہ اس طریق کار سے اگر ایک طرف انگریزوں سے مسلمانوں کی بھڑک (جو نا جائز اور بلا وجہ کی ہرگز نہ تھی) دور ہو جائے گی تو دوسری طرف انھیں یہ فائدہ پہنچے گا کہ وہ ہمسایہ قوموں سے پیچھے نہ رہیں گے۔

نو گرفتارانِ قفس پھڑ پھڑائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ لیکن پھڑ پھڑانے اور تیلیوں سے سر ٹکرانے میں نقصان کس کا تھا؟ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ برصغیر کی غیر مسلم قومیں بھی، جہاں تک انگریزوں کی غلامی کا تعلق ہے، بظاہر مسلمانوں کی ہم قسمت انھیں جیسی تھیں۔ لیکن غور کیجئے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ ان دونوں کی حالت ہرگز یکساں نہ تھی۔ مسلمان نئے نئے غلام ہوئے تھے۔ دوسری قومیں پہلے سے غلام تھیں۔ ایک کی اسیری نئی تھی، دوسرے کی پرانی، جن کی پرانی تھی وہ اس کے خوگر ہو چکے تھے، جن کی نئی تھی انھیں قرار نہ تھا۔ یہ بے قراری ان کے حق میں مضر ہی نہ تھی، خطرناک بھی تھی۔ سرسید کی دوربیں نگاہوں نے اس خطرے کو سب سے پہلے دیکھا اور چونکہ انھیں مسلمانوں کی من حیث القوم ناتوانی اور انگریزوں کی غیر معمولی توانائی کا پوری طرح احساس تھا۔ اس لئے انھیں مسلمانوں کی فلاح اسی میں نظر آئی اور صحیح نظر آئی کہ ان کے جوش و خروش اور غم و غصہ کو ہر ممکن طریقے سے اعتدال پر لایا جائے۔

سر سید نے اپنی تدبیروں اور انتھک کوششوں سے مسلمانوں کے دلوں سے "شکست کا غصہ" اور انگریزوں کے دماغوں سے "فتح کا نشہ" بیک وقت دور کرنے کی کوشش کی اور چونکہ یہ کوشش پر خلوص تھی۔ اپنے لئے نہیں اپنوں کے لئے تھی، رائیگاں نہیں گئی۔ کام آئی اور وہ ہزار مخالفتوں کے باوجود کامیاب اور سُرخرو ہوئے۔

آج حالی کے یہ فرمودات:

"اگرچہ ہماری قوم میں بڑے بڑے اولوالعزم بادشاہ، بڑے بڑے دانشمند وزیر اور بڑے بڑے بہادر سپہ سالار گزرے ہیں مگر ان کے حالات اس کٹھن منزل میں جو ہم کو اور ہماری نسلوں کو در پیش ہے۔ براہ راست کچھ رہبری نہیں کر سکتے ہم کو دنیا میں اب محکوم بن کر رہنا ہے اور اس لئے وہ لیاقتیں جو سلطنت اور کشور کشائی کے لئے درکار ہیں ہمارے لئے بے سود ہوں گی، ہمارے اسلاف میں علما، حکما، اور مصنفین کی بھی کچھ کمی نہیں، مگر وہ بھی آج ہمارے لئے قابل تقلید نمونے نہیں بن سکتے۔ ان کو خدا نے اس وقت پیدا کیا تھا کہ علم اور لوگوں کا کام ہے اور باورچی گری اور لوگوں کا۔ مگر ہمارے زمانے میں دونوں کام ایک ہی شخص کو کرنے پڑتے ہیں ...... ہمارے عرفاء اور مشائخ کی پاکیزہ زندگی بھی ہم دنیا داروں کی موجودہ حالت سے کچھ مناسبت نہیں رکھتی۔ وہ ہم کو اپنے اپنے قدح کی خیر منانی سکھاتی ہے۔ مگر ہماری خیر اب اسی میں ہے کہ سب مل کر ایک دوسرے کی خیر منائیں"[1]

کتنے ہی ناگوار کیوں نہ معلوم ہوں اور ان کو غلامانہ ذہنیت کی پیداوار، محکومی اور بزدلی کی یادگار، شکست کھائی ہوئی روح کی آواز اور ان کے علاوہ اور بھی جو کچھ جی میں آئے کہہ لیں۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں اور کیا اس سے انکار ممکن ہے کہ انھیں کی بدولت آئی بلائیں ٹل نہیں گئیں تو ان کی شدتیں کم اور تباہ کاریاں مدھم پڑ گئیں اور اس طرح ان کے مہلک اثرات سے جو یقیناً جان لیوا ثابت ہوتے۔ مسلمان اس سرزمین پر محفوظ رہے۔ بچ گئے۔

انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون کی تعلیم، ترویج اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کرنے کی جو انتھک کوشش سر سید نے کی وہ محض اس وجہ سے نہ تھی کہ وہ حاکموں کی زبان اور ان کے علوم وفنون تھے، بلکہ یہ بات بھی ان کے پیش نظر تھی کہ انھیں کی بدولت انگریز اس قابل ہوئے کہ ہماری سرزمین پر اپنی حکومت اور اقتدار کا سکّہ چلا سکیں۔

ظاہر ہے کہ جس چیز پر زور دینا مقصود ہوتا ہے، اسے فہرست میں سب سے اوپر جگہ دینی پڑتی ہے۔ سر سید کو وقت کی ضرورت کے پیش نظر انگریزی زبان اور مغربی علوم وفنون پر زور دینا مقصود تھا، اس لئے لازمی تھا کہ وہ اپنی تعلیمی اسکیم میں انھیں علوم و فنون کی تعلیم کو سر فہرست رکھتے جن کی تحصیل ان کے نزدیک مسلمانوں کو قعرِ مذلت سے نکالنے کا واحد اور آخری ذریعہ تھی۔ اس لئے سر سید پر یہ اعتراض کہ انھوں نے مشرقی علوم وفنون (فارسی اور عربی تعلیم) کو ثانوی درجہ دے کر ان کی ضرورت اور اہمیت سے انکار کیا ہے یا انھیں گھٹانے کی کوشش کی ہے، کسی طرح بھی مناسب نہیں۔ سر سید جیسے دور بیں اور حقیقت شناس سے اس بات کی توقع ہرگز نہیں کی جا سکتی کہ وہ انگریزی تعلیم کے مضر اثرات سے قطعاً ناواقف تھے۔ یہ دوسری بات ہے کہ انھوں نے اپنی اس واقفیت کا برملا اظہار مناسب نہ سمجھا۔ مصلحت بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔

یہ وہ وقت تھا جب مسلمان ہی خستہ اور شکستہ حال نہ تھے، بلکہ ان کا مذہب بھی خطرات سے گھرا ہوا تھا اور اس پر بھی چاروں طرف

---

[1] دیباچہ حیات جاوید (طبع اول، شائع کردہ اکاڈمی پنجاب۔ لاہور) ص ۹۳

سے یورشیں تھیں۔ عیسائی مشنری حکومت کی شہ پاکر تدلیس اور غلط بیانیوں سے اسلام کا چہرہ مسخ کر رہے تھے، اور کوئی ایسا نہ تھا جو ان کی افتراپردازیوں کا پردہ چاک کر سکتا۔ حضور اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شان میں گستاخیاں ہو رہی تھیں اور کسی میں اتنی سکت اور حوصلہ نہ تھا کہ ان بہتان باندھنے والوں کی زبانیں بند کر سکتا۔ "سچ" کو ایسی چپ لگ گئی تھی کہ جھوٹ کو جھوٹ کہنا اس کے لئے دشوار تھا

اسلام اس وقت جن خطروں سے دوچار تھا ان کی تفصیل مولانا حالی کی زبان سے سنتے چلئے۔

پہلا خطرہ:۔ ہندوستان میں اسلام تین خطروں میں گھرا ہوا تھا۔ ایک طرف مشنری اس کی گھات میں لگے ہوئے تھے (اگرچہ قحط کے دوران میں ان کو دبلا پتلا شکار پیٹ بھر کو مل جاتا تھا مگر وہ اس پر قانع نہ تھے اور ہمیشہ صید فربہ کی تلاش میں رہتے تھے) ہندوستان میں سب سے زیادہ ان کا دانت مسلمانوں پر تھا۔ اور اس کے لئے ان کی منادیوں میں ان کے اخباروں میں اور ان کے رسالوں میں زیادہ تر بوچھاڑ اسلام پر ہوتی تھی (اسلام کی تعلیم کی طرح طرح برائیاں ظاہر کرتے تھے، بانیِ اسلام کے اخلاق و عادات پر انواع و اقسام کی نکتہ چینیاں کرتے تھے۔ چنانچہ سب سے پہلے مسلمان کچھ ناواقفیت اور بے علمی کے سبب ان کے دام میں آ گئے۔ اس خطرے سے بلاشبہ بعض علمائے اسلام جیسے مولانا رحمت اللہ مرحوم اور مولوی آل حسن اور ڈاکٹر وزیر خان متنبہ ہوئے۔ انھوں نے متعدد کتابیں عیسائیوں کے مقابلے میں لکھیں اور ان سے بالمشافہ مناظرے کئے جس سے یقیناً مسلمانوں کو بہت فائدہ ہوا، لیکن اس کا اثر مسلمانوں تک ہی محدود رہا۔ عیسائیوں کی غلط فہمیاں جو اسلام کی نسبت قدیم سے چلی آتی تھیں، وہ بدستور قائم رہیں)

دوسرا خطرہ:۔ دوسرا خطرہ جو پہلے سے زیادہ خوفناک تھا وہ مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت سے علاقہ رکھتا تھا، اوّل تو مسلمان اس نظر سے کہ ہندوستان کی سلطنت، انگلش قوم نے مسلمانوں سے لی تھی ہمیشہ حکمران قوم کی نگاہوں میں کھٹکتے تھے۔ دوسرے بسبب ان غلط فہمیوں کے جو یورپ کی عام عیسائی قوموں میں اسلام کی نسبت پھیلی ہوئی تھیں، انگریز مسلمانوں کے مذہب کو بغی و فساد کا سرچشمہ اور امن و عافیت کا دشمن خیال کرتے تھے۔

تیسرا خطرہ:۔ تیسرا خطرہ خاص کر مذہبِ اسلام کو انگریزی تعلیم کی طرف سے تھا۔ جو روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جا رہی تھی۔ اور جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا (اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا ابھرنا محال ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ سرسید کو خود ان میں تعلیم پھیلانی پڑی۔ حالانکہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ سے بہت زیادہ اندیشہ ناک تھے[۵]

یہ سب ہی خطرات تھے۔ اور اسلام اور مسلمانوں کے لئے بے انتہا خطرناک بلکہ مہلک۔ سرسید ان سے بے خبر نہ تھے۔ وہ انھیں جانتے تھے اور عام نہاد جاننے والوں سے کچھ زیادہ ہی جانتے تھے لیکن خطروں کا سمجھ لینا ہی کوئی بڑا کارنامہ نہیں۔ بڑا کارنامہ ان کا تدارک ہے۔ مولانا حالی کے گنائے ہوئے پہلے دو خطروں کی روک تھام کے لئے تیسرا خطرہ مول لینا ضروری تھا۔ کیونکہ حصول مقصد کی اس کے سوا اور کوئی صورت ہی نہ تھی۔ سرسید نے یہ خطرہ مول لیا ـــــ دانستہ مول لیا اور کون کہہ سکتا ہے کہ حالات کے دیکھتے ہوئے ان کا یہ اقدام غلط تھا۔ سرسید سے واقعی اگر کوئی چوک ہوئی ہے تو وہ یہ کہ انھوں نے ہم پر اور ہماری صلاحیتوں پر غیر معمولی اعتماد کیا۔ انھیں اس بات کا یقین تھا کہ پہلے دو خطرے ٹل گئے تو تیسرے سے چھٹکارا پا لینا کچھ مشکل نہ ہوگا۔ لیکن نئی پود جیسے مہدی الافادی نے "تہذیب الاخلاق کی پروردہ نسل" اور بابائے اردو مولوی عبدالحق مرحوم

---

۵ حیات جاوید صفحہ ۳۹۰-۳۸۹ (لاہور ایڈیشن)

نے "نقالوں کا طائفہ" کہا ہے۔ اس اعتماد کی اہل ثابت نہ ہو سکی۔ اور اس پر ترقی کا بھوت کچھ اس طرح سوار ہو گیا کہ اسے اس بات کا احساس تک نہ رہا کہ "توازن اور اعتدال" بھی کوئی چیز ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ انگریزی سے زیادہ "انگریزیت" میں مبتلا ہو گئی، اور اس بری طرح ہوئی کہ اپنی ہر چیز حقیر و ذلیل نظر آنے لگی۔ اس مغرب زدگی کے .... اندازے کے لئے شاید یہی اقتباس کافی ہو:

"سرسید کی غرض یہ تھی کہ باہم میل جول (انگریزوں سے) اور ربط ضبط بڑھے، باہمی نفرت اور بدگمانی رفع ہو اور ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہوں۔ ان کا منشا تھا کہ ہمارا تعلق انگریزوں سے حاکمانہ نہیں دوستانہ ہونا چاہیئے۔ اس خیال سے انھوں نے لباس میں تبدیلی کی اور انگریزی طرز معاشرت اختیار کی۔ جہاں تک میں نے انھیں دیکھا، ان میں انگریزی طرز معاشرت معمولی تھی۔ کھانا وہ بیشک میز پر کھاتے تھے اور حسب ضرورت چھری کانٹا بھی استعمال کرتے تھے لیکن کھانا ان کا ہندوستانی ہوتا تھا۔ وہی کھانا جو عموماً مسلمان شرفا کے ہاں کھایا جاتا تھا۔ گھر میں وہ کرتہ، پاجامہ، (غرارہ) پہنے کام کرتے رہتے تھے۔ کالج میں جب کبھی تعلیم کا کام دیکھنے آتے تھے تو ایک عباسی اوڑھ لیتے تھے، البتہ جلسوں میں پتلون ترکی ٹوپی اور ترکی کوٹ پہن کر آتے تھے۔ کوٹھی بھی ان کی فرش و فرنیچر سے کوئی زیادہ آراستہ نہ تھی۔ مگر ان کے بعض پیرووں نے اس معاملہ میں بڑا غلو کیا۔ اس میں پیش پیش نواب محسن الملک تھے، حیدر آباد میں کوئی ان کا ٹھاٹھ دیکھتا۔ فرنیچر انگلینڈ سے لائے تو اس کے رکھ رکھاؤ اور صفائی کے لئے ایک انگریز بھی ساتھ لیتے آئے۔ حیدر آباد سے آنے کے بعد یہ شوق دھیما پڑ گیا۔ لیکن بہت سے سولین اور بیرسٹر وغیرہ اپنی طرز معاشرت میں صاحب بہادر تھے۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی طرز معاشرت کی وجہ سے ہماری قوم میں ایک نیا طبقہ بن گیا تھا جسے "نقالوں کا طائفہ" کہنا نامناسب نہ ہوگا۔ ان میں نقل ہی نقل تھی، ان حضرات کو عام مسلمانوں سے بلکہ ان متوسط الحال شرفا سے بھی کوئی ربط اور انس نہیں رہا تھا۔" [۱]

اس موقع پر اکبر کا ایک شعر سن لیجئے۔ ضروری ہرگز نہیں کہ اس پر غور بھی کیا جائے:-

عزیزانِ چمن سے تو پیاسول سرو سے کیا حاصل یگانوں میں رہو بیگانہ ہو کر اس سے کیا حاصل

مولوی سید مہدی علی خاں، جو بعد میں خان بہادر، نواب محسن الدولہ، محسن الملک، منیر نواز جنگ کے خطابات سے سرفراز ہوئے۔ اور سرسید کے بعد علی گڑھ کالج کے سکریٹری مقرر کئے گئے۔ سرسید کے ان ارادت مندوں میں سے تھے جن پر سرسید کو پورا پورا اعتماد ہی نہیں ناز بھی تھا (ان کا شمار ان حوصلہ مندوں میں ہوتا ہے جو اپنی قوت بازو پر بھروسہ کرتے ہیں اور راستہ کی بڑی سے بڑی دشواری کو لپ پا کرتے منزلِ مقصود پہ پہنچ جاتے ہیں)

جب ایسا شخص بھی "مغربیت" کا یوں شکار ہو سکتا ہے تو پھر کمزوروں اور ناتوانوں کی کون کہے۔ محسن الملک کو اللہ نے سب کچھ دے رکھا تھا۔ اس لئے وہ انگلینڈ سے آرائش نشیمن کے لئے تنکوں کے ساتھ ساتھ "بجلی" بھی بزور زر ساتھ لیتے آئے۔ لیکن وہ جن کے پاس اللہ کے نام کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ بھی "گیسوئے تابدار مغرب" پر مٹے بغیر نہ رہ سکے، اور تو اور حالی جیسا معصوم، متین اور سنجیدہ انسان بھی جسے اصولاً ان زلفوں کی درازدستی کا رونا رونا چاہئے تھا، ان کے پیچ و خم سے نالاں نہیں، بلکہ ان کی "درازی" کا آرزومند اور "سیاہیوں" کا مدح خواں ہے:-

---

[۱] سرسید احمد خاں، مصنفہ مولوی عبدالحق صفحہ ۳۵-۳۶۔

".... تقریباً چار برس میں نے یہ کام (اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی تصحیح کا) لاہور میں رہ کر کیا، اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی۔ اور نا معلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرقی لٹریچر اور خاص کر علم فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی [1]"

بات اگر "انگریزی سے مناسبت" تک رہتی تب بھی کوئی مضائقہ نہ تھا۔ لیکن اس "مناسبت" کی جو قیمت حالی کو ادا کرنی پڑی کیا وہ عبرتناک حد تک "افسوس ناک" اور حد سے گزری ہوئی نہیں؟

مذکورہ بالا اقتباسات کے خط کشیدہ جملوں پر ٹھنڈے دل سے غور کئے بغیر اکبر کی ان تلخ باتوں کو جو یقیناً کڑوے گھونٹ ہیں حلق سے اتار لینا آسان نہیں۔

چشمِ بتاں نے نفس کی خواہش ابھار دی	دنیا ہماری دشمنِ دیں نے سنوار دی
حسنِ بت یہ ہے تو اب یادِ خدا کی نہیں خیر	یہ ادا ہے تو نمازوں کی قضا آئی ہے
رہا نہ ہوش میں تقویٰ جدھر اٹھیں آنکھیں	بتِ حسیں نے غضب کی نگاہ پائی ہے
ہیں لیمپ عزیز، شمع بیگانہ ہے	جلتا ہے چراغ سے جو دیوانہ ہے
سب کا ہے مِسوں کے رخِ روشن پہ نگاہ	جو ہے "نئی روشنی" کا پروانہ ہے
مریدِ دہر ہوئے، وضعِ مغربی کر لی	نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی
ظلمت ٹپک رہی ہے اس دور میں فلک سے	آنکھیں جھپک رہی ہیں شیطان کی چمک سے

اکبر کو سر سید سے عناد، ان کے تعلیمی نظریے سے بغض، یا علی گڑھ کالج سے کوئی پرخاش نہ تھی۔ ان کے غم و غصہ اور بیزاری کا سبب مغربی (علی گڑھ کی) تعلیم بھی نہیں، جس کے ڈھنڈورے پٹ گئے۔ خوب خوب پیٹے گئے۔ بلکہ اس تعلیم کے نتائج ہیں۔ (جو اوپر مذکور ہوئے) جو اکبر کی دور بہت دور تک دیکھنے والی نگاہوں کے سامنے تھے اور جن سے خود سر سید کے ایک رفیقِ کار (شبلی) نے بھی بالآخر پناہ مانگی ہے ؎

"آپ نے ہم کو سکھائے ہیں جو یورپ کے علوم	اس ضرورت سے نہیں قوم کو ہرگز انکار
بحث یہ ہے کہ وہ اس طرز سے بھی ممکن تھا	کہ نہ گھٹتا کبھی ناموسِ شریعت کا وقار
ہم نے پہلے بھی تو اغیار کے سیکھے تھے علوم	ہم نے پہلے بھی تو اس نشہ کا دیکھا ہے خمار
نام لیتے تھے ارسطو کا ادب سے ہر چند	تھے فلاطونِ الٰہی کے بھی گو شکر گزار
جانتے تھے مگر اس بات کو بھی اہلِ نظر	کہ حریفوں کو نہیں "انجمنِ خاص" میں بار
یعنی وہ بادۂ عرفاں کے نہیں ذوق شناس	بزمِ اسرار کے یہ لوگ نہیں بادہ گسار
آج ہر بات میں ہے شانِ تفرنج پیدا	آج ہر رنگ میں یورپ کے نمایاں ہیں شعار
ہیں شریعت کے مسائل بھی وہیں تک محدود	کہ جہاں تک انھیں معقول بتائیں اغیار"

اکبر کے نظریۂ تعلیم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے سر سید کے ساتھ ساتھ شبلی کے بھی تعلیمی نظریے کو نظر میں رکھنا بے حد ضروری ہے

---

[1] سیر المصنفین ص ۲۳۵ (جامعہ پریس)

یہ نظریات دبستانوں کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔ اور اپنے اپنے طریقہ پر تشنگانِ علم و تحقیق کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے ہیں۔ میری مراد "مسلم یونیورسٹی علی گڑھ" اور ندوۃ العلماء، لکھنؤ سے ہے جن کے فیوض و برکات کے چشمے آج بھی جاری ہیں۔

سرسیدؒ کی اصلاحی تحریک کے محرکات میں "مسلمانوں کی معاشی بدحالی" کے خیال کو بڑا دخل ہے :۔

"سرسید کی نظر مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور معاشی زبوں حالی پر تھی، وہ سمجھتے تھے کہ دونوں درست ہوگئیں تو اور باتیں خود بخود درست ہو جائیں گی۔ شکستہ دل اور شکستہ پر قومیں تباہی سے امن و نجات کی طرف بڑھتی ہیں تو ہر رہنما کی پالیسی وہی ہوتی ہے جو سرسید کی تھی۔ آبادکاری کی پہلی منزل یہی ہے[1]"

وہ (سرسید) دیکھ رہے تھے اور دیکھ دیکھ کر کڑھ رہے تھے کہ ہمسایہ قومیں انگریزی تعلیم کی بدولت روز بروز آگے بڑھ رہی ہیں اور مسلمان کچھ تو ناعاقبت اندیشی، تعصب اور تنگ نظری اور بہت کچھ اپنی بیجا ضد کی وجہ سے پیچھے رہے جا رہے ہیں۔ اگر خدانخواستہ کچھ دنوں اور اسی طرح وہ اپنی ضد پر قائم رہے تو پھر کہیں کے بھی نہ رہیں گے۔ اور پھر ان کا پنپنا محال ہی نہیں قطعاً ناممکن ہو جائے گا، نواب سید حسن مرحوم کے نام سرسید کے اس خط میں (جو انھوں نے الہ آباد سے لکھا تھا)۔

"...... مگر انگریزی نہ جاننے کے سبب روز بروز مسلمانانِ ہندوستان ذلت و خواری میں پڑتے جاتے ہیں۔ اعلیٰ عہدے انکے ہاتھ سے نکلے جاتے ہیں ہندو و بنگالی روز بروز ترقیاں پاتے جاتے ہیں اور مسلمان ہر امر میں اُنکے مغلوب اور دست نگر ہوتے جاتے ہیں۔ پس مسلمانوں کو ہندو و بنگالیوں پر غلبہ حاصل کرنیکے لئے یا ان سے مغلوب ہونے نہ دینے کیلئے مسلمانوں کو انگریزی زبان کی تعلیم دینا درحقیقت ہندوؤں اور بنگالیوں پر ان کو فتح مند کرنا ہے۔ اور اس زمانہ میں جو حال مسلمانوں کا ہے درحقیقت ان کی تعلیم انگریزی میں امداد کرنا پوری حسنات میں داخل ہے"[2]

دو باتیں توجہ طلب اور غور کے لائق ہیں :۔

(۱۔ اعلیٰ عہدے۔ (سرکاری نوکریاں یا بقول اکبر الٰہ آبادی "کلرکی") کیونکہ اس زمانے میں بڑے اور ذمہ داری کے عہدے مسلمانوں کا کیا ذکر ہے، کیونکہ وہی تو معتوب و مطعون تھے، کسی بھی ہندوستانی کو نہیں ملتے تھے۔

۲۔ سرسید کی دلی آرزو تھی کہ مسلمان جو اپنے ہاتھوں انگریزوں کے محکوم اور دست نگر ہو ہی چکے ہیں کم از کم ہندو و بنگالیوں سے مغلوب نہ ہونے پائیں۔ غلامی ہی کیا کم بدنصیبی ہے چہ جائیکہ غلاموں کی غلامی)

اقتباس کے یہ الفاظ۔ اس زمانہ میں "بڑی معنویت کے حامل ہیں۔ ان سے یہ حقیقت پورے طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ سرسید "عہدوں" کو مسلمانوں کی تگ و دو کی "منزل" نہیں۔ منزل تک پہنچنے کا پہلا زینہ سمجھتے تھے۔ منزل کیا ہوگی اور اسے کیا ہونا چاہئے؟ ان باتوں پر اس وقت توجہ کی کوئی اس ضرورت بھی نہ تھی۔۔ "منزل" کو متعین کرنا ۔۔۔ بعد میں آنے والوں کا کام تھا۔ پہلا اور خود ان کا کام تو بس اتنا تھا کہ ملت کے بے حس کارواں میں حرکت پیدا کر دی جائے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ سرسید اپنے مشن میں (مشن سے یہاں میری مراد مسلمانوں کو جدو جہد پر آمادہ کرنا ہے) ناکام رہے۔

شبلی نے بھی انگریزی تعلیم کی ضرورت کو محسوس ہی نہیں کیا ہے بلکہ اس پر بڑا زور بھی دیا ہے، انھوں نے بھی زبان اور عمل دونوں سے اس کی ترویج و اشاعت میں جی کھول کر حصہ لیا۔ عزیزوں کے نام شبلی کے خطوط اور شبلی ہائی اسکول (اعظم گڑھ)، جواب دگری کالج ہے

---

[1] رشید احمد صدیقی۔ بحوالہ حیات اکبر ص۱۲۱　　[2] نقوش (ادب عالیہ) ص۵۸۶

اس بات کے گواہ ہیں۔ لیکن شبلی کے پیشِ نظر مسلمانوں کی "معاشی زبوں حالی" اتنی نہ تھی جتنی ان کی "مذہب سے بے گانگی" جو ان کے نزدیک سارے فساد کی جڑ تھی اور جس نے مسلمانوں کی مرکزیت پر حقیقتہً بڑی کاری ضرب لگائی تھی، فکر و نظر کی وحدت پارہ پارہ تھی، آپس کے اتحاد و اتفاق میں رخنے پڑ چکے تھے۔ مسلمان گروہوں میں بٹ رہے تھے اور بٹتے جا رہے تھے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ مرکز (مذہب) کی ہر ممکن طریقہ پر حفاظت کی جائے۔ وقت کی سب سے بڑی اس ضرورت کو شبلی نے اور پھر اکبر نے پورا کیا۔

سرسید اور شبلی کے راستے ضرور الگ الگ ہیں مگر منزل الگ نہیں۔ غور سے دیکھئے تو دونوں ایک ہی سمت ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں نظر آتے ہیں۔ اور وہ منزل ہے "مسلمانوں کی فلاح و بہبود"

سرسید کو مسلمانوں کی دنیا سنوارنے کی فکر تھی تاکہ ان کا دین خطرات سے محفوظ رہے، شبلی نے دین و مذہب کی حفاظت کا بیڑا اٹھایا کہ یہ نہیں (تو پھر مسلمان کہاں، اسلام کہاں) تو کچھ بھی نہیں۔ اس اعتبار سے حالی سرسید کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ اور اکبر شبلی کے، اکبر کا ایک شعر ہے:۔

شیخ مرحوم کا قول اب مجھے یاد آتا ہے   دل بدل جائیں گے، تعلیم بدل جانے سے

غریب شیخ اور وہ بھی "مرحوم" کی بات اور پھر اس زمانہ میں بھلا کہنے سننے کی کوئی بات ہے۔ جی کڑا کر کے کہی بھی جائے تو کون سنے اور کیوں سنے؟ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ یہی بات ایک لاٹ صاحب بھی کہہ گئے ہیں:۔

"انگریزی کی تعلیم، حکومت کا ایک مستقل فرض ہے۔ انگریزی ہندوستانیوں کے لئے مغرب کی ترقی یافتہ اور وسعت پذیر علوم کا دروازہ کھول دے گی اور ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ہندوستان مغربیت کا جامہ اختیار کرے گا۔ اس طریقہ سے امید ہے کہ ایک ایسا طبقہ پیدا ہو گا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہو گا، مگر خیالات اور تمدن میں انگریز ہو گا۔"[1]

خدا بھلا کرے میکالے کا کہ ان کے طفیل میں شیخ جی کی آبرو ہی نہیں بچی، بات بھی رہ گئی، ورنہ کون جانے اس غریب کا ہمارے ہاتھوں کیا حشر ہوتا۔ میکالے کی اس پیشین گوئی کو حقیقت کے سانچے میں ڈھلتے دیر نہیں لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے ترقی کی دھن میں، برصغیر کے ایک طبقہ نے اور اس طبقہ نے جس سے مشرق کی ساری توقعات وابستہ تھیں۔ مغربیت کا جامہ اختیار کر لیا۔

ترقی کے نام پر بقول اکبر "بجلی کی روشنی میں جو اندھیر ہو رہا تھا وہ انگریزوں کی بے سوچی سمجھی نقالی تھی، جس میں مسلمانوں کا نوجوان طبقہ خصوصیت کے ساتھ پیش پیش تھا۔ (اور کیا آج نہیں ہے) طور طریق میں، چال ڈھال میں، لباس و پوشاک میں، خیالات و تمدن میں یہاں تک کہ بول چال گفتگو تک میں "نقل انگریز" ہی زندگی کی معراج اور ترقی کی سند سمجھی گئی تھی۔ رہ گئی انگریزوں جیسی سوجھ بوجھ، ذہانت، چالاکی، دور بینی، وطن دوستی اور قومی افتخار، ان پر وہ سے "مقاماتِ آہ و فغاں" کی موجودگی میں توجہ کون کرتا؟ تقسیم کار بھی تو آخر کوئی چیز ہے۔ آخر اکبر اور اکبر جیسے کچھ اور کس لئے تھے؟ یا کس کے لئے تھے؟

"نقل انگریز" کی اس وبا کے تباہ کن اثرات ہندوستانی تہذیب کی روح پر ور فضا کے لئے جیسے کچھ ساز گار ہو سکتے تھے، ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ کسی کی نگاہوں سے پوشیدہ نہیں۔ اس وبا کی روک تھام کی کوششیں صرف ایک اکبر ہی نے نہیں کیں اور غیر تمدن نے بھی کی ہیں، لیکن اکبر کی بات کچھ اور ہی ہے، کیونکہ ان کا طریق کار سب سے جدا، سب سے الگ۔ آپ اپنی نظیر ہے جس کی سب سے

---

[1] انگریزی تعلیم کی بابت میکالے کی رپورٹ، بحوالہ "مشاہیر کے تعلیمی نظریے" مرتبہ محمد حسین خاں زبیری ص۱۱

بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سمجھو اور سمجھنا چاہو تو سب کچھ، اور نہیں تو کچھ بھی نہیں۔

اکبر کی شاعری (کا ایک حصہ) "دشنۂ پنہاں" ہے۔ آستین میں نہیں، "ظرافت کے لحاف" میں، شبلی، ظفر علی خاں یا اقبال کی شاعری کی طرح "شمشیر برہنہ" نہیں۔ اکبر کے حریف کو ان کے وار کی بے پناہی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب زخم خون اگلنے لگتا ہے۔ شبلی اور ظفر علی خاں کا حریف ان کی للکار ہی سے بدحواس ہو جاتا ہے۔ بھاگ کھڑا ہوتا ہے اور مقابلے میں آنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ یہاں وہ گزند سے بچ سکتا ہے۔ وہاں مار کھائے بغیر نہیں رہ سکتا۔

فکر و نظر کے اعتبار سے اکبر و شبلی میں حیرت انگیز یکسانی ملتی ہے اور تعلیمی معاملات میں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے یہ دونوں، دو نہیں، ایک ہیں، فرق اگر ہے تو بس اتنا کہ ایک نے اپنے خیالات کا اظہار نظم میں، اشارے، کنائے میں، ظرافت کی اوٹ اور طنزیہ لہجہ میں کیا ہے۔ دوسرے نے نثر میں، شرح و تفصیل سے۔ شبلی نے جو کچھ کہا ہے اسے کر بھی دکھایا ہے۔ اکبر سے کر دکھانے کی توقع فضول ہے کیونکہ وہ شاعر پہلے ہیں اور کچھ بعد میں اور شاعر کے لئے ہرگز ضروری نہیں کہ جو کہے اسے کر بھی دکھائے۔ اس کے یہاں عمل کی نوعیت ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے عمل کو عمل کے روایتی تصور اور تعریف کی میزانوں میں تولنا نامناسب ہو گا۔

شبلی کے تعلیمی نظریے پر تنقید و تبصرہ سے پہلے اسے ہر پہلو سے دیکھنا اور سمجھنا ضروری ہے۔ سرسید کی شخصیت بڑی جاذب تھی جو ان کی صحبت میں رہا۔ ان کے قریب آیا یا پاس سے گزرا، ان سے متاثر اور پھر ان کا ہمنوا ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ ان کے رفیقوں میں ایک شبلی ہی ایسے نظر آتے ہیں جو ان کے رنگ میں رنگنے کے باوجود اپنے رنگ کو باقی رکھنے میں کامیاب ہو سکے، اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ سرسید کے تعلیمی نظریے کے متوازی اپنا نظریہ پیش کرنے کی جرأت کبھی نہ کر سکتے۔

شبلی کے تعلیمی نظریہ کا نقطۂ آغاز علی گڑھ کی تعلیم نہیں۔ اس تعلیم کے نتائج کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ جو اکبر کے لفظوں میں نقل انگریز کی وبا کی صورت میں ظاہر ہوئے اور شبلی کے نزدیک مذہب بیزاری کا پیش خیمہ تھے۔ اس سلسلے میں شبلی کی نظم "اسلام کے تنزل کے اسباب" جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:۔

الغرض عام ہے وہ چیز جو بے دینی ہے	صاف یہ بات ہے دھوکا نہیں ابہام نہیں
ان حقایق کی بنا پر سبب پستیٔ قوم	ترکِ پابندیٔ اسلام ہے، اسلام نہیں

شروع سے آخر تک دیکھنے کے لائق ہے۔ اس سے نہ صرف شبلی کی مذہب دوستی اور اسلام پرستی کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے بلکہ ان کی ژرف نگاہی پر بھی خاطر خواہ روشنی پڑتی ہے۔ شبلی سرسید کے اندھے مقلد نہ تھے انھوں نے اس احترام کے باوجود جو انھیں سرسید سے تھا ———— سرسید کی اکثر باتوں سے اختلاف کیا ہے۔ اس نااتفاقی کو تنگ نظری شخصی اور ذاتی مخالفت سے تعبیر کر سکتا ہے۔ بات سے اختلاف کو ذات سے اختلاف سمجھنا کوئی معقول بات نہیں، مثنوی "صبح امید" کو جس میں شبلی نے سرسید کے ایثار اور کمالات کا جی کھول کر اعتراف کیا ہے۔ اس خیال سے نظر انداز بھی کر دیں کہ یہ نظم سرسید کی زندگی میں لکھی گئی تھی تو اس مضمون کو کہاں اور کیسے دفنا دیں جو سرسید کی وفات پر ان کے قلم سے نکلا اور جس میں ان کے کمالات کا اعتراف بڑی محبت اور فراخ دلی سے کیا گیا ہے۔

غریب اکبر بھی اس معاملہ میں شبلی سے کم بدنام نہیں۔ انھیں بھی سرسید کا مخالف بنا کر پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اکبر کو بھی سرسید کے اکثر اقدامات سے شدید اختلاف رہا۔ لیکن یہ اختلاف ان کی ذات سے ہرگز نہ تھا اس خیال کی تائید میں اکبر کا تنہا یہی ایک شعر کافی ہو:۔

شیخ و سید سے تو خالی نہیں ذکرِ شاعر ذات سے ان کی مخاطب نہیں فکرِ شاعر

سرسید کے سامنے ابتدائی تعلیم سے لے کر یونی ورسٹی کی تعلیم تک کے مسائل تھے - وہ مذہبی تعلیم کو غیر ضروری ہرگز نہیں سمجھتے تھے - البتہ قدیم علوم میں سے بیشتر کو از کار رفتہ اور موجودہ زمانے کے لئے بیکار تصور کرتے تھے - یہاں تک سرسید اور شبلی کے طریق فکر میں بڑی یکرنگی اور یگانگت ملتی ہے - قدیم علوم و فنون کے از کار رفتہ ہونے کا احساس ایک سرسید اور شبلی ہی کو نہیں تھا، ان کے علاوہ اور سیدہ ور بھی تھے، جن کو قدیم تعلیم کی افادی حیثیت کے کم ہو جانے کا احساس ہو چلا تھا - ندوۃ العلماء (لکھنؤ) سچ یہ ہے کہ اسی احساس کا عملی نتیجہ ہے - لیکن کسی چیز کے از کار رفتہ ہونے کا خیال ہی اس کو باکار بنانے کے لئے کافی نہیں - شبلی کا یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے بیکار کو باکار بنانے کی کوشش ہی نہیں کی، اسے ایک بار پھر کارآمد بنا دیا -

شبلی کی تعلیم قدیم طرز کی تھی - علی گڑھ آنے سے پہلے وہ کٹر مذہبی آدمی تھے - مناظرہ بازی ان کا دلچسپ مشغلہ تھا یہاں آکر ان میں وسعت نظر پیدا ہوئی جس نے ان کے فکر و خیال کو مشرق سے مغرب کی طرف پھیر دیا - پھر بھی تعلیم کے باب میں انھوں نے علوم قدیمہ خصوصاً عربی سے بے رخی اختیار نہیں کی، علوم قدیمہ کا احیاء ان کے نزدیک حیات ملی کے لئے ضروری تھا - ایک جگہ کہتے ہیں:

"دوسرے سوال کا (سوال یہ تھا کہ قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہیں) جواب جدید گروہ کے ذہن میں دفعتاً نفی کی صورت میں آئے گا - لیکن ان کو ذرا غور سے کام لینا چاہئے اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہئے :

کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا کچھ اور ہے ؟ اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیونکر قائم رہے گی - اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم، قدیم تعلیم کے بغیر کیونکر ممکن ہے ؟ شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے اور اسی قدر کافی ہے، لیکن کیا اسی قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے - کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہیں - کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراض کرتے ہیں - ان کے مقابلے کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے - کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات، مثلاً وعظ، امامت فتویٰ وغیرہ انجام دے سکتے ہیں - کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی اثر قائم ہو سکتا ہے ؟"[1]

شبلی جانتے تھے کہ علی گڑھ سب کچھ پیدا کر سکتا ہے - لیکن عالم فقیہ اور محدث پیدا کرنا اس کے بس کی بات نہیں، اور کون کہہ سکتا ہے کہ شبلی کے یہ اندیشے صحیح ثابت نہیں ہوئے -

شبلی نصاب تعلیم کے نقص کو علمی تنزل کا سبب بتاتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"۱- تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے -

۲- ہر فن کے حاصل کرنے کا یہ عمدہ طریقہ ہے کہ اس کے مسائل کو منفرداً اور باستقلال حاصل کیا جائے - تاکہ اس فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے - بجائے اس کے اگر چند فنون کے مسائل کو مخلوط کر کے حاصل کیا جائے گا تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہوگی -

۳- متعدد علوم و فنون کی تحصیل میں اَلْاَقْدَمُ فَالْاَقْدَمْ کا خیال ضرور ہے یعنی یہ کہ جو فنون مقصود بالذات ہیں ان کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے جو مقصود بالعرض ہیں، ان میں کم -

۴- ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس فن کی جو غایت ہے وہ حاصل ہو"[2]

---

[1] مقالات شبلی جلد سوم ص ۱۴۰   [2] مقالات شبلی جلد سوم ص ۱۵۶

مذکورہ مقتبس فقروں سے کم از کم اس بات کا پورا پورا اندازہ ہو جاتا ہے کہ شبلی نے تعلیمی مسائل پر جو کچھ لکھا ہے ۔ وہ مسلسل فکر و غور کا نتیجہ ہے ۔

اب ہم شبلی کے تعلیمی مقالات سے ، جو تعداد میں گیارہ ہیں کہیں کہیں سے کچھ اقتباسات پیش کرتے ہیں ، تاکہ ان کی فکر و نظر کا ہر پہلو آپ کی نگاہوں کے سامنے آجائے :-

" ہم نے بارہا کہا ہے اور اب پھر کہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسوں کی تعلیم کافی ہے ۔ نہ قدیم عربی مدارس کی ۔ ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جزو مشرقی ہے اور دوسرا مغربی ۔

در کفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نہ داند جام و سندان باختن

تعلیمی معاملات میں اکبر شبلی کے ہم خیال اور ہم زبان ہیں ۔ فرق ہے تو "اجمال" اور "تفصیل" کا کیونکہ دونوں کا ذریعۂ اظہار اسی کا متقاضی تھا ۔

شبلی	اکبر
شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے ۔ اور اسی قدر کافی ہے ، لیکن کیا اسی قدر تعلیم سے قرآن و حدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے ۔ کیا عوام پر ان لوگوں کا کوئی مذہبی اثر ہو سکتا ہے[1]	نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے
لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجوں میں صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہیں پیدا ہو سکتا ۔ بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلباء کے چاروں طرف مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے ۔ مذہبی علماء بیش قرار مشاہرے مقرر کئے جائیں وعظ کے موقعوں پر اکثر ارکان کالج تا امکان شریک ہوں ، مذہبی پابندی کی بنا پر طلباء کی خاص توقیر و تحسین کی جائے[2]	کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں آدمی ، آدمی بناتے ہیں جستجو ہم کو آدمی کی ہے وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں
یورپ سب کچھ کر رہا ہے تاہم ان میں ایک وسیع گروہ موجود ہے جو مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کا محافظ ہے .... اگر یورپ کو باایں دنیا طلبی ، پادریوں کی حاجت ہے ...... تو مسلمانوں کو بھی عربی تعلیم اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمان قوم کا باقی رہنا ضروری ہے ۔[3]	یہاں بجائے نماز گپ ہے ، وہاں وہی عزت بشپ ہے یہاں مساجد اجڑ رہی ہیں ، وہاں کلیسا سنور رہے ہیں
اس میں ذرہ شبہ نہیں کہ اگر ہم کو یقین ہو کہ مشرقی تعلیم کی کسی تجویز سے مغربی تعلیم میں ذرہ برابر کمی ہو تو ہمارا فرض ہے کہ اس تجویز سے علانیہ نفرت کا اظہار کریں"	کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ ، کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول ، او قومی کا تو کر خود ہی نہ رہزن پیدا

۱ مقالات شبلی جلد سوم ص ۱۴۰ ۲ ایضاً ص ۱۴۱ ۳ ایضاً ص ۱۴۶

شبلی	اکبر
انھیں واقعات پر خیال کرنے سے بانیان سائنٹیفک سوسائٹی علی گڑھ کو دھوکا ہوا اور وہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے مورثوں نے بذریعہ ترجموں کے علوم کو ترقی دی ہم بھی یورپ کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں ترجمہ کرکے اپنے علوم اور اپنی قوم کو ترقی کے رتبہ پر پہنچائیں گے۔ مگر ان کا یہ قیاس غلط اور قیاس مع الفارق تھا۔۔۔۔۔۔ مگر ہم کو اس بات کے معلوم کرنے سے خوشی ہوئی کہ خود سر سید احمد خاں نے جو سائنٹیفک سوسائٹی کے بانی ہیں۔ متعدد تحریروں میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا ہے	(ترجمہ) کرنے والے کرتے ہیں محنت پالیتے ہیں اپنی اُجرت سینے ہوجاتے ہیں خالی بھر جاتی ہے المساری دل کا کورس تو ٹھہرا غربی لب پر اُردو ہو یا عربی

یہ اتحاد فکر و خیال، صرف تعلیمی مسائل تک ہی محدود نہیں، مذہبی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں بھی اس کے آثار قدم قدم پر نہیں تو ہر دوسرے تیسرے قدم پر ضرور دیکھنے میں آتے ہیں۔ طوالت کے خیال سے صرف دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

شبلی	اکبر
پنہائی جارہی ہیں عالمانِ دیں کو زنجیریں یہ زیور سید سجادِ عالی کی وراثت ہے شہیدانِ وفا کے قطرۂ خوں کام آئیں گے عروسِ مسجدِ زیبا کو افشاں کی ضرورت ہے	مولوی جیل میں بٹنے کو جو مونج اٹھتا ہے گنبد چرخ مری آہ سے گونج اٹھتا ہے بے فائدہ ہے اکبر اب تم کو شوق اس کا سائنس کی سڑک میں جنت بھی آگئی ہے

اوپر کی سطروں میں سر سید اور شبلی کے تعلیمی نظریات کی کم و بیش وضاحت ہو چکی ہے۔ اب اکبری نظریہ کی باری ہے، لیکن اس سے پہلے اس موضوع پر اکبر کے تفکر، تخیل اور تدبر کی ترجمانی کی جائے ذیل کی باتوں کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے:۔

۱۔ اکبر سر سید سے عمر میں ۲۹ برس چھوٹے اور شبلی سے گیارہ برس بڑے تھے۔

۲۔ سر سید نے ۸۱، اکبر نے ۷۵، اور شبلی نے ۵۷ برس کی عمر پائی۔

۳۔ سر سید کی وفات ۱۸۹۸ء میں ہوئی شبلی کی ۱۹۱۴ء اور اکبر کی ۱۹۲۱ء میں

اس اعتبار سے اکبر کو علی گڑھ تحریک کے نتائج اور اہل ہند کی سیاسی، معاشی اور مذہبی حالت کے مشاہدے اور اس پر غور و فکر کا نسبتاً زیادہ موقع ملا۔ لہٰذا ان مسائل پر ان کی تنقید و تبصرہ کو سطحی اور سرسری فرض کر لینا آسان نہیں رہ جاتا۔ ان مقامات پر بھی جہاں اکبر نے ان مسائل پہ ظریفانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ٹھنڈے دل سے غور کئے بغیر رائے دے دینا مناسب نہیں، کیونکہ اکبر کی ہنسی دل لگی کی باتوں میں بھی کوئی نہ کوئی نکتہ یا کام کی بات ضرور ہوتی ہے۔ اس کا احساس خود اکبر کو بھی تھا،

شاید مرے سخن نے یار دل کو خوش کیا ہو ... اس کو تو بس وہ سمجھے جو مر کے پھر جیا ہو

یہ زینت بندشِ الفاظ کی ہے حسن معنی سے ... نہ ہو جلوا جو لیلیٰ کا تو پھر کیا لطف محمل کا

مشکل سے یہ حالتیں سہی جاتی ہیں ... پھانسیں ہیں کہ قلب میں رہی جاتی ہیں

تفصیل نہ پوچھ ہیں اشارے کافی ... یوں ہی یہ کہانیاں کہی جاتی ہیں

مسلمانوں کے ان دو تعلیمی مرکزوں (علی گڑھ اور ندوۃ العلما) میں اکبر کو ندوہ زیادہ پسند آیا۔ کیونکہ یہی ان کے خیالوں کے عین مطابق تھا۔

شبلی سے قربت اور سرسید سے ان کی فکری دوری کی اصلی وجہ یہی ہے۔ اکبر کے خیالات کا صحیح اندازہ ان کے علی گڑھ اور ندوہ پر ان تبصروں سے کیا جا سکتا ہے۔

ہے دل روشن مثالِ دیو بند　　اور ندوہ ہے زبانِ ہوش مند
ہاں علی گڑھ کی بھی تشبیہ ہو　　اک معزز پیٹ بس اس کو کہو
پیٹ ہے سب سے مقدم ہائے عزیز　　لیک فکرِ آخرت ہے اصل چیز
یہ بات تو ظاہر ہے، ہرگز نہ ہوگی کھوئی!　　عربی میں نظمِ ملت بلماے میں صرف روئی
لیکن جنابِ لیڈر سن کر یہ شعر بولے　　بندھوائیں گے یہ حضرت اس قوم کو لنگوٹی
اس بات کو خدا ہی بس خوب جانتا ہے　　کس کی نظر ہے غائر کس کی نظر ہے موٹی
اڈیٹر بول اٹھے دیکھ کر شبلی کے فوٹو کو　　اسی کے دم سے اب ندوہ ہے مشرق کا کتبخانہ
شبلی کا قلم علم کی منزل پہ جما ہے　　رفتار پہ آمد کی قدم ان کا تھما ہے
چمکی ہوئی ہے بزمِ سلف انکے بیاں سے　　روشن ہیں یہ معنی کہ وہ شمس العلما ہے

"بزمِ سلف" کی قدر و قیمت اور "مشرق کے کتب خانہ" کی اہمیت کو سمجھنا ان صاحب نظروں کے بس کی بات نہیں۔ جن کا سرمایۂ افتخار بس کریں اتنا ہے کہ ہم بھی منہ میں زبان نہیں انگریزی زبان رکھتے ہیں اور بقول شوکت تھانوی کھانا ہاتھ سے نہیں بلکہ اوزاروں سے کھاتے ہیں۔ کاش وہ سمجھ سکتے ؎

وقعت مگر محال ہے مسجد کو چھوڑ کر　　ممکن نہیں کہ پائے وہ پھل جڑ کو توڑ کر

اکبر کو مذہب سے غیر معمولی دلچسپی اور لگاؤ تھا خلوص کے ساتھ ساتھ یقین کی رو اتنی تیز، تند اور جوشیلی ہے کہ اس سے بے اعتنائی نہیں برتی جا سکتی۔ اس سلسلہ میں انھوں نے جو کچھ کہا ہے وہ ان کے دل کی آواز ہے۔ یہ آواز اب تک محض سنی گئی ہے۔ کان کھول کر سننے کی زحمت کسی نے گوارا نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اکبر کی صحیح قدر و قیمت آج تک متعین نہ کر سکے۔

اکبر کے خیال کی صحت اور عدم صحت کے اندازے کے لئے ان کی طبیعت کے اس رخ پر نگاہ رکھنا ضروری ہے۔

شاعر مشرق (علامہ اقبال) کے یہاں "خیر اور شر" کی جو پہچان بتائی گئی ہے۔ یہ ہے ؎

ہر وہ چیز جس سے خودی کو تقویت پہنچے "خیر" ہے ہر وہ چیز جو خودی کے ضعف کا باعث ہو "شر" ہے

"پیر مشرقی"[۱] (اکبر) کے یہاں خیر و شر کی کسوٹی خودی نہیں "مذہب" ہے۔ اقبال کا فلسفہ خودی کے گرد گھومتا ہے۔ اکبر کا مذہب کے محور پر۔ اکبر کے نزدیک دین و مذہب کو تقویت پہنچانے والی ہر چیز "خیر" ہے اور جو چیز مذہب اور اس کے متعلقات کے ضعف کا باعث ہو یا ہو سکتی ہو "شر" ہے چاہے وہ علم اور تعلیم ہی کیوں نہ ہو۔

---

[۱] علامہ اقبال نے اپنے ایک خط میں اکبر کے چھوٹے صاحبزادے ہاشم میاں کو ان الفاظ میں مشورہ دیا ہے:۔
"میاں ہاشم، اب وقت ہے اس کی قدر کرنا اور جو کچھ پیر مشرقی سے سیکھ سکتے ہو سیکھ لینا۔ یہ وقت پھر نہیں آئے گا۔ اس تربیت کے فیض سے زندگی بھر تمہاری روح لذت اٹھائے گی" (اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۹۵)

اکبر معاشرت کو مذہب سے الگ دیکھنا پسند نہیں کرتے ۔ وہ ان دونوں میں گہرے ربط کے قائل ہیں ۔

مذہب کا معاشرت سے ہے ربط کمال دونوں جو ہوں مختلف تو آرام محال
پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیں احباب بعد اس کے رفارم کا کریں دل میں خیال

ان کا خیال ہے کہ معاشرت کی تبدیلی سے انسان رفتہ رفتہ اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر متاثر ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک زمانہ ایسا بھی آجاتا ہے کہ "ظاہر" کے ساتھ ساتھ "باطن" بھی بدل جاتا ہے ؎

معنی میں بھی ہو جائے گا آخر کو تغیر تبدیلی صورت کے رہے گر یہی آثار

(ترکی، ایران اور مصر کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں)

اکبر کے اس خیال سے سو فیصدی اتفاق تو ہرگز نہیں کیا جا سکتا، لیکن اس میں شک نہیں کہ اکبر کے زمانے میں مغربی تعلیم کے اثرات (جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) یقیناً مایوس کن تھے (اور کیا آج نہیں ہیں) پھر اگر اکبر ان سے مایوس ہوئے تو تعجب اور حیرت کی کونسی بات ہے ۔

تبدیلیٔ معاشرت کے سلسلے میں اکبر نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان پر ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے ایک مضمون میں بڑی نپی تلی بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں :-

"ان کے (اکبر کے) نظریہ کا جتنا بھی احتساب کریں، یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ حاکموں کی خوشامد سے اختیار کی ہوئی معاشرت بہرحال لیلائے غلامی کی پرستش ہی کی ایک شکل ہے اور ہر چند کہ ان تبدیلیوں میں مادی فوائد یا قوانین فطری کی کارفرمائیوں سے انکار نہیں ہو سکتا، تاہم اکبر کی صدائے احتجاج اس حد تک تو لائق تحسین ہی ہے کہ وہ ملی کلچر اور ملکی آداب کے حق میں ایک ایسے زمانے میں بلند ہوئی جب ولیم ہنٹر اور جان کیری جیسے مصنفوں کی اپنی روایت کے مطابق کسی نیٹو کو ان سڑکوں سے گزرنے کی ممانعت ہوا کرتی تھی، جن پر صاحبوں اور لیڈیوں کی آمد و رفت ہوا کرتی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اکبر نے تعلیم یافتہ گروہ کی فکری اور ذہنی غلامی پر جو کچھ لکھا ہے۔ اس کے صحیح ہونے سے تو مطلقاً انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تعلیم کے مسئلہ سے بھی زیادہ اکبر کے کلام کی اہمیت میرے نزدیک یہ ہے کہ اس میں زندگی کے ایک صحیح اور صحت مند نقطۂ نظر پر خاص زور دیا گیا ہے[1]۔"

آگے چل کر کہتے ہیں :-

"بہرحال اکبر نے اپنے زمانے میں ان تبدیلیوں کا احساس کیا اور ملی فکر و عمل کے احتساب اور تنظیم کی طرف توجہ دلائی، مگر بہت سے لوگ جن میں مثلاً مولوی ذکاء اللہ اور چراغ علی بھی شامل ہیں یہ کہتے تھے کہ ہماری معاشرت کا جس کی بنیاد صدیوں کے تجربے پر قائم ہے ان تبدیلیوں سے کچھ نہ بگڑے گا۔ مگر اکبر کی بصیرت کچھ اور کہتی تھی۔ چنانچہ آج کلامِ اکبر کی روشنی میں معاشرتی انقلاب کی پیشن گوئیوں کی ایک فہرست تیار کی جائے ۔ تو یہ محسوس ہو گا کہ اکبر کے ہم عصروں کی فراست ان کو صاف صاف دھوکا دے رہی تھی۔ اور اکبر کا دل ان خطروں کو برائی العین دیکھ رہا تھا جن کو چراغ وغیرہ دیکھ ہی نہ سکے[2]"

انگریزی تعلیم سے اکبر کی بیزاری اسی مایوسی کا ردِ عمل یا نتیجہ ہے۔ اکبر کا قصور (اگر یہ واقعی قصور ہے) جس کا خود انہیں بھی احساس تھا۔ تو بس اتنا ہے ؎

---

[1] خیالات اکبر پر ایک تحریر ۔ از ڈاکٹر سید محمد عبداللہ (ادب لطیف مارچ ۱۹۶۱ء)
[2]

دنیا سے میں نے کچھ کبھی نہ چاہا　　دل بھی نہ ابھرا، جی ہی نہ چاہا
اس میں برائی کیا تھی جو میں نے　　احیائے رسمِ دیرینہ چاہا

"احیائے رسمِ دیرینہ" سے اگر انگریزی تعلیم کی نفی ہوتی ہے تو اکبر بلاشبہ اس الزام سے بری نہیں کئے جا سکتے۔ لیکن محض اتنی سی بات پر انھیں سنگسار کرنے کا فتویٰ دے دینا، کہاں کا اور کیسا انصاف ہے؟

اکبر انگریزی تعلیم سے بدظن ضرور تھے۔ یہ بدظنی یونہی نہیں تھی، بلاوجہ کی نہیں تھی۔ حالات کی پیدا کردہ تھی۔ اس لئے کون کہہ سکتا ہے کہ جائز نہیں تھی۔

اکبر کا المیہ "غیروں سے یاری" نہیں "اپنوں سے بیزاری" ہے۔

دلوں پر مارتے جاتے ہیں چھاپہ شیکسپیر　　پڑھو گے حضرتِ سعدی کی گلستاں کب تک
غزالی و رومی کی بھلا کون سنے گا؟　　محفل میں چھڑا نغمۂ اسپنسر و مل ہے
اللہ رے انقلاب طرزِ مذاقِ مشرق　　حافظ کے شعر کیسے سب پڑھتے ہیں ریڈر
کہاں کے قبلہ، کہاں کے قبلی، جنید کیسے کہاں کے شبلی　　عوض تصوف کے ہم نے طب لی نہیں لگے سرجن مزا کریں گے
عوض قرآں کے اب ہے ڈارون کا ذکر یاروں میں　　جہاں تھے حضرتِ آدم وہاں بندر اچھلتے ہیں
مسلمانوں کا وہ آئینِ طبع مستقل بدلا　　چھٹی عربی، گیا قرآں، زباں بدلی تو دل بدلا
کالج تدبیر ہے، تفسیر کا کس کو خیال　　فکرِ روزی ہو رہی ہے، فخرِ رازی اب کہاں

اکبر شکسپیر کو پڑھنے ـــــ اسپنسر اور مل کے تاملات، تخیلات اور تاثرات سے کسبِ فیض و انبساط کو برا نہیں سمجھتے۔ ڈاروِن سے بھی وہ نہیں بھڑکتے بلکہ اس کا مذاق اس لئے اڑاتے ہیں کہ اس کی تھیوری ہماری تھیوری کی تکذیب کرتی ہے آدمی اور بندر کی اولاد میں فرق کرنے پر وہ مجبور تھے، کیونکہ ان کے مذہب کا مطالبہ یہی تھا۔ اکبر جان دے سکتے تھے۔ مذہب سے بے وفائی نہیں کر سکتے تھے ؎

کامیابی خارج از ملت سے ناکامی بھلی　　لطفِ دشمن سے ہی شہرت ہو تو گمنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں اہلِ حرم اس سے بچو　　دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بدنامی بھلی

اکبر MEDICINE کی تعلیم سے بھی ہمیں باز رکھنا نہیں چاہتے۔ انھیں تو غزالی و رومی، حافظ و سعدی، جنید اور شبلی کے چھٹنے کا غم کھائے جاتا ہے اس کا جرم اگر کچھ ہے تو بس اتنا کہ وہ اپنے اس غم میں اپنا سمجھ کر ہمیں بھی شریک کرنا اور شریک دیکھنا چاہتے ہیں اور وہ بھی اس امید موہوم پر کہ شاید اس دل کا بوجھ کچھ ہلکا اور غم کی بے پناہیاں کم ہوں

پیش بینی میں اکبر اپنا جواب نہ رکھتے تھے، آگے آنے والے ہر خطرے سے ہمیں خبردار کر دیا۔ پیش گوئی کرنا آسان ہے ہر کس و ناکس کر سکتا ہے لیکن سچی پیشین گوئیاں شاید اکبر کے مقدر ہی میں تھیں۔

"چرٹ اور چائے"[۱] کی آمد تو سبھوں نے دیکھی، لیکن اس آمد کے نتیجہ کے طور پر "حقے اور پان" کی "رخصتی" کی بشارت کس نے دی؟

۱؎ عزیزانِ چمن کو پہلے ہی سے دیتا ہوں نوٹس　　چرٹ اور چائے کی آمد ہے حقہ پان جاتا ہے

اکبر "حاصل" کرنے سے ہمیں نہیں روکتے "گرہ سے کھونے" کو نہ اپنے لئے پسند کرتے ہیں نہ اپنوں کے لئے۔ مغربی علوم و فنون (انگریزی تعلیم و تہذیب) کے حصول کو وہ ہرگز برا نہیں سمجھتے۔ البتہ "جو بات مناسب ہے" کی پابندیاں ضرور عاید کرتے ہیں۔

جو بات مناسب ہے وہ حاصل نہیں کرتے　　جو اپنی گرہ میں ہے اسے کھو بھی رہے ہیں
بے علم بھی ہم لوگ ہیں، غفلت بھی ہے طاری　　افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

اکبر سے یہ توقع فضول ہے کہ وہ "علمی فوائد" کو ذہنی عقائد پر ترجیح دیں گے[1] اور علم کی قربان گاہ پر "دین" کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہ کریں گے، چہ جائیکہ اس علم اور تعلیم پر جس کے فوائد مشکوک اور نقائص الم نشرح ہوں۔ نقائص کیا اور کیسے تھے۔ انھیں اکبر ہی کی زبان سے سننے سنانے میں لطف آتا۔ لیکن ذوقِ نغمہ کی کمیابی کا تقاضہ ہے کہ "نوا" تلخ تر ہو، اس لئے مجبوراً حکیم الامت علامہ اقبال کی طرف رجوع ہونا پڑ رہا ہے[2]

یہ مدرسہ یہ جواں یہ سرور و رعنائی　　انہیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد[3]
نئی تہذیب تکلف کے سوا کچھ بھی نہیں　　چہرہ روشن ہو تو کیا حاجتِ گلگونہ فروش
سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا　　ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں!　　سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر
جاں لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب　　دل نزع کی حالت میں، خرد پختہ و چالاک
ناپاک جسے کہتی ہے مشرق کی شریعت　　مغرب کے فقیہوں کا یہ فتویٰ ہے کہ ہے پاک

مغرب اور مشرق کے بعد المشرقین پر اقبال نے جس فیصلہ کن انداز سے آخری شعر میں روشنی ڈالی ہے اور پاک دنا پاک کہہ کر مثبت اور منفی، منفی اور مثبت کے درمیان جو موٹی سی سبز لکیر کھینچ دی ہے کیا وہ مٹائے مٹ سکتی ہے؟ اور کیا وہ مٹائی جا سکتی ہے۔ مغرب کی تقلید کو "مشرق کی مشکلات کا حل سمجھنا، خوش فہمی کے سوا اور کیا ہے۔

بل کھاؤ ہزار خواہ چھانٹو منطق　　نیچر تو ہے اپنی اصل ہی پر عاشق
لکھی ہے صحیح اک فرنگی نے یہ بات　　مغرب مغرب ہے اور مشرق مشرق

اکبر محض اسی قدر کہہ دینے پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ اس مشاہدے

تعلیم جنھوں نے پائی ہے وہ بد تو نہیں ہیں بے حس ہیں
دعوے جو ہیں رسم و مذہب کے سب ان کے یہاں وہ ڈسمس ہیں

کی بنا پر دو چار قدم اور آگے بڑھتے ہیں اور مشرق و مغرب کے مزاج کا پردہ اس طرح فاش کرتے ہیں ؎

مشرق کو ہے ذوقِ روحانی　　مغرب میں ہے میل جسمانی

وہ اپنے دعوے کو بے دلیل بھی نہیں چھوڑتے ؎

کہا منصور نے خدا ہوں میں　　ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں

---

[1] نظران کی رہی کالج میں بس علمی فوائد پر　　گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر
[2] صرف "بال جبریل" سے سرسری طور پر اشعار منتخب کئے گئے ہیں۔
[3] اپنا میخانہ نہیں، میخانۂ فرنگ۔

اور نتیجہ نکالے بغیر بھی ان سے رہا نہیں جاتا ؎

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست　　فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

اکبر سب کچھ کر سکتے ہیں، مشرق کے مزاج کو نظر انداز کرنا ان کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے ان کے تعلیمی نظریہ کو اس پس منظر سے الگ کر کے دیکھنا اور جانچنا، کسی حال اور کسی صورت میں بھی مناسب نہیں۔

ممکن نہیں کہ تعلیم و تدریس کی بات چھڑے اور معلم، متعلم اور نصابِ تعلیم کا ذکر درمیان میں نہ آئے۔ چنانچہ اکبر نے بھی جب کبھی مغربی یا انگریزی تعلیم پر رائے زنی کی ہے یا مشرقی تعلیم پر اور طریق تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہی چیز اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ اکبر نے تعلیمی مسائل پر زبان کھولنے سے پہلے تعلیم و تعلم کے ایک ایک پہلو کو فکر و غور کی آنکھوں سے دیکھا اور پرکھا ہے۔

استاذ محترم رشید احمد صدیقی نے، جن کی ساری عمر دشتِ علم کی سیاحی میں علی گڑھ میں گزری ہے۔ اپنے مخصوص، مختصر مگر بھرپور اور فکر انگیز انداز میں ایک موقع پر لکھا ہے۔

> "علم کا مفہوم میرے نزدیک جاننا پہچاننا ہی نہیں، جاننے پہچاننے کی ذمہ داری بھی ہے۔ جب تک کوئی معلم، علم کی برگزیدگی کو ماننے اور منوانے کی اہلیت نہ رکھتا ہو اس کو علم کا کاروبار نہ کرنا چاہیے، آجکل دنیا میں جو ہلچل اور افراتفری یا بے دلی اور بیزاری پھیلی ہوئی ہے اس کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ علوم اور ان کو پھیلانے کے لئے وسائل تو بہت بڑھ گئے لیکن اچھے معلم تقریباً ناپید ہیں جس کی وجہ سے علم اور بھی زیادہ خطرناک بن گیا ہے دنیا میں ہر مرض کی تیر بہدف دوائیں کیوں نہ ایجاد کر دی جائیں، اگر اچھے اطبا میسر نہ ہوں تو یہ دوائیں خطرے کا موجب بن سکتی ہیں یہی حال علوم کا ہے"[۱]

علم کی برگزیدگی قائم اور برقرار رہ ہی نہیں سکتی اگر معلمین برگزیدہ نہ ہوں، اکبر نے بھی یہی بات کہی ہے اور بہت پہلے کہی ہے کاش یہ بات مذاق مذاق میں نہیں سنجیدہ لب و لہجہ میں کہی گئی ہوتی :-

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں　　آدمی آدمی بناتے ہیں

جستجو ہم کو آدمی کی ہے　　وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

تعلیم و تدریس کے بارے میں اگر اکبر کی یہی ایک بات گرہ میں باندھ لی جائے تو یقین جانئے کہ بیڑا پار ہے۔ ہم خود تو باندھنے سے رہے حکومت البتہ بندھوا سکتی ہے۔ آج یہ شکایت عام ہے کہ تعلیم کا معیار روز بروز گرتا جا رہا ہے۔ لیکن اس بات پر توجہ کا احساس دور دور نظر نہیں آتا کہ معیاری بنائیے یا کیجئے کہ اچھی تعلیم کے لئے محض کتابیں (کورس) کافی نہیں۔ اچھے معلمین کی بھی ضرورت ہے۔ اچھے معلمین یا اساتذہ وہی ہو سکتے ہیں جو پڑھے لکھے ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے آدمی بھی ہوں۔ پڑھے لکھوں کی خدا کے کرم سے ہمارے یہاں کمی نہیں، گلی گلی، کوچہ کوچہ اور قریہ قریہ میں نہ سہی شہر شہر میں تو ایک دو نہیں، سیکڑوں، ملکی تو ملکی، غیر ملکی کارخانوں ٹکسال کے بنے ڈھلے، ملک ملک کی یونیورسٹیوں کی چھاپ لگائے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں قوم کے بچوں کی دنیا سنوارنے کے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔ لیکن ان میں کتنے ہیں جو اچھے آدمی ہونے کے ساتھ اپنے معیار پر بھی پورے اتر سکیں۔

بات معیار کی نہیں ہو رہی ہے۔ اپنے معیار کی ہو رہی ہے یہی بات تو توجہ کی سب سے زیادہ مستحق ہے۔ اس موقع پر نہ جانے کیوں اکبر کا یہ شعر ذہن میں ٹپک پڑا اور جب ٹپک ہی پڑا ہے تو پھر آپ بھی اس رمح پرور شراب کے کیف سے کیوں محروم رہیں۔

مرعوب ہو گئے ہیں ولایت سے شیخ جی　　اب صرف منع کرتے ہیں دیسی شراب کو

---

[۱] ہم نفسانِ رفتہ ص ۲۲ - ۲۳

لیجئے ایک گھونٹ اور سہی :-

اسی کو پڑھئے اسے سمجھئے جو پیشتر عرض کر چکا ہوں
جو اس میں ہی تازگی نہیں ہے کلامِ تازہ کہاں سے لاؤں

طالب علموں کی بات چھوڑئے، صرف معلمین کی جماعت کو نگاہ میں رکھئے اور سوچئے کہ ان میں کتنے ہوں گے جنھوں نے تحصیل علم کے دوران معیار اور اپنے معیار کے فرق پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ یہی ہمارے ملک کی سب سے بڑی محرومی ہے۔

دیس بدیس کی دھنوں میں گنگنانا اور گانا اور اپنے دیس کی بھول جانا یہ کہاں کی اور کیسی ترقی اور ترقی پسندی ہے ؎

رقیب سرٹیفکٹ دیں تو عشق ہو تسلیم — یہی ہے عشق تو اب ترکِ عاشقی اولیٰ

ملک ملک، قوم قوم، اور مذہب مذہب کی اپنی اپنی کچھ ایسی قدریں بھی ہیں جو ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتیں، انھیں قدروں کی بدولت ان کی انفرادی حیثیت قائم و برقرار ہے۔ اس انفرادی حیثیت کو قائم اور برقرار رکھنا ہے تو ہمیں اپنی (اسلامی) قدروں کے تحفظ، بقا اور اشاعت کے لئے جدوجہد کرنی ہی ہوگی، ہمیں "جینا ہی نہیں ہے مسلمان بن کر جینا ہے۔"

خودشناسی اور خودآگاہی کے لئے اکبر مذہبی درس کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب کی پیروی سے آخرت ہی نہیں بنتی دنیا بھی سنور سکتی ہے۔ سائنسی طاقت کے وہ منکر نہیں، لیکن مذہبی طاقت کو وہ زیادہ فعال اور مسلمانوں کے لئے "کارکشا و کارساز" سمجھتے ہیں۔ حکیم الامت اقبال نے جن خیالات کا اظہار عقل اور عشق کی علامتوں سے کیا ہے۔ اکبر نے کم و بیش انہیں خیالات کو سائنس اور مذہب کے "بادہ و ساغر" میں ہمارے سامنے رکھا ہے۔ اقبال نے عقل اور عشق کے کرشموں کے تفاوت کو بڑی صناعانہ چابکدستی سے اس طرح پیش کیا ہے ؎

بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

اکبر نے سائنس اور مذہب کی توانائیوں کے فرق کی وضاحت باتوں باتوں میں یا بقول رشید احمد صدیقی ہر جگہ انداز میں کی ہے ؎

جان لینا سہل ہو سائنس کا کرتب ہے یہ — جان دینا سہل ہو یا ضد ہے یا مذہب ہے یہ

اقبال نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک ایسے تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جسے ہم نے سنا ہے۔ کتابوں میں دیکھا ہے اور جس پر ہمارا ایمان ہے۔ اکبر نے جو کچھ کہا تھا۔ اتفاق حسن دیکھئے۔ اس کا ثبوت ہندو پاکستان کی حالیہ سترہ روزہ جنگ میں دنیا نے دیکھ لیا۔ اس آڑے وقت میں کون ہمارے کام آیا؟ سائنس یا مذہب؟

سائنس انسان کو تباہی اور بربادی پھیلانے والے ہتھیاروں سے لیس تو ضرور کر سکتی ہے۔ لیکن مجاہد (سرفروش) نہیں بنا سکتی۔ وہ خلاؤں میں لے جا سکتی ہے۔ ممکن ہے ستاروں تک بھی ہمیں پہنچا دے، لیکن "جذبہ" کی دولت عطا نہیں کر سکتی، "جذبہ" جس کے حضور میں عرش و فرش دونوں لرزاں اور ہراساں رہتے ہیں۔ وہ "ہمت مردانہ" جس سے علامہ اقبال نے "یزداں بہ کمند آور" کی التجا کی تھی۔ کس کا طفیل ہے؟ اس کے سوتے کہاں سے پھوٹتے ہیں؟ ان سوالوں کا ایک اور صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ ہے "جذبہ"

اکبر کی عقابی آنکھوں کی تیز نگاہی کے صحیح اندازے کے لئے "تعلیمی مسائل" پر ان کے تمام فرمودات کو یکجا کر لینا ہی کافی

نہیں، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں سے ہر ایک پر ٹھنڈے دل سے تنقیدی نگاہ ڈالی جائے۔

تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں وہ کیا ہے فقط بازاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے

نجد میں بھی مغربی تعلیم جاری ہوگئی — لیلےٰ و مجنوں میں آخر وجداری ہوگئی

صیاد ہنر دکھلائے اگر تعلیم سے سب کچھ ممکن ہے — بلبل کے لئے کیا مشکل ہے الّو بھی بنے اور خوش بھی رہے

موت سے ڈرتے ہیں اب پہلے تو یہ تعلیم نہ تھی — کچھ نہیں آتا تھا اللہ سے ڈرنے کے سوا

کون کہتا ہے کہ تعلیم زناں خوب نہیں — ایک ہی بات فقط کہنا ہے، یاں حکمت کو
دوا سے شوہر و اطفال کی خاطر تعلیم — قوم کے واسطے تعلیم نہ دو عورت کو

نئی تعلیم کو کیا واسطہ ہے آدمیت سے — جنابِ ڈارون کو حضرتِ آدم سے کیا مطلب

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
ذی علم و متقی ہوں جو ہوں ان کے منتظم — استاد اچھے ہوں مگر استاد جی نہ ہوں

خدا پرست بنائے گا کیا وہ لٹریچر — کرے جو طبع کو بے قید اور گناہ پسند

رخصت ہو جو علم دین تو پھر دین بھی جائے — گل ہو جو چراغ، ابھی ہو پگڑی غائب

حاصل کرو علم، طبع کو تیز کرو — باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو
قومی عزت ہے نیکیوں سے اکبر — اس میں کیا ہے کہ نقلِ انگریز کرو

فقط مرا ہاتھ چل رہا ہے انھیں کا مطلب نکل رہا ہے — انہیں کا مضمون، انھیں کا کاغذ، قلم انھیں کا دوات انکی

راہِ مغرب میں یہ لڑکے لٹ گئے — واں نہ پہنچے اور ہم سے چھٹ گئے

نعرۂ قومی کا مطلب آج کل ہے ہر سٹی — ناں ہے ذکرِ ترقی۔ سم ہے یونیورسٹی
دین کی الفت دلوں سے انکے یونہی گر مٹی — مسلم اُٹھ جائیں گے رہ جائیگی یونیورسٹی

نئی نئی لگ رہی ہیں آنچیں یہ قوم بیکس پگھل رہی ہے
نہ مشرقی ہے نہ مغربی ہے عجیب سانچے میں ڈھل رہی ہے

وہ باتیں جن سے قومیں ہو رہی ہیں نامور سیکھو — اٹھو تہذیب سیکھو، صنعتیں سیکھو، ہنر سیکھو

بڑھاؤ تجربے اطرافِ دنیا میں سفر سیکھو — خواصِ خشک و تر سیکھو، علوم بحر و بر سیکھو
خدا کے واسطے اے نوجوانو ہوش میں آؤ — دلوں میں اپنے غیرت کو جگہ دو جوش میں آؤ

ہم ایسی کُل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

ٹیکنیکل ایجوکیشن کی ضرورت اور اہمیت کو اس زمانے میں جب کہ "ترجموں اور کتابوں کی نقل" کو ہی "عقدہ کشائی قوم" کا واحد اور آخری ذریعہ سمجھ لیا گیا تھا۔ کس نے سب سے پہلے محسوس کیا۔

لڑکوں اور لڑکیوں کے تعلیمی مسائل پر، اکبر جیسی گہری نظر اور کس کی پڑی تھی؟۔

اور ایجوکیشن کے خطرناک نتائج سے باخبر کرنے والی پہلی آواز کس کی تھی؟۔

کراچی یونیورسٹی کا حالیہ مبارک اقدام کیا اس بات کا کھلا ثبوت نہیں کہ اکبر کی یہ آواز رائیگاں نہیں گئی۔

لڑکیوں کی تعلیم ضروری اور ازلیں ضروری ہے۔ جاہل عورتیں اچھی مائیں، بہنیں اور بیویاں اور بیٹیاں نہیں بن سکتیں لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ انہیں لڑکوں کے دوش بدوش لا کھڑا کر دیا جائے، جب دونوں کا دائرۂ عمل، فرائض اور ذمہ داریاں ایک جیسی نہیں تو پھر یکساں تعلیم اور یکساں نصاب سے ان کی ضرورتیں جو قطعاً الگ الگ ہیں۔ کیسے اور کس طرح پوری ہو سکتی یا کی جا سکتی ہیں۔ اور پوری ہوتی بھی ہوں تو کیا یہ بھی ضروری ہے کہ تعلیم مخلوط ہو۔ ان کے لئے الگ تعلیمی ادارے قائم نہیں کئے جا سکتے!

لیکن ان باتوں پر توجہ کون کرے، ان سوالوں کا جواب کون دے۔ کس کے پاس اتنا وقت ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر زندگی کے قیمتی لمحات ضائع کرے۔ ترقی کی دوڑ میں ہم یونہی بہت پیچھے ہیں، ایسی صورت میں اگر ان معمولی معمولی باتوں پر توجہ کی جائے۔ تو ظاہر ہے کہ ہمارا کیا حشر ہوگا۔

ہمارے آقا، انگریز آئے اور چلے بھی گئے، لیکن جاتے جاتے غلاموں کو یادگار کے طور پر دو ایسی انمول نشانیاں دے گئے جو شاید رہتی دنیا تک ہمارا پیچھا نہ چھوڑیں گی اور پنپنے نہ دیں گی، ان میں سے ایک ہے لفظِ ترقی اور دوسرا آزادی۔ ہمیں کسی اور نے نہیں بس انہیں دو داؤں نے مارا اور مار رکھا ہے۔

ایک دور تھا جب مولانا حالی کا یہ مشورہ :۔ کہ

"چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی"

سبھوں نے سنا، اس پر عمل بھی کیا اور ایمان کی بات ہے کہ اس سے خاطر خواہ فائدہ بھی اٹھایا۔ اور اکبر کی یہ بات سے

ناز کیا اس پہ جو بدلا ہے زمانے نے تمہیں
مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

سُنی اَن سُنی کر دی گئی۔ مادی طاقت نے ایمانی قوت کا خوب خوب مضحکہ اڑایا۔ دنیا کی ہوس نے دین و مذہب کو طاقِ نسیاں پر رکھ دیا۔

لیکن ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ دور یا زمانہ ۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کے بعد ختم ہو چکا ہے۔

اکبر کا زاویۂ فکر و فن

(ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی)

اکبر کی تاریخی اہمیت سے تو کسی کافر ہی کو انکار ہوگا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ تاریخی اہمیت کس نوع کی ہے۔ ادب میں تاریخی اہمیت دو طرح کی ہوتی ہے ایک تو وہ ادیب و فنکار ہیں جو ایک خاص عہد میں پیدا ہوئے۔ ان کی شخصیت اور ان کی شاعری کے موضوع پر اس زمانے کی معاشرت اخلاق اور اس دور کے باشندوں کے عقائد و خیالات کا اثر پڑا ہے موجودہ دور میں چونکہ وہ معاشرت اور وہ عقائد و خیالات نہیں رہے۔ اس لئے اس دور کے انسانوں کے لئے ان کا موضوع غیر مانوس اور اجنبی ہے لیکن فنکار کا فن بذات خود اتنا عظیم ہے کہ ہم اس کی ادبی تخلیق سے وہی لطف اٹھا سکتے ہیں جو آج کے ایک بہترین شہ پارے سے۔ یہ اور بات ہے کہ آج کا ادب ہمارے احساسات سے بھی ہم آہنگ ہو سکتا ہے اور اسے پڑھتے وقت بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ "گویا یہ بھی اپنے دل میں ہے" اور قدیم ادب کے مطالعہ کے وقت قاری کو ایک ذہنی سفر کرنا پڑتا ہے اور یہ ذہنی سفر بڑا صبر آزما اور دشوار ہوتا ہے۔ اسی لئے اساطیری ادب کے مطالعہ سے قبل ہمیں بہت سی چیزوں کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ نئے ادب سے تو ایک معمولی استعداد کا آدمی بھی لذت اٹھا سکتا ہے اور اس میں اس کی اپیل کا کافی سامان براہ راست موجود رہتا ہے لیکن پرانے ادب کو سمجھنے اور اس سے لطف اندوز ہونے کے لئے کافی پڑھا لکھا ہونے کی بھی ضرورت ہے ایسا ادب اگر ہم تلاش کریں تو ہومر کی ایلیڈ، ورجل کی اینیڈ، کالی داس کی شکنتلا مذہبی صحیفوں میں مہابھارت اور رامائن وغیرہ میں اور داستانوں میں الف لیلہ، طلسم ہوشربا، داستان امیر حمزہ وغیرہ میں مل جاتا ہے، اسی طرح گوئٹے، دانتے اور ملٹن وغیرہ کی شاعری کا بھی زیادہ تر حصہ ایسا ہے جس کا مطالعہ کرتے وقت اس عہد کی روایات یونانی علم الاصنام اور پرانے تاریخی واقعات سے واقفیت ضروری ہے۔ دوسرے قسم کا تاریخی ادب وہ ہے جو محض انوکھا اور سب سے علیحدہ ہونے کی وجہ سے ناقابل فراموش بن جاتا ہے۔ یہ ادب چاہے ادبی اور فنی اعتبار سے بہت اعلیٰ نہ ہو لیکن اپنے اندر کوئی نہ کوئی ایسی عجیب و غریب چونکانے والی بات رکھتا ہے کہ اس کا ذکر کسی نہ کسی طور لانا ہی پڑتا ہے اس قسم کا ادب نہ تو اپنے زمانے کی معاشرت و تمدن کی نمائندگی کرتا ہے اور نہ اس دور کے انسانوں کے رجحانات و مطالبات کی بلکہ یہ صرف اپنی نمائندگی کرتا ہے یعنی شاعر یا ادیب کی شخصیت اور اس کے ذہن میں جو کچھ، جو انوکھا پن، بات میں بات نکالنے کا ڈھنگ، کسی قسم کی ضد، ہٹ دھرمی، تعصب یا کلیت ہو اس کا مظاہرہ اس ادب میں پورے طور پر ہوتا ہے۔ اکبر کے آرٹ اور ان کی شاعری کی تاریخی اہمیت یہی دوسرے نوع کی تاریخی اہمیت ہے۔

بہت سے حضرات تو اکبر کو مفکر، مصلح، پیغمبر اور نہ جانے کیا کیا سمجھتے ہیں اور بہت سے ان کی شاعری کو بھی میر، غالب، اقبال وغیرہ کی صف میں لا کھڑا کرتے ہیں لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کیا اکبر کی شاعری میں عظمت کا کوئی عنصر ملتا ہے۔ اکبر کے تمام کلیات پڑھنے

کے بعد پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے مخصوص رنگ سے ہٹ کر کچھ ایسی غزلیں اور اشعار بھی لکھے ہیں جن میں عشق و محبت، تصوف و روحانیت، اور کچھ دوسرے سنجیدہ عناصر ملتے ہیں لیکن ان کی شاعری کے اس حصے میں زیادہ تر چیزیں برائے بیت ہیں، ان میں نہ تو کوئی انفرادیت ملتی ہے اور نہ وہ شدت احساس جو ان کی اس شاعری پر ان کی شخصیت کی مہر لگاتی۔ اکبر کی نمائندہ شاعری تو ان کی وہی شاعری ہے جسے بعض طنزیہ کہتے ہیں اور میرے نزدیک اس میں ایک معمولی درجہ کی بذلہ سنجی اور ہلکی پھلکی ظرافت کے سوا کچھ نہیں ملتا اور یہ ظرافت بھی ایسی ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا جائے گا اس کے اثر کی نوعیت بدلتی جائے گی یعنی اب تک تو خیر یہ بھی ہے کہ اگر کوئی کوٹ پتلون، ریل، انجن، بجلی اور بھاپ کا مضحکہ اڑائے تو ہم بھی تفریح طبع کی خاطر اس ہنسی میں شامل ہو جاتے ہیں اگرچہ جانتے ہیں کہ جس ہنسی میں ہم شامل ہو رہے ہیں، اس میں ہنسی کا محرک موضوع نہیں ہے بلکہ ظرافت کا انداز اور چند لفظی الٹ پھیر ہیں لیکن آئندہ جب جدید تمدن اور معاشرت پرانی تمام چیزوں کا نام و نشان بھی مٹا دے گی تو ہم ایسی ظرافت پر ویسے ہی

آج کے زمانے میں کوئی تیمور درعات کا آدمی پیدا ہو جائے یا الف لیلہ و طلسم ہوشربا کے زمانے کا اور ریل، تار، بجلی کی روشنی، ہوائی جہاز اور ریڈیو کو دیکھ کر قہقہہ لگائے یا خوف سے سہم جائے کہ یا خدا قیامت قریب ہے تو اس کو ہم کچھ تعجب اور رحم کے انداز میں دیکھنے لگیں گے۔ اس قسم کی شاعری کو پڑھ کر تو نیا انسان یعنی سائنسی دور کا انسان اپنا سر پیٹ لے گا کہ کسی زمانے میں اس قسم کے لوگ موجود تھے، جنوں، پریوں اور اڑن کھٹولے والے دور کے انسان کو تو معاف کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ آج زمین پر اُتار دیا جائے اور وہ نئی چیزوں پر حیرت کا اظہار کرے یا سراسیمہ ہو جائے لیکن ایک نئے اور ارتقائی عہد میں اسی زمانے کا انسان جب سراسیمہ ہوگا یا قہقہہ لگائے گا تو یہ سوچنا ہوگا کہ آیا اس کے دماغ میں کوئی فتور ہے یا اور کوئی بات ہے۔ حالانکہ اس قسم کے لوگوں کا تجزیہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے، ممکن ہے کہ آنے والے دور میں اس قسم کے لوگ نہ پیدا ہوں، لیکن ہمارے یہاں اب بھی ایسے بڑے بوڑھے پائے جاتے ہیں جو ایک خاص عمر کو پہنچ کر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھتے ہیں، ان میں ایک طرح کا چڑچڑاپن یا ہٹ دھرمی اور ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ سب سے بڑی چیز جو ان کی ذہنیت میں پیدا ہو جاتی ہے وہ یہ کہ نوجوانوں اور نئی عمر کے لڑکوں کو ہمیشہ شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ان کے چال چلن اور عادات و اطوار کی طرف سے انھیں خطرہ لگا رہتا ہے اسلئے وہ ان کی بات بات میں مین میخ نکالا کرتے ہیں۔ دیکھو کپڑے اس قسم کے نہ پہنو، بال یوں نہ ترشواؤ، فلاں فلاں جگہوں پر مت جاؤ، اور فلاں فلاں دوستوں سے مت ملو۔ یہ لوگ نوجوانوں سے نہ صرف یہ کہ بعض مطالبات کرتے ہیں بلکہ انھیں ہمیشہ یہ یقین رہتا ہے کہ ان کا لڑکا جہنم میں جا رہا ہے اور تباہی کے غار اس کے انتظار میں ہیں۔ ایسے لوگوں کی باتوں پر ہمارے نوجوان ہاں ہاں تو کر دیتے ہیں لیکن ان کو کچھ اہمیت نہیں دیتے اور اپنا کام کئے جاتے ہیں وہ کبھی ان سے چڑتے ہیں کبھی ہنس دیتے ہیں، بہانہ کر دیتے ہیں یا کنی کاٹ کر نکل جاتے ہیں، ان بزرگوں کے متعلق بول چال والی زبان میں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ "سٹھیا گئے ہیں یعنی انکی عمر اب ساٹھ سال سے زیادہ ہو چکی ہے۔

اکبر کی شاعری بھی یہی ساٹھ سال سے زائد والی شاعری ہے ان کے یہاں سنجیدہ ذہانت یا طنز کی اعلیٰ مثال ڈھونڈھے سے بھی نہیں مل سکتی۔

اکبر جس دور سے تعلق رکھتے ہیں وہ ہندوستان کا بڑا اہم اور نازک دور ہے۔ اگرچہ غدر اس لحاظ سے اہمیت رکھتا ہے کہ پرانی حکومت کا ٹمٹماتا ہوا چراغ ہمیشہ کے لئے گل ہو گیا، لیکن عوام کے لئے اس سے پہلے ہی ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے، جن میں پرانی قدریں ایک ایک کر کے مٹنے لگی تھیں اور ان کی جگہ نئی قدریں لے رہی تھیں۔ معاشرت، تمدن، اخلاق اور لوگوں

کہ ذہان پر تو اسی زمانے سے انگریزوں کا اثر پڑنے لگا تھا۔

جب ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ میں سراج الدولہ کو شکست ہوئی، اور انگریزوں کے قدم آہستہ آہستہ جمنے لگے اسی وقت سے ہندوستانی قوم پر انگریزوں کے علم ان کے رہن سہن ان کی تنظیمی قابلیت اور حکومت کرنے کی اہلیت ان کے کردار و اخلاق غرض تمام چیزوں کی برتری کا احساس پیدا ہونے لگا تھا لیکن اس احساس کے ساتھ پرانے دور کے خاتمہ کے وقت جو انتشار و ہیجان تھا اور جو شکست و ریخت کی علامات تھیں ان سے بھی ہمارے ذہن متاثر ہوئے۔ چنانچہ میر سے لیکر غالب تک سب کے یہاں اسی شکست و ریخت کے آثار ملتے ہیں لیکن غدر میں یہ شکست اپنی انتہائی منزل کو پہنچ جاتی ہے تو غالب جیسا شاعر بھی "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی شمع" کا ماتم چھوڑ کر نئی چیزوں کو اپنانے لگتا ہے جس کا سب سے بڑا ثبوت اس کے خطوط ہیں جو نہ صرف تکنیک کے اعتبار سے نئے دور کی پیداوار ہیں بلکہ ان میں زمانے کو سمجھنے اور پرکھنے کا انداز بھی ملتا ہے اس زمانے میں عام لوگوں کو بھی یہ احساس ہو چلا تھا کہ نئی تہذیب اور نئی تعلیم کو اپنانا ہی پڑے گا اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو انسانیت کے خلاف ہو البتہ اپنے کھوئے ہوئے سرمائے پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے قوم کو آہستہ آہستہ قوت بھی حاصل کرنا ہوگا اور اپنے پیروں پر کھڑا ہونا ہوگا۔ ہندوؤں میں راجہ رام موہن رائے اور مسلمانوں میں سر سید احمد خاں اسی احساس اور عوام کے اسی مطالبہ کی ترجمانی کرتے ہیں اور یہی مقصد ہے کہ حالی اور ان کے متبعین نے شاعری کی۔ مسدس حالی اس وقت کی مقبول ترین کتاب ہے جس میں یاس و افسردگی کو دیکھ کر حالی سے قوم نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ موجودہ زمانے میں جو امید کے آثار پیدا ہو گئے ہیں اور نئی حکومت اور نئی تہذیب کو اپنا کر ترقی کی راہ میں آگے بڑھنے کے جو امکانات ہیں انھیں بھی دکھایا جائے تو زیادہ کار آمد چیز ہوگی چنانچہ حالی کو یہ مطالبہ منظور کرنا پڑا اور مسدس کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کرنا پڑا۔ سر سید کے وہ مخالفین جو مذہبی حیثیت سے سر سید کے مخالف تھے ان کی مخالفت اس لئے نہیں تھی کہ سر سید ان انگریزوں کا ساتھ دیتے ہیں جو کوٹ پتلون پہنتے ہیں کانٹے چھری سے کھاتے ہیں اور جو اپنے ساتھ ریل، تار، انجن، بجلی، مشین، چھاپہ، ہوٹل اور اسپتال وغیرہ لے آئے ہیں بلکہ ان کی مخالفت کی ساری بنیاد سر سید کے مذہبی خیالات تھے جو قرآن و حدیث کی تفسیر کے بارے میں تھے۔ انھیں یہ ڈر تھا کہ کہیں سر سید قوم کو سدھارنے کی دھن میں مسلمانوں کا مذہب ہی نہ بدل دیں۔

بہرحال سر سید اور سر سید کے مذہبی مخالف دونوں مسلمانوں کے دو مختلف طبقوں اور جماعتوں کی نمائندگی کرتے ہیں اس لئے ان کے خیالات میں اجتماعی احساس ہے اور وہ دو طرح کے مطالبات اور رجحانات کہے جا سکتے ہیں لیکن اکبر کی شاعری کا جو موضوع ہے وہ اپنے زمانے کے کسی رجحان کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ چند افراد یا ایک فرد کی ذہنی کجروی کو ظاہر کرتا ہے اور ہم اسے اور بھی کج روی کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے خیالات کو ظرافت کے لباس میں پیش کیا گیا ہے اگر اکبر کو قدیم تہذیب و تمدن اور پرانے اقدار سے بے انتہا محبت تھی اور وہ ان سے متاثر ہوا کرتے تھے تو یقیناً انھیں اس طرح محسوس کرنا چاہیے تھا جس طرح سعدی نے بغداد کی تباہی کو محسوس کیا اور داغ نے جہاں آباد پر خون کے آنسو بہائے لیکن انھوں نے جو انداز اختیار کیا اس سے تو یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان میں پرانی تہذیب اور پرانی اقدار سے اتنی محبت نہ تھی جتنی نئی اقدار اور نئی چیزوں سے چڑھ تھی۔ ان کا یہ ایک فرضی رویہ ہے۔ کمزوری یا احساس کمتری کے بعد جو ایک جذبہ پیدا ہو جاتا ہے یا اپنی بات کو رد کئے جانے پر جو منھ چڑانے کی کیفیت ہوتی ہے اس کا مظاہرہ اکبر کی ظرافت میں ملتا ہے۔

اکبر کی شاعری میں انگریز، انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب سے جو نفرت ملتی ہے اس میں سیاسی شعور کو دخل نہیں ہے اگر سیاست ہو بھی تو وہ غلط منفی قسم کا جذبہ ہے جو اپنے زمانے کو نہ سمجھنے اور حالات کا تجزیہ نہ کر سکنے کا نتیجہ ہے۔ انگریزوں کے تسلط سے دراصل ہندوستان میں جاگیرداری اور شہنشاہیت کا خاتمہ ہوتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام شروع ہوتا ہے اس نظام کے ساتھ دو قسم کے دھارے بہہ رہے تھے اور دو طرح کے عناصر کام کر رہے تھے ایک طرف تو یہ نظام معاشی استحصال پر مبنی تھا دوسری طرف یہ نئی صنعت، نئی ایجادات، نیا فن تعمیر، نیا طرز تمدن و معاشرت بھی اپنے ساتھ لایا تھا اس میں پہلی چیز مخالفت کے قابل تھی اور دوسری چیز ایسی تھی جو اپنے اندر ترقی پسندانہ عناصر رکھتی تھی، جن لوگوں کے اندر سیاسی شعور تھا اور جو اس زمانے میں حالات کا تجزیہ کرنے اور قوم کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اس کا دکھ درد پہچاننے کی صلاحیت رکھتے تھے انھوں نے دوسرے قسم کے عناصر کو تو اپنانے کی کوشش کی اور پہلی قسم کے عناصر کے خلاف لڑنے اور ان پر قابو حاصل کرنے کے بارے میں بھی آہستہ آہستہ سوچنے لگے، لیکن اکبر کا معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے وہ اس نظام کے انھیں عناصر کی مخالفت اور استہزا پر کمربستہ ہیں جن میں ترقی پسند عناصر ہیں اور اس کے بارے میں کبھی زبان کبھی نہیں کھولتے جیسی کہ مثال ہے "دہلی دربار" پر نظم لکھتے وقت ان کا سارا طنز اور ساری ظرافت لپ کمپ اور لیڈی کرزن کے ناچ پر صرف ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ جب انگریزی تمدن اور مغربیت سے ہٹ کر جب کوئی بات انگریزی حکومت اور تاج برطانیہ کے متعلق آتی ہے تو اکبر کا قلم کوئن وکٹوریہ ایڈورڈ ہفتم اور جارج پنجم کی جوبلی اور جشن تاجپوشی کے موقعوں پر قصیدے لکھتا ہے اور ان کی سلامتی کے لئے دعائیں مانگتا ہے۔ اگر بھولے بھٹکے سے غیر شعوری طور پر وہ کوئی ایسا شعر یا قصیدہ لکھ جاتے ہیں جس میں انگریزی حکومت کی مخالفت کا کوئی پہلو نکل آتا ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کی ملازمت خطرے میں پڑ جاتی ہے تو وہ فوراً معافی مانگ لیتے ہیں اور اس کی توجیہہ یہ پیش کرتے ہیں کہ یہ سب باتیں برائے بیت اور محض ہنسنے ہنسانے کی خاطر ہیں ان سے حکومت پر نکتہ چینی مقصود نہیں۔ یہ ایک ایسا رول ہے جو اکبر کی شاعری کے محرکات کو سمجھنے میں بہت مدد دے سکتا ہے اور یہ بھی کہ ان کے یہاں کتنا خلوص اور کتنی گہرائی ہے اور آیا ان کے پاس کوئی نظام فکر ہے یا نہیں۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اکبر کو انگریزوں سے اتنی مخالفت نہیں جتنی ان ہندوستانیوں سے جو مغرب کی آئی ہوئی چیزوں کو اپناتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزوں کو تو ایسا ہونا ہی چاہئے تھا کیونکہ وہ ایک خاص ملک اور خطہ کے رہنے والے ہیں۔ ہندوستانیوں کی قسمت تو ان سے الگ ہے۔

هر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے		بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے، صابون بھی ہے
لیکن میں یہ پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی		یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

یعنی کوٹ پتلون، بنگلہ، پاٹ اور صابون صرف انھیں لوگوں کے لئے جائز ہے جو اتفاق سے یورپ کی سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں۔ ہندوستانی اگر اپنی دھوتی یا پاجامہ، پگڑی، ٹوٹے پھوٹے مکان اور نہانے کے طریقے میں کچھ ترمیم چاہتا ہے تو وہ قابلِ ملامت ہے۔ چنانچہ اکبر کا یہی منفی رویہ تھا جس کی وجہ سے نہ صرف وہ کوٹ پتلون، انجن، ریل، بجلی کی روشنی، مشین، چھاپ، اسپتال، کالج اور انگریزی تعلیم کی عمر بھر مخالفت کرتے رہے اور ان کا مضحکہ اڑاتے رہے بلکہ انھوں نے اس دور کی قومی تحریکوں کی مخالفت میں بھی سارا زور صرف کیا۔ غدر کے بعد سب سے بڑی قومی تحریک سرسید اور ان کے رفقاء کی تحریک تھی جو اپنے شعور اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لحاظ سے نہ صرف مسلمانوں کے احساس کمتری کا ازالہ کر رہی

تھی بلکہ انہیں آگے لئے جا رہی تھی۔ اکبر نے سر سید علی گڑھ کالج، علی گڑھ تحریک غرض ہر چیز کی مخالفت کی۔ اگرچہ اس مخالفت کا کوئی پائیدار اثر نہ ہو سکا۔ یہاں تک کہ اودھ پنچ گروپ کی وہ آواز جو جدید شاعری کے خلاف اٹھی تھی وہ بھی دب کر رہ گئی اور سر سید کے تجویز کردہ علاج کو مسلمانوں نے من حیث القوم تسلیم ہی کر لیا تو اکبر کو آخر زمانہ میں اپنے آرٹ کی بے وقعتی اور بے اثری کا احساس ہو گیا تھا چنانچہ انھوں نے سر سید کی وفات کے بعد یہ کہا کہ "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا" لیکن اس احساس کے باوجود ان کے اندر شعور اور سیاسی سوجھ بوجھ پیدا نہ ہو سکی اور وہ حالات کا تجزیہ نہ کر سکے۔

یہی وجہ ہے کہ سر سید کے بعد کی سب سے بڑی تحریک انڈین نیشنل کانگریس کی وہ مخالفت کرتے رہے اور مہاتما گاندھی کی جد و جہد کو مہمل سمجھتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ ۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۲ء تک وہ زندہ رہتے ہیں اور اس دوران میں برطانوی حکومت اپنے ہتھکنڈے دکھا چکی ہے۔ آزادی کی تحریک کتنی آگے پہنچ جاتی ہے اور اس کی راہ میں کتنے اونچے اونچے پہاڑ اور خون کے دریا بھی آجاتے ہیں، لیکن اکبر ہیں کہ "جلیانوالا باغ" مسجد شہید گنج، حادثہ کانپور، جنگ عظیم اور اس کے بعد کے اثرات سے منھ موڑ کر صرف کوٹ اور پتلون کا مذاق اڑاتے رہتے ہیں اور ساری جد و جہد قومی تحریک اور آزادی کی جنگ ان کو مہمل چیزیں معلوم ہوتی ہیں حالانکہ ان کی زندگی ہی میں ہمارے ادب میں حالی، شبلی، چکبست، سرور جہان آبادی، نوبت رائے نظر، پریم چند اور اقبال کا ادب فروغ پا چکا تھا، جس میں زندگی کے اثباتی پہلو ہیں جس میں تعمیری رجحانات اور ترقی پسندانہ افکار و خیالات ہیں اور جس میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جاندار اور صحت مند میلانات ملتے ہیں، پرانی تہذیب و تمدن کے اعلیٰ قدروں اور اخلاقی سرمائے سے کس کو محبت نہ تھی، حالی، شبلی اور اقبال اگر ایک طرف اسلام کے شاندار ماضی اس کے تاریخی جاہ و جلال اور قابل فخر تہذیبی کارناموں سے متاثر تھے اور بار بار مسلمانوں کو گذشتہ عظمت کا واسطہ دے کر نئے دور میں ابھرنے کی تلقین کرتے تھے تو دوسری طرف چکبست، سرور، اور پریم چند وغیرہ، بھیم، ارجن، کرشن، بدھ اور رام چندر کے کارناموں اور ان کی تعلیمات پر اتنا ہی ایمان رکھتے تھے جتنا کانگرس مہاتما گاندھی اور نئی اصطلاحات پر۔ اس لئے یہ کہنا کہ اکبر کو مشرقیت یا پرانی تہذیب سے کوئی فائدہ یا خاص لگاؤ تھا اور وہ خلوص دوسروں کے پاس نہیں تھا، غلط ہے۔ ورنہ کسی عظیم تہذیب کو مٹتے ہوئے دیکھ کر اس کا پجاری تو بہت بڑی تخلیق کرے گا اور اگر طنز نگار ہے تو اس کے طنز میں سطحی قسم کے لطیفے بازی اور چٹکلے نہیں ہوں گے بلکہ اس پر تو ہنسی کے بجائے آنسو نکل آئیں گے۔

اکبر الہ آبادی کے خطوط

بنام

مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت وزیر اعظم ریاست حیدر آباد

(تحسین سروری)

صاحبِ علم و فضل ہونا کسی طبقہ یا ذات کے لئے مخصوص نہیں ۔ جس شخص کو بھی موقع ملتا ہے وہ اپنی فطری صلاحیت کے مطابق اپنے جوہر نمایاں کرتا ہے ۔

عام خیال یہ ہے کہ متمول گھرانوں کے افراد ناز و نعم اور عیش و عشرت کی فراوانی کے باعث علمی استعداد حاصل نہیں کر سکتے ۔ اور جو بھی علمی کارنامہ ان کے نام سے منسوب ہوتا ہے وہ دوسروں کا زائدِ فکر ہوتا ہے ، لیکن یہ خیال سراسر غلط ہے ۔ یہ ضرور ہے کہ چند نام و نمود کے خواہش مند امرا نے ایسی اوچھی حرکت کی ہے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہر امیر کا یہی دستور رہا ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بعض مالک تخت و تاج بادشاہ اور امرائے سلطنت بڑے اعلیٰ درجے کے شاعر و انشا پرداز گزرے ہیں ۔ ہند و پاک میں شمال و دکن ، سندھ و پنجاب کے حکمرانوں اور ان کے امرائے پایۂ تخت میں دیکھ لیجئے ۔ ان میں کتنے ہی گرامی قدر شاعر و ادیب تھے اور ان کے عہد میمنت میں شعراء و علما کی دل کھول کر سرپرستی کی گئی ۔

دکن میں شروع ہی سے بہمنی ، عادل شاہی اور قطب شاہی سلاطین کے درباروں کی عالی مقام شعراء و علما اور دیگر صاحبانِ کمال رونق بڑھاتے رہے ہیں ۔ بادشاہ نہ صرف اہلِ فن کے سرپرست بلکہ خود بھی اعلیٰ درجے کے شاعر گزرے ہیں ۔ اورنگ زیب کی فتح گولکنڈہ کے بعد ، اگرچہ دکنی کلچر اور دکنی زبان و ادب کا شیرازہ بکھر سا گیا ۔ لیکن جو آثار دھندلے سے نقش کی صورت میں رہ گئے تھے وہ بعد کے زمانے میں تیار ہونے والی نئی عمارت کی بنیاد کا پتھر ثابت ہوئے ۔ رزم و پیکار کے ہنگامے فرو ہونے کے بعد آصف جاہی سلاطین کا دور حکمرانی شروع ہوا تو شمالی ہند کے علمائے ادب اور بلند پایہ شعراء کی سعی سے اقصائے دکن میں دوبارہ زبان و ادب کے امکانات روشن ہو گئے اور شمال و جنوب کے امتزاج سے ایک نئی صورت نکل آئی ۔

آصف جاہی سلاطین نے علوم و فنون کی ترقی کے جو سامان مہیا کئے اور ہنرمندوں جس فیاضی سے سرپرستی کی اس کی تفصیل بیان کرنے کا یہ موقع نہیں ، میں صرف اتنا عرض کروں گا کہ سلاطین آصفی اپنے کو مغل بادشاہوں کا جانشین سمجھتے تھے اور باتوں میں ہوں نہ ہوں قدردانیٔ علم و فن میں بے شک وہ مغلوں کے جانشین تھے ۔

تاریخ اور تذکروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ پایۂ تخت دہلی کے ضعف و زوال کے بعد سے شمالی ہند کے

صاحبانِ کمال قافلہ در قافلہ حیدر آباد جانے لگے ۔ ۱۸۵۷ء کے بعد سے تو سارے شمالی ہند کا مرکزِ عافیت حیدر آباد سمجھا جانے لگا ۔ حیدر آباد پر شمالی ہند کی اس یلغار کا سلسلہ آخری نظام حیدر آباد آصف جاہ سابع میر عثمان علی خاں کی بادشاہت کے خاتمے تک رہا ۔

اس تفصیل کا مطلب یہ ہے کہ مدت دراز تک جنوبی ہند کی یہ مسلم ریاست اہل فن کی آماج گاہ بنی رہی ۔ شعر و شاعری اور علم و عرفان کے عرصے تک چرچے رہے ۔ یہی وجہ تھی کہ والیٔ ریاست اور عمائدِ سلطنت سے لے کر عوام تک اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے ۔ حیدر آباد کے ایسے عمائد سلطنت میں مہاراجہ چندو لال شاداںؔ سے تو سب ہی واقف ہیں ۔ پھر ان کے پوتے کے نواسے مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت نے تو ایسی شہرت پائی کہ چندو لال کو بھی لوگ بھول گئے ۔

مہاراجہ شادؔ کو بچپن سے شعر و شاعری اور علم و ادب کا شوق تھا ۔ جب وہ اپنے نانا نریندر پرشاد کے وارثِ اعزاز و مناصب ہوئے تو انھوں نے اپنی دولت کا بڑا حصہ علماء و شعراء کے وظائف اور ترقیِ علوم و فنون کے لئے وقف کر دیا ۔

کشن پرشاد موروثی خدمت پیشکاری پر تو فائز تھے ہی ، اس کے علاوہ وزیر فوجِ آصفی ، مدار المہام پھر بعد میں وزیر اعظم بھی ہوئے ۔ مہماتِ وزارت و کار و بار امارت کے ساتھ ساتھ تصنیف و تالیف کا مشغلہ بھی جاری رکھا ان کی پچاسی ۸۵ سے زائد مطبوعہ کتابوں میں نظم و نثر کی ہر صنف موجود ہے ۔ امیر ابن امیر تھے ۔ لیکن طبیعت کے فقیر تھے خلعت وزارت زیب تن کئے درویشوں اور اللہ والوں کی جوتیاں اٹھاتے تھے ۔ سیکڑوں شاعر اور اہل قلم خواہ دکن کے ہوں یا شمالی ہند کے ان کے وظیفہ خوار تھے ۔ ان کے دربار میں ہر روز علمی مذاکرے اور فنی مباحثے ہوتے ۔ وہ میر محبوب علی خاں اور میر عثمان علی خاں دونوں کے زمانۂ حکمرانی میں وزیر سلطنت رہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جدید حیدر آباد کے تعمیر کار یہی دو حکمران تھے ۔ اور ان کے دست راست بلاشبہ مہاراجہ کشن پرشاد تھے ۔ ان کا ایک خطاب یمین السلطنت کتنا جچا تلا تھا ۔

سرکشن پرشاد کی عادت تھی کہ کسی سے غائبانہ تعلقات قائم ہونے کے بعد بھی سلسلۂ مراسلت منقطع نہ کرتے ۔ ہر خط بدست خود لکھتے ۔ اس طرح یہ بتانا مشکل ہے کہ ان کی مراسلت کس کس سے تھی ، غرض ان کی اس مراسلت کا سلسلہ کم و بیش ساٹھ سال کی مدت پر پھیلا ہوا ہے ۔ اب تک ان کے مکتوب الیہم کے جو نام دستیاب ہوئے ہیں ، وہ سب برصغیر کے نامور اور یگانۂ روزگار اصحاب ہیں ۔

ڈاکٹر محی الدین قادری زورؔ مرحوم نے مہاراجہ شادؔ اور مہاراجہ شادؔ کے مکتوب الیہم کے مکاتیب فراہم کر کے کئی مجموعے ترتیب دے تھے ۔ چنانچہ اسی سلسلے میں انھوں نے علامہ اقبالؔ ، اور مہاراجہ شادؔ کی باہمی مکاتبت کا مجموعہ ، شادؔ و اقبالؔ ، کے نام سے ۱۹۴۲ء میں شائع کیا تھا ، لیکن افسوس کہ دوسرے مجموعے زیور طباعت سے محروم رہ گئے ۔

مہاراجہ کے نام جن مشاہیر کے خطوط زورؔ مرحوم نے تیار کرلئے تھے وہ حسب ذیل ہیں :-

اکبر الہ آبادی ، عبد الجبار خاں آصفی رامپوری ، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی ، آغا شاعر دہلوی ۔ پنڈت رتن ناتھ سرشار ، سید علی حیدر نظم طباطبائی ، منشی تلوک چند محرومؔ ، نواب نصیر حسین خیالؔ ، عابد مرزا بیگم (ریختی گو) خواجہ حسن نظامی ، جوش ملیح آبادی ، نیازؔ فتح پوری ، مولانا ظفر علی خاں ، محمد الیاس برنی ۔ عبد الماجد دریا آبادی ۔

اور تاجور نجیب آبادی۔

خطوط کے یہ مجموعے ڈاکٹر زور مرحوم کے ذاتی کتب خانے میں تھے اور اس وقت غالباً ایوانِ اردو (کتب خانہ ادارۂ ادبیات اردو حیدر آباد دکن) میں موجود ہیں۔ خدا جانے وہ دن کب آئے کہ ان کی اشاعت کی صورت نکلے۔

کئی سال ہوئے۔ جب میں حیدر آباد گیا تھا، ڈاکٹر زور مرحوم کی عنایت سے میں نے خطوط کے یہ مجموعے دیکھے تھے۔ ان میں حضرت اکبر الٰہ آبادی کے مجموعۂ خطوط کو بڑی دلچسپی سے دیکھا۔ ان میں سے بعض یا اکثر خطوط زور صاحب نے سنہ ۱۹۲۵ء کے ماہ اپریل و ماہ مئی کے "سب رس" میں اپنے مختصر نوٹ کے ساتھ شائع کئے تھے لیکن بعض جگہ کتابت کی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ "رقعات اکبر" کا وہ مجموعہ بھی میں نے دیکھا ہے جو محمد نصیر ہمایوں کی ترتیب اور سر شیخ عبدالقادر کی تمہید کے ساتھ لاہور سے شائع ہوا تھا۔ اس پر سنہ طباعت نہیں ہے لیکن میرا خیال ہے یہ سنہ ۱۹۲۹ء میں چھپا تھا۔ اس مجموعے میں تو کتابت کی بے شمار غلطیاں ہیں۔ میں نے خطوط اکبر، (مشمولہ سب رس) رقعاتِ اکبر (مطبوعہ لاہور) اور مجموعہ خطوط اکبر (قلمی، ایوان اردو حیدر آباد) ان تینوں کو سامنے رکھ کر ایک مبیضہ تیار کر لیا تھا جو اب تک میرے پاس محفوظ ہے اور جسے میں "نگار پاکستان" کے اکبر نمبر میں شائع کرا رہا ہوں۔

"رقعات اکبر" میں مہاراجہ شاد کے نام حضرت اکبر کے دس خطوط ہیں لیکن مجھے یاد نہیں کہ "سب رس" میں مطبوعہ خطوط کی کیا تعداد تھی۔ میرے مبیضے میں پچیس (۲۵) خطوط ہیں۔

لاہور کے مجموعۂ خطوط کو چھپ کر چالیس سال ہو رہے ہیں، "سب رس" میں بھی رقعات اکبر کو چھپ کر چوبیس (۲۴) سال ہو گئے ہیں لہٰذا اگر کچھ خطوط دوبارہ چھپ رہے ہیں تو اس کو قندِ مکرر سمجھنا چاہئے۔

اکبر کے خطوط میں بھی علامہ اقبال کی طرح یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ مہاراجہ شاد کی وزارت و امارت سے مرعوب نہیں تھے بلکہ شاد میں جو نیک نفسی، فقیر منشی اور سادگی تھی۔ اس کے وہ گرویدہ تھے۔ تصوف و طریقت کا مذاق بھی، دوستی اور یگانگت کا باعث تھا۔ مہاراجہ تو مدعی تھے کہ انھوں نے صوفیائے اہل اسلام سے فیض پایا تھا، اور اس ادعا پر اس زمانے کے شمال و دکن کے علما بلکہ، اہل اللہ نے صاد بھی کر دیا تھا، لیکن مجھے نہیں معلوم کہ کوئی پاک طینت ہندو اسلامی تصوف کا مسلک اختیار کر سکتا ہے یا نہیں۔ اکبر الٰہ آبادی، خواجہ حسن نظامی اور علامہ اقبال نے تو شاد کو صوفی مان لیا تھا۔

فی الحال یہ بتانا مشکل ہے کہ شاد و اکبر کے مراسمِ دوستی کی ابتدا کب اور کن حالات میں ہوئی۔ اندازہ یہی ہے کہ خود مہاراجہ شاد نے اکبر کو پہلے خط لکھا ہوگا، اس لئے کہ وہ بعض وقت مشاہیر شعرا و علما کو کسی علمی مسئلے کے بارے میں خط لکھا کرتے تھے، یا پھر ایسا بھی ممکن ہے کہ خواجہ حسن نظامی کے ذریعہ باہمی تعارف کا مرحلہ طے ہوا ہو۔

ظاہر ہے کہ حضرت اکبر کبھی حیدر آباد نہیں گئے۔ گو یا مراسلت کے ذریعہ ہی تعلقات استوار ہوئے تھے۔ البتہ سلسلۂ مراسلت کے قائم ہونے کے بعد ایک دفعہ خود مہاراجہ شاد الٰہ آباد جا کر حضرت اکبر سے ملے تھے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۱۳ء میں کشن پرشاد نے شمالی ہند و پنجاب کا سفر کیا تھا جس کا انھوں نے "سیر پنجاب" کے نام سے سفر نامہ بھی لکھا، اور یہ اس قدر مقبول ہوا کہ حیدر آباد، کانپور اور علی گڑھ سے اس کے تین ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اسی سیر پنجاب میں حضرت اکبر سے شاد نے اپنی ملاقات کا واقعہ درج کیا ہے۔

"سیر پنجاب" (۴۹) دن کا روزنامچہ یا سفر نامہ ہے۔ مہاراجہ مع اہل و عیال چند مصاحبین اور مختصر اسٹاف کو لے کر اسپیشل ٹرین کے ذریعہ حیدر آباد سے ۶ر جون سنہ ۱۹۱۳ء کو روانہ ہوئے۔ بمبئی۔ اجمیر شریف، دیرہ دون، ہردوار، اندکی

امرتسر، لاہور، گورک، شیتر، پانی پت، متھرا، آگرہ، کانپور، الہ آباد اور جبلپور ہوتے ہوئے ۱۳ر اگست ۱۹۱۳ء کو حیدرآباد واپس ہوئے۔ دورانِ سفر کئی اشخاص سے ملاقاتوں کا تذکرہ ہے۔ ان میں خواجہ حسن نظامی، مولانا ثناء اللہ مصنف تفسیر ثنائی، علامہ اقبال، مولانا حالی اور حضرت اکبر الہ آبادی سے ملاقاتوں کی تفصیل بھی موجود ہے۔ اسی طرح بعض ہندو اور مسلم اداروں کے معائنے اور بزرگان دین کے مزارات کی زیارت کا حال بھی لکھا ہے۔ ۳ر اگست ۱۹۱۳ء کے روز نامچے کی پوری عبارت یہ ہے۔

"الہ آباد میں میرا آنا زیادہ تر اکبر حسین صاحب اکبر پنشنر جج کی ملاقات کی غرض سے تھا لیکن اتفاق سے اسی زمانے میں ان کے جوان ہونہار فرزند نے انتقال کیا تھا جس کے صدمے سے وہ سوگوار تھے۔ صبح کو چھوٹی حاضری سے فارغ ہو کر بیٹھا تھا۔ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب آئے۔ حضرت موصوف کے ساتھ رام چند پرشاد کو لے کر اکبر حسین صاحب کے مکان پر جاکر ان سے ملاقات کی۔ نہایت زندہ دل، آشنا پرست عارف باللہ اور ہر فن مولا ہیں۔ بہت دیر تک لطفِ صحبت رہا۔ کلام ان کا درد سے بھرا ہوا ہوتا ہے مضامین بلند، بندش چست، صاحبِ دیوان ہیں۔ ۱۰ بجے کے قریب میں وہاں سے واپس ہوا۔ رام چند پرشاد اور اپنے ایک دوسرے مصاحب کو کوٹھی کے انتظام کے لئے حکم دیا۔ وہ دونوں گئے اور بعد تلاش بسیار لالہ رام چرنداس صاحب ______ کا رام باغ جو گنگا کے کنارے شہر سے کسی قدر فاصلے پر ہے دیکھ کر آئے اور مجھے اطلاع دی۔ رام چرنداس صاحب کھتری یہاں کے سربرآوردہ معززین سے ہیں۔ دولت مندی کے اعتبار سے بھی ممتاز ہیں۔ چار بجے خود رام چرنداس صاحب میرے پاس آئے اور ملاقات کی اور مجھ سے خواہش کی کہ میں ان کی رام باغ والی کوٹھی دیکھنے چلوں۔ چنانچہ میں نے موٹر منگوائی اور ان کو ساتھ لے کر مع مصاحبین رام باغ کی کوٹھی دیکھنے کے لئے گیا۔ موقع کے اعتبار سے تو وہ کوٹھی اس قابل تھی کہ اس میں ایک ہفتہ قیام کروں، لیکن دو وجہوں سے میں نے اس کو پسند نہیں کیا۔ ایک یہ کہ شہر سے زیادہ فاصلے پر تھی اور مجھے برخوردار عثمان پرشاد کی نادرستیٔ طبیعت کی وجہ سے بار بار ڈاکٹر کو بلانے کی ضرورت داعی ہوتی تھی۔ دوسرے اس میں اس قدر گنجائش نہ تھی کہ میرے زنانہ و مردانہ اسٹاف کے لئے کافی ہو سکے۔ وہاں سے واپس ہو کر بذریعہ ایک چٹھی کے لالہ رام چرنداس صاحب کی اخلاقی زحمت کا شکریہ ادا کیا اور فضل داد انگریزی محرر کو حکم دیا کہ جبلپور تک اسپیشل (ٹرین) کا فوراً انتظام کیا جائے اور ایک تار لالہ جیون داس گوکل چند سیٹھ جبلپور کو دیا کہ کرایہ سے کسی کوٹھی کا انتظام کریں۔ انگریزی محرر نے آکر رپورٹ دی کہ اسٹیشن ماسٹر ایک بجے شب تک اسپیشل تیار کر دینے کا وعدہ کرتے ہیں۔ گیارہ ۱۱ بجے شب کو مجھے اطلاع ملی کہ اس وقت اسپیشل کا انتظام نہیں ہو سکتا، کل ممکن ہے۔ چونکہ اسٹیشن پر ڈبوں میں مقیم ہوں۔ اتنے طولانی سفر میں مجھے کبھی ایسی تکلیف نہیں ہوئی جیسی الہ آباد اسٹیشن پر ہوئی ایک طرف تو برخوردار عثمان پرشاد کے ٹمپریچر بڑھنے سے فکر۔ دوسری طرف میری دوسری لڑکی میر خورشید علی کی بیوی کو شدت سے بخار آگیا، ادھر ملازمین کا سفر کی تکلیف سے بیدل ہونا۔ ایک طرف کوٹھی کی طرف سے مایوسی۔ ڈبوں کے دونوں طرف صبح سے شام تک تیز دھوپ اندر بدبو سے دماغ کی درگت

بہرحال میں بارہ بجے اپنی فسکر دن میں اُلجھ کر سو گیا ہے[1]

اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مہاراجہ شاؔد الٰہ آباد جانے اور حضرت اکبرؔ سے ملاقات کرنے کے بے حد مشتاق تھے۔ کیا عجب کہ انھوں نے اپنی آمد کی اطلاع بھی اکبرؔ کو پہلے سے دے رکھی ہو، لیکن یہ ضرور ہے کہ ان دونوں کی یہ پہلی اور آخری بالمشافہ ملاقات تھی۔ اس ملاقات کی یاد کو باہمی مراسلت کے ذریعہ ان بزرگوں نے تازہ رکھا۔

مہاراجہ کے حسب مرضی مکان کا انتظام نہ ہوا۔ ورنہ وہ اپنی خواہش کے مطابق ایک ہفتہ الٰہ آباد میں قیام کرتے اور ضرور وہ ہر روز حضرت اکبرؔ سے ملتے رہتے۔ اس طرح ان کے متعلق زیادہ معلومات ہمیں "سیر پنجاب" کے ذریعہ حاصل ہوتیں۔

اکبر اپنے خطوط میں حیدرآباد کے سفر کے آرزومند معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن مختلف مجبوریاں مانع رہیں۔

مہاراجہ شاؔد حضرت اکبرؔ کی ملاقات سے کس قدر متاثر ہوئے۔ سفرنامے میں چند ہی لفظوں میں لکھا ہے۔ البتہ اس ملاقات کا بھرپور تاثر اپنی چار غزلوں میں پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے اکبرؔ کے کمال فن کے پہلے ہی سے مہاراجہ معترف تھے، اب باہمی گفتگو اور سخن سرائی کے بعد ان کی شخصیت کا سکہ بھی ان کے دل پر بیٹھ گیا۔ دوسرے دن ۱۴ اگست کے روزنامچے میں شاؔد لکھتے ہیں:

> "صبح کو بیدار ہو کر اسپیشل کے انتظام کا پھر حکم دیا۔ چنانچہ دو بجے اسپیشل تیار ہوئی اور ہم یہاں سے جبلپور کو روانہ ہوئے۔ اثنائے قیام الٰہ آباد میں جس قدر حصہ نظم کا دل و دماغ سے نکلا ضیافت طبع ناظرین کے لئے پیش ہے۔"

پہلی غزل یکسر معرفت کی شراب میں ڈوبی ہوئی ہے۔ یقیناً یہ نتیجہ تھا حضرت اکبرؔ کی کسی غزل سے متاثر ہونے کا چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

کہتا ہے کون اس کو کہ وہ بے نمود ہے ہے سب نمود اُس کی، وہی لک وجود ہے
روزِ الست حق نے یہ تعلیم دی مجھے ہستی و بود میری، عدم کی نمود ہے
دودِ جگر سے میرے ہی یہ آسماں بنا روزِ ازل سے درد مرا یادود ہے
موجود ہو کے رہتا ہے آنکھوں سے وہ نہاں عین الوجود پر وہ عدیم الوجود ہے
بازارِ دہر میں ہے مشیّت کا انتظام ناشاد کیوں ہو شاؔد، زیاں ہے نہ سود ہے

افشا یہ ہوا راز مری بے خبری سے عالم کو تحیّر ہے تری جلوہ گری سے
بے خود ہوں، مگر پھر بھی ہوں خوددار میں اے شاؔد عالم ہے خبردار مری بے خبری سے

اکبرؔ کی غزل پر جو غزل کہی تو اس میں بعض شعر اکبرؔ کے رنگ میں بھی نکل گئے ؎

لبریز جام دیکھ کے نیّت بدل گئی زاہد کا نہ مدرہ گیا ساقی کی چل گئی
ذکرِ خدا میں شیخ تھے مصروف رات دن جلوہ جو مس کا دیکھا تو نیّت بدل گئی
ناکامیاب رہنے کا افسوس کیوں نہ ہو قابو میں اپنے آ کے وہ میڈم نکل گئی
لکھی غزل، غزل پہ یہ اکبرؔ کی رات کو اپنی بھی اہلِ سیف سے تلوار چل گئی

[1] سیر پنجاب (ص ۱۴۹ و ص ۱۵۰) طبع دوم ۱۹۱۵ء۔ نامی پریس، کانپور

ان تین غزلوں کے بعد ۱۰ اشعار کی ایک اردو غزل ہے جس کے بعد الہ آباد کا روز نامچہ ختم ہو کر جبلپور کے بیان سے آغاز ہوتا ہے۔
اس تفصیل کا مقصد یہ بتانا ہے کہ مہاراجہ سرکشن پرشاد سے جن اکابر نے تعلقات قائم کئے تھے۔ اس کی وجہ مہاراجہ کی وزارت والارت نہیں تھی، بلکہ وہ اہل کمال کے سچے قدردان اور خود بھی ایک صاحب کمال شخص تھے۔ اکبر، خواجہ حسن نظامی اور علامہ اقبال سے مہاراجہ شاد کی دوستی محض علمی و ادبی معاملات پر مبنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان تینوں کی باہمی مراسلت میں والہانہ پن اور بے غرضانہ انداز ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی کے جو خطوط میں پیش کر رہا ہوں۔ ان سے اکبر و شاد دونوں کی شخصیت کو سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے خود اکبر کے متعلق بعض ایسی باتیں ان خطوط میں ملتی ہیں کہ ان سے انکی سوانح ترتیب دیتے وقت مدد لی جا سکتی ہے۔ اکبر کے بعض اشعار اور غزلوں کے معرض وجود میں آنے کی تاریخ بھی ان خطوط سے معلوم ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے بھی حضرت اکبر کے یہ خطوط مجھے قابلِ اشاعت معلوم ہوئے۔

خطوط

الہ آباد ۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۱۲ء

عالی جناب مدظلہ

اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوں کہ آپ ایسے امیر با توقیر اور موحد روشن ضمیر اور عالم باعمل و تدبیر اور حکیم صاحب شرح و تفسیر کے دل میں میری جگہ ہے۔ اگرچہ آپ وفورِ بیان مسائل سے اپنی روحانی ترقی کرتے جاتے ہیں اور دنیاوی ترقی اس راہ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہے، تاہم ایسے آثار پائے جاتے ہیں کہ آپ کے ایوان دولت کی شمعیں روشن تر ہو جائیں۔

چند روز ہوئے آپ کے بھانجے صاحب نے سرفراز فرمایا تھا، سبحان اللہ ان کی قابلیت، اُن کے دل آویز اخلاق سے دل خوش ہو گیا۔ بزرگوں کے بڑے ہی کام ہوتے ہیں دنیا سے میں ایسا دل برداشتہ ہو گیا ہوں کہ کیا عرض کروں ؎

ہجر میں اس گل کے مجھ پر سانس لینا بار ہے
زندگی ظالم مگر اب تک گلے کا ہار ہے

اس مطلع سے تسکین ہوتی ہے ؎

یہ عمر کب تک وفا کرے گی، زمانہ کب تک جفا کرے گا
مجھے قیامت کی ہیں امیدیں جو کچھ کرے گا خدا کرے گا

ایڈیٹروں سے ناک میں دم ہے۔ بلقانیوں کے ظلم کے خیال سے کہیں میری زبان سے نکل گیا تھا ع

بحمد اللہ کہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

یہ اُس وقت کہا تھا جب صرف سرویا اور آسٹریا کی بحث تھی۔ دوسرا شعر صاف تھا ؎

بہت کیں سختیاں بلقانیوں نے بیگناہوں پر بالآخر چرخ ان کے سر کو زیر سنگ لایا ہے

ایڈیٹر صاحب مساوات نے یہ اشعار اس وقت چھاپے جب اعلان جنگ منجانب برٹش ہوگیا۔ ان پر اعتراض ہوا ہے۔ اگرچہ مجھ سے ہنوز کچھ نہیں کہا گیا تاہم کلفت ہوتی ہے۔ ایڈیٹر صاحب کی یہ بھی ارکاکت ہے کہ ان کے نام پرائیویٹ چٹھی آئی تھی۔ انھوں نے اس کو چھاپ دیا۔ خدا بلائوں سے نجات دے۔ سوسائٹی کا تعلق خواہ مخواہ مجبور کرتا ہے۔ اگر تندرست ہوتا تو جنگلوں اور پہاڑوں میں بھاگ جاتا۔ مجھ کو اب کرنا کیا ہے ؎

فکریں کبھی نہیں اس کی راحت مجھے بڑی ہو اب کہہ رہا ہوں یارب تکلیف میں کمی ہو

آپ کا ساتھ ہوتا تو شاید عافیت میں گذرتی۔ لیکن بہت دوری ہے۔ خدا کرے شرفِ حضوری میسر آئے۔ درباب مضامین تعمیل ارشاد میں کیا عذر ہو سکتا ہے۔ ذرا اطمینانِ خاطر ہولے۔ اگرچہ یہ بھی ظاہر ہے[1] کہ ؎

دل کی جو خواہش ہے وہ سامان ہونے کا نہیں
الغرض دنیا میں اطمینان ہونے کا نہیں

دُعاگو ۔ اکبر

الہ آباد ــــ ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۴ء

عالی جناب

دونوں نظمیں دلکش ہیں۔

دشمن کو محبت سے، مروت سے کرو زیر نکلا ہے کہیں کام فقط تیر و تبر سے

کیا عمدہ نصیحت ہے ع

شادا اب بہر خدا نغمۂ توحید سنا

اصل بات یہی ہے؛

کسی والا نامے میں آپ نے تحریر فرمایا تھا کہ پنجاب میں جنگ و اختلاف ہے اور انہی وجوہ سے میں نے مسلک توحید و صلح کُل اختیار کیا ہے یہاں بھی ہندو مسلمان، شیعہ سُنّی کی بحثوں نے پریشان کر رکھا ہے، توحید و صلح کُل کے مسائل کو برابر بیان فرماتے رہیے اور ان پر زور دیجئے۔ میرا خیال زیادہ تر آپ سے ملازمت حاصل کرنے کا یہی تھا اور ہے کہ ان امور پر زور دیا جائے اور عمدہ مضامین پیدا کئے جائیں پرسوں ایک مطلع ذہن میں آیا تھا۔ عرض کرتا ہوں۔ شاید پسند فرمایئے۔

نہ مستقبل کی سنتے ہیں نہ کچھ ماضی کی کہتے ہیں
جو اہلِ وجد ہیں وہ حال ہی کے ساتھ رہتے ہیں

یا یوں پڑھیے :۔ "حال ہی میں مست رہتے ہیں"

میرا دل تو اس خیال سے بہت تسکین پاتا ہے کہ آپ ایسا ذی علم، با اثر، با اقتدار رئیس ملک توحید و

---

[1] رقعات میں "میرا" نہیں چھپا۔

صلح کل کے مسئلہ پر متوجہ ہے۔[1]

حضور والا نے ایسے پاکیزہ اشعار موزوں فرمائے کہ حیرت ہوگئی۔ اور مرحبا و تحسین کا کلمہ بے اختیار زبان پر آیا۔ گیا کہوں بہت دور ہوں، ناتواں ہوں، کوئی باسلیقہ رفیق سفر ملتا تو خدمتِ عالی میں حاضر ہوکر چند روز غم غلط کرتا۔ میرے آرام کا اہتمام خدّام والا پر کچھ بار نہ ہوتا۔ قبل اس کے خود جناب نے ارادۂ تشریف آوری اور امید ملاقات کا اظہار فرمایا تھا۔ کاش یہ ارادہ پورا ہو۔

خاکسار : سید اکبر حسین

الہ آباد — ۷ر نومبر ۱۹۱۴ء

عالی جناب مدظلہٗ

آداب بجا لاتا ہوں۔ صحیفۂ مکرمت کا صدور باعثِ انبساطِ خاطر ہوا۔ نہایت شوق سے آپ کے مضمون کا منتظر ہوں جو اتحاد و توحید کے باب میں آپ نے پنجاب کے لئے تحریر فرمایا ہے۔ دنیا میں تمام خرابیوں کی جڑ شرک ہے[2] اسی[3] نے غیرِ خدا کو خدا بنا کر انسانوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ اگرچہ ہم کیا ہماری سعی کیا۔ دنیا کا مزاج ہی یہ ہے۔ خوب ہوتی تو دنیا کیوں ہوتی۔ لیکن بہر حال مسئلۂ توحید پر زور دیتے رہنا عمدہ ترین شغلِ زندگانی ہے۔ اگرچہ[4] میری ایک غزل میں یہ شعر ہے ؎

شرک چھوڑا تو سب نے چھوڑ دیا　　میری کوئی سوسائٹی ہی نہیں

اس غزل کے دو تین شعر اور عرض کردوں[5]، ایسا سامع کہاں پاؤں گا۔

چرخ سے کچھ امید تھی ہی نہیں　　آرزو کوئی دل نے کی ہی نہیں
چاہتا تھا بہت سی باتوں کو　　لیکن، افسوس اب وہ جی ہی نہیں
جرأتِ عرضِ حال کیا ہوتی　　نظرِ لطف اس نے کی ہی نہیں

خواجہ صاحب سے سفرِ دکن کی نسبت کوئی گفتگو نہیں ہوئی، ان سے ملنا ہی دشوار ہو رہا ہے۔ وقت ایسا نازک ہے کہ بدگمانیوں سے محفوظ رہنے کو لوگوں نے مکالمت و مجالست و زیارت احباب[6] سے کنارہ کشی کو اولیٰ سمجھا ہے۔ خصوصاً وہ زبانیں وہ طبیعتیں[7] جن پر یہ شعر[8] صادق آتا ہے۔

---

[1] رقعات اکبر (ص ۷۶) میں اس جملے کے بعد ذیل کی عبارت ہے۔ بظاہر یہ کسی دوسرے خط کا حصہ ہے۔
اگر اچھا رہا، ہمت بندھی تو خواجہ صاحب رفیقِ سفر کافی ہوں گے اور یوں تو آپ کی قدر دانی اور محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بے تکلف استمداد کروں گا۔ اللہ آپ کو شاد و بامراد رکھے
خاکسار
اکبر حسین
اس کے بعد کی عبارت جو سب رس میں ہے، وہ رقعات اکبر میں نہیں۔

[2] سب رس میں لفظ "ہے" نہیں۔ [3] سب رس میں "اسی لئے"۔ [4] رقعات اکبر میں "میری ایک غزل میں ایک شعر ہے" اور سب رس میں یہ جملہ یوں ہے "اگرچہ میری غزل میں ایک شعر ہے۔ [5] رقعات اکبر میں عرض کروں [6] سب رس میں "ان سے۔ [7] سب رس میں "احباب نے"، [8] سب رس میں "طبیعت [9] سب رس میں لفظ "یہ" نہیں ہے

دن بھر ایک ایک منھ کو تکتا ہے　　بات کرنے میں عیب لگتا ہے[1]

میں نے خود ہی خیال کیا تھا کہ کبھی ہمت بندھی، طبیعت میں توانائی پائی تو خواجہ صاحب کو اپنی معیت پر آمادہ کرلوں گا۔ میں آپ کی محبت اور قدر دانی کے مزے لیتا ہوں اور شکر گزار ہوں۔ کیا دل ہوگا، جس میں اس ناچیز کی جگہ ہے۔

الٰہی در جہاں باشی باقبال　　جواں بخت و جواں دولت جواں سال

خاکسار : اکبر حسین

الٰہ آباد۔ ۲۲ نومبر ۱۹۱۰ء

جناب والا مدظلہٗ

عید سے مجھ کو کیا نسبت، لیکن تبریک کے تار اور کارڈ کا شکر گزار ہوں، پریم بچن کا مضمون خوب ہے اکثر بزرگ ایک ایک کاپی لے گئے۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ سکھوں اور آریوں میں کیا وجوہ اختلاف ہیں اور اظہار مخالفت نے کیا پیرایہ اختیار کیا ہے۔

توحید پر مضامین و رسائل تحریر فرماتے رہیئے۔ بنی آدم ہمیشہ لڑیں گے، مگر موحد کا دل ٹھکانے رہے گا، اور کیا کچھ ترقیاں ہوں۔ اگر دل لگا رہے۔ خدا یا زمانے نے آپ پر یہ نعمت پیش کر دی ہے نہے نصیب خواجہ صاحب حیدر آباد تشریف لئے جاتے ہیں۔

خوشا خانہ کہ مہمانش تو باشی

افسوس کہ مجھ کو موقع معیت نہیں مل سکا، لیکن جب میں آپ کے دل میں ہوں تو حاضر ہی سمجھئے۔ میرے دل کو اس سے انبساط ہے کہ آپ قدر دانی فرماتے ہیں۔

دعاگو
اکبر

[3]

میں نے خود ہی خیال کیا تھا کہ کبھی ہمت بندھی۔ طبیعت میں توانائی پائی تو خواجہ صاحب کو اپنی معیت پر آمادہ کرلوں گا۔ میں آپ کی محبت اور قدر دانی کے مزے لیتا ہوں اور شکر گزار ہوں۔ کیا دل ہوگا جس میں اس ناچیز کی جگہ ہے۔

الٰہی در جہاں باشی باقبال　　جواں بخت و جواں دولت جواں سال

دعا گوئے شما : سید اکبر حسین

---

[1] سب رس میں اس شعر کے بعد یہ عبارت ہے جو رقعات اکبر میں کچھ اور ہو گئی ہے :-

"اگر اچھا رہا، ہمت بندھی تو خواجہ صاحب رفیق سفر کافی ہوں گے اور یوں تو آپ کی قدر دانی اور محبت کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ بے تکلف استمداد کروں گا۔ اﷲ آپ کو شاد و با مراد رکھے۔"

[2] رقعات اکبر میں ۲۶ نومبر ۱۹۱۰ء [3] سب رس میں یہ سطریں پانچویں خط کی صورت میں چھپی ہیں، لیکن رقعات اکبر میں ۷ نومبر ۱۹۱۰ء کا جو تیسرے نمبر پر خط ہے وہ اسی عبارت پر ختم ہوتا ہے۔

الہ آباد ۔ ۲۳ دسمبر ۱۹۱۴ء[1]

حضورِ والا

خواجہ صاحب سے یہ سن کر کہ میرے نہ آنے کا آپ کو افسوس ہوا ۔ دل بہت نازاں ہوا ۔

منکہ باشم کہ دراں خاطرِ عاطر گزرم　　لطفہا می کنی اے خاکِ درت تاجِ سرم

اس وقت حالت ایسی تھی کہ افسوسِ مفارقت ہی کا پہلو مفید تر تھا ۔ زندگی باقی ہے، اللہ کو منظور ہے تو یہ اُمید کبھی پوری ہی ہوگی کہ آپ سے باطمینان و تفصیل مکالمت و مجالست ہو ۔ علالت و ناتوانی پست ہمت کئے دیتی ہے ۔ دنیا کا کیا پوچھنا ۔ شانِ ظہور تو یہی ہے ۔ لیکن غفلت شکن اسباب اکثر عالمِ دل کو بدل دیتے ہیں رات[2] ایک مطلع بے ساختہ ذہن میں آیا ؎

سب سے بہتر کیا ہے انساں کو جو کرنا چاہئے
موت کا خالق جو ہے بس اُس پہ مرنا چاہئے

خواجہ صاحب کی خدمت میں تسلیم ، اس کے ساتھ ایک لطیفہ بھی

خواجہ سے کیوں کر نہ ہو نا بادری کو سوءِ ظن　　پیر ہی بے دخل کرتا ہے سدا اتوار کو

خاکسار ؛ اکبر

الہ آباد ۔ ۱۵ دسمبر ۱۹۱۴ء

حضورِ والا

مکرمت نامے سے سرفرازی[3] حاصل ہوئی ۔ کیا کیا شعر فرمائے ہیں ۔ مرحبا و صلِّ علیٰ

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار　　گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

خواجہ صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ خدمتِ سابقہ پر بحالی کی امید قائم ہوئی ہے ۔ خدا آپ کو فائز المرام اور حاشیہ بوسانِ بساطِ دولت کو شاد کام کرے ۔ آپ کا جمالِ باکمال اربابِ مذاق کے لئے ہر رنگ میں دلکش ہے ۔ بوریا پر بیٹھئے تو دنیا مرید ہے ۔ مسند پر بیٹھئے تو مصاحب ہے ۔ لڑنے کو نکلئے تو جان نثار ہے ، کچھ ارشاد ہو تو وجد میں آنے کو تیار رہے ۔

میری ناتوانی اور افسردگی روز افزوں ہے

آپ کا خیر طالب ؛ اکبر حسین

الہ آباد ۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۱۴ء

حضورِ والا

صحیفۂ عالی کے صدور سے پہلے ہی یہ شعر میرے ذہن میں آیا تھا ۔ امید ہے کہ آپ پسند فرمائیں ۔

شاد را دیدیم بالاتر ز اوجِ پیش کار　　ذوقِ درویشی است او[4] و[5] ہست با درویش کار

---

[1] رقعات اکبر میں ۲۷ دسمبر ہے ۔ [2] رقعات اکبر میں " رات کو " [3] رقعات اکبر میں سرفرازی ہوئی [4] رقعات اکبر میں " کہ " نہیں ہے [5] رقعات میں " ہست " نہیں ہے ۔

آپ کے خیالات سے مجھ کو تمام تر اتفاق ہے۔ اگر یہ خیالات نہ ہوتے تو افسوس ہوتا۔

نیا سال مبارک ہو

میں نزلے اور دانتوں کے درد میں مبتلا ہوں۔

نیازمند شکرگزار قدر افزائی
اکبر حسین

الہ آباد۔ ۸ / جنوری ۱۹۱۵ء

اللہ سلامت رکھے

مدت سے آپ کو عریضہ نہیں لکھا۔ نئے سال کی مبارک باد بھی رہ گئی۔ اچھا نہیں تھا۔ طبیعت کو انتشار رہتا ہے۔ جینے سے جی اکتا گیا ہے ؎

دل مرا جس سے بہلتا کوئی ایسا نہ ملا   بت کے بندے ملے اللہ کا بندہ نہ ملا

اللہ آپ تک پہنچائے میری عین آرزو ہے۔ میں آپ کو کیا خوش کروں گا۔ آپ البتہ مجھ کو خوش کریں گے۔ جیتا رہا، سفر کے قابل رہا، موسم موافق ہوا تو انشاءاللہ حاضر ہوں گا۔ میرا دل بڑھتا ہے۔ ناز کرتا ہے کہ آپ ایسے امیر باتوقیر اور دبیر بے نظیر ایسے شوق و محبت سے مجھ کو یاد فرماتے ہیں۔

خواجہ صاحب بہت زندہ دل اور خاطر نواز بزرگ ہیں۔ ان کے پولیٹیکل اور سوشل آب و رنگ کا اثر بلحاظ میرے مسکن و ماوی کے تعلقات کے البتہ میرے حق میں ناموافق ہوگیا ہے۔ کل وہ دہلی تشریف لے گئے۔

آپ کا نیازمند
سید اکبر حسین

آپ کو میں کچھ زیادہ لکھتا مگر اس وقت نہ لکھ سکا

الہ آباد۔ ۲۷ / جنوری ۱۵ء

عالی جناب مدظلہ،

آداب گذارش کرتا ہوں۔ زیادہ خموشی شاید ناشکری[1] کا ملزم ٹھہرائے۔ لہٰذا یہ عریضہ بغرض دریافت خیریت مزاج پیش کرتا ہوں۔ زندگی نے رخصت اور توانائی نے مایوس نہ کیا تو آرزوئے ملازمت انشاءاللہ برآئے گی۔ کیا عرض کروں۔ کس عالم میں رہتا ہوں۔ شکستہ دلی ایک طرف تردداتِ[2] ایک طرف۔ خواجہ صاحب ان روزوں احمد آباد میں ہیں۔

معلوم نہیں حیدرآباد میں کون موسم ہم لوگوں کے لئے بہتر ہے

سپاس گزار یاد آوری
اکبر

---

[1] رقعات اکبر میں "ناشکریہ"   [2] رقعات اکبر میں ترددات کی جگہ صرف نقطے ہیں۔

الٰہ آباد - ۱۰ر مارچ ۱۵ء

عالی جناب مدظلہٗ

۵ر فروری سے اس وقت تک میں نہایت غیر معمولی پریشانی میں جس کی تفصیل بھی (بیان) نہیں کر سکتا۔ مبتلا ہوں۔ اِس وجہ سے نیاز نامہ نہیں لکھ سکا۔ دِل میں ہر وقت آپ سے ملنے کا شوق قائم ہے۔ لیکن خدا اس پریشانی سے نجات دے اور آزادی حاصل ہو۔

۵ار مارچ کو ہز آنر نے یاد فرمایا ہے۔ میں دنیا سے بالکل بے تعلق ہو گیا ہوں، بایں ہمہ اوروں کے تعلقات اُلجھا دیتے ہیں۔ اللہ تعالےٰ جلد فراغِ خاطر نصیب کرے۔ ۱۵ر مارچ کے بعد انشاء اللہ بشرطِ زندگی پھر عریضہ لکھوں گا۔ یہ نیاز نامہ اس غرض سے لکھا کہ زیادہ غیر حاضری احسان فراموشی نہ سمجھی جائے۔ درحقیقت آپ کا کرم و احسان ہے کہ آپ مجھ شکستہ دل اور بے ہنر کی قدردانی فرماتے ہیں۔ تو زکِ خیال کے مضامین خوب تھے۔

خاکسار
اکبر حسین

۱۸ر اپریل ۱۶ء

الٰہی در جہاں باشی بہ اقبال
جواں بخت و جواں دولت جواں سال

حضور والا۔

جن تاریخوں میں مقدس ہردوار میں قیام کی تاریخیں متعین فرمائیں۔ ان کی اطلاع مجھ کو بھی ملے سرفراز نامے کا شکر گزار رہوں گا۔

۱۵ر کو ہز آنر سے ملا۔ موجودہ مباحث کی طرف متوجہ ہیں اور ہونا ہی چاہیئے۔

خاکسار - اکبر

(نوٹ:- اس خط کے بعد دو اور خط تھے جن کے نمبروں ۲۳-۲۴ کے چٹ فائل میں لگے ہیں مگر خط موجود نہیں)

مرتب

الٰہ آباد - ۱۴ر جون ۱۶ء

حضور والا - اللہ شاد و بامراد رکھے۔

اس شدت کی گرمی تھی کہ حواس بجا نہ تھے۔ عریضہ نہ لکھ سکا۔ آپ بے مثل شخص ہیں کہ آپ نے باوجود اس قابلیت اور اقتدار کے ہم ایسے گوشہ نشینوں اور دل شکستوں کو مہربانیوں، خوش اخلاقیوں اور دلنوازیوں سے ایسا وابستۂ دامنِ دولت کر رکھا ہے کہ آپ سے مراسلت میں ایک انبساط قلب محسوس ہوتا ہے

بڑائی اور بزرگی اور اعلیٰ قابلیت کی یہی پہچان ہے۔

یوں تو آپ کے ہر خط کی عبارت دلآویز ہوتی ہے، لیکن ایک دفعہ[1] آپ نے ایک فقرہ تحریر فرمایا تھا

---

[1] رقعات اکبر میں 'دفعہ' کی جگہ 'میں' ہے۔

کہ " آئیے ہم آپ کے دل کی سنیں آپ میرے دل کی سنیں " وہ اب تک یاد ہے اور ابھارتا اور اکسا تا رہتا ہے کہ شرفِ ملازمت[1] حاصل ہو، سچ یہ ہے کہ مجھے سب ضرورت اس کی ہے ۔ میری ایک نو تصنیف غزل کا ایک شعر یہ ہے ؎

گفتنی ہے دلِ پُر درد کا قصہ، لیکن — کس سے کہیے کوئی مستفسرِ حالات تو ہو

چونکہ آپ ذی علم اور صاحب دل ہیں ۔ اگر آپ سے ملتا ہو تو سنئے کہ کیا کیا مصائب گزرے اور گزر رہے ہیں ۔ فلک کے ہاتھ سے ابنائے جنس[2] کے ہاتھ سے ، وقتِ موجودہ کے ہاتھ سے ، خود اپنی نازک خوئی کے ہاتھ سے ۔ اگرچہ دنیا سے بے حد دل برداشتہ ہوں، تاہم کسی ہمدرد کا ملنا نعمت ہے ۔ دیکھئے کب موقع ملتا ہے ۔ بہرکیف دعا فرماتے رہئے کہ سکونِ خاطر میسّر ہو ، اصل چیز یہی ہے ۔ مجھ کو امید ہے کہ آپ ایک حصّہ اپنے وقت کا اپنے خالق کے دھیان میں بسر کرتے ہوں گے ۔

ایک صاحب کہتے تھے کہ حیدر آباد میں افواہ ہے کہ آپ وزارت پر سرفراز ہوں گے ۔ خدا وہ کرے جو آپ کے حق میں بہتر ہو ۔

خاکسار

اکبر

خواجہ صاحب حیدر آباد جانے والے ہیں ۔

الہ آباد ۔ ۵ر جولائی ۱۰ء

عالی جناب مدظلہٗ

آداب بجالاتا ہوں ۔ ڈیڑھ مہینے سے ڈاڑھ اور مسوڑھے کے درد میں مبتلا ہوں ۔ کبھی تخفیف ہوئی کبھی زیادتی ۔ لیکن اب چھ دن سے ایسی شدّت ہے کہ سجدہ نہیں کر سکتا ۔ اشارے سے سجدہ ادا کرتا ہوں کھانا چھٹ گیا ہے ۔ مشکل سے کچھ کھا پی سکتا ہوں ۔ ناتوانی زیادہ ہے ۔

والا نامہ جب صادر ہوا تو مجھ کو خیال آیا کہ دل کو دل سے راہ ہے ۔ کیونکہ میں ایک نیاز نامہ روانہ کر چکا تھا جو غالباً پہنچا ہوگا ۔ میں آپ کی توجہ کو اپنے حق میں ایک نعمت پاتا ہوں ۔ کاش آپ سے مکالمت و مجالست کا موقع ملتا تو میری زندگی ہو جاتی ۔ اس وقت مُردوں سے بدتر ہوں ۔

چند عرصے سے میں اپنے اشعار اخباروں میں نہیں بھیجتا ۔ بلحاظ حالات دل ہی نہیں ابھرتا ۔ خرافات کا ذخیرہ ہو گیا ہے ۔ کبھی حواس درست ہوئے تو پیش کروں گا ۔ دل سے تو اب ایسے ہی اشعار نکلتے ہیں

اب کیا میں طلبِ دنیا کی کروں کیوں زحمت اٹھاؤں اس کے لئے

دل کہتا ہے اور سچ کہتا ہے کے دن کے لئے اور کس کے لئے

یہ گوش و زبان و چشم چمن، غوغائے جہاں سے فارغ ہیں

کرتا ہوں دعائیں گل کے لئے، سوسن کے لئے، نرگس کے لئے

ہو تم کو مبارک شوقِ نمود افسردہ پڑا رہنے دو مجھے

بیکس کو ہے کافی داغِ جگر تم شمع بنو مجلس کے لئے

---

[1] رقعات اکبر میں " شرفِ ملاقات " [2] رقعات اکبر میں ابنائے جنس کی جگہ " دنیائے خسیس " ہے

خود گوارا نہیں فریاد کا یہ جوش مجھے | کر بھی چکتی اجل آ کر کہیں خاموش مجھے
عقل کچھ کر نہ سکی قدر شناسیٔ جنوں | بزمِ ہستی میں مبارک نہ ہوا ہوش مجھے
حالتِ قابلِ فریاد کے سب شاہد ہیں | اس سے کیا ہوتا ہے کر دیجئے خاموش مجھے
تابِ نظارۂ گلزار میں کیا لاؤں گا | رُت بدلنا ہی کئے دیتا ہے بے ہوش مجھے

بُت پرستی میں بھی پردے کا ہوں حامی اکبر
بخش ہی دے گا خداوندِ خطا پوش مجھے

خرافاتِ شوخیٔ قلم بھی ملاحظہ ہو۔

بہت سے عہدے بھی لے چکا ہے ملی ہے کونسل کی ممبری بھی
پھر اس پہ کہتا ہے ہوں میں بھوکا یہ پیٹ ٹٹو کا ہے کہ مٹکا
سنوارے خود آپ ہم نے پتلے اور ان میں گنجی لگائی غربی
لگے وہ جب ناچنے تو خود ہی کسی کو پھینکا کسی کو پٹکا

پھر بھی یاد فرمایئے گا۔ زندہ رہا تو آداب و تسلیم بجا لاؤں گا۔

خاکسار : اکبر

الہ آباد ــ ۳۰ر اگست ۱۹۱۵ء

حضور والا

مسندِ اقبال پر متمکن اور مجلسِ حق اندیشی کے صدر رہیئے۔ مدت سے میں نے عریضہ نہیں لکھا۔ مبارکباد عید کا شکر گزار ہوں۔

پیشِ نظر ہمارے ہے شامِ شبِ فراق | اس کی سحر جو ہو تو ہماری بھی عید ہے

آپ کے خطوں میں نہایت ہی فصیح و بلیغ وہ خط تھا۔ آپ کو ثواب ملا مجھ کو مدد ملی۔ خیریت مزاج سے مطلع فرمایا جاؤں۔

خاکسار
اکبر

واللہ ذرا یہ تماشا دیکھئے۔ یہ خط لفافے میں رکھ کر بند کرنا چاہتا تھا کہ والا نامہ موصول ہوا۔ باوجود افسردگی اور ضعف کے ایک وجد کی حالت طاری ہوئی۔ شاداں ہم شخصیت۔ جواب لکھوں گا۔

الہ آباد ــ ۲۸ر دسمبر ۱۹۱۵ء

عالی جناب مدظلہٗ

مدت سے نیاز نامہ لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ امید ہے کہ آپ خیر و عافیت سے ہیں اللہ تعالیٰ نیا سال اپنے امیدواروں کو مبارک کرے۔ صبر اور اعمالِ صالح کی توفیق عطا فرمائے۔ آپ کی محبت و قدردانی کے خیال سے دل کو لذت ملا کرتی ہے۔ خدا دیدار بھی نصیب کرے۔ اپنا کیا حال کہوں۔ نہ صحت اچھی نہ دل کو اطمینان،

اکثر امور باعثِ انتشارِ خاطر ہیں۔

آپ کا دعاگو
اکبر

یہ مطلع ملاحظہ ہو۔

وہی زندہ ہیں جو قوت سے صرفِ عمل کرتے ہیں　　ہماری زندگی کیا، زندگی کی نقل کرتے ہیں

تقریباً ۳ سال سے خواجہ صاحب سے ملنا نہیں ہوا۔ اگرچہ ایک دوسرے کے مشتاق ہیں۔

الہ آباد۔ ۶/۷ ۱۸ء

حضور عالی جاہ سلمہٗ اللہ

یاد رکھئے گا کہ میں بھی ہوں دعاگو آپ کا۔

"ذخیرہ" میں آپ کا مضمون خوب تھا۔ یہ زندہ دلی مبارک ہو۔ کیا کہوں شکایاتِ لاحقہ سے معذوری محسوس ہوتی ہے اور غم غلط کرنے کے لئے آپ کی حضوری بہت موثر ہوئی۔ خیر زندگی ہے تو دیکھا جائے گا۔ اس وقت تو رعایا و گورنمنٹ کی باہمی کشمکش نے ہم ایسوں کو سخت خلق میں مبتلا کر رکھا ہے۔ ادھر جنگ کی مصیبت ہے۔ اللہ اپنا فضل کرے۔

نیا سال آپ کو مبارک ہو۔ میرا تو یہ خیال ہے۔

وہی زندہ ہیں قوت سے جو صرفِ عمل کرتے ہیں　　ہماری زندگی کیا، زندگی کی نقل کرتے ہیں

بندۂ محبت و کرم
اکبر

الہ آباد۔ ۱۱ر جنوری ۱۸ء

میرے مخدوم و مکرم۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔

اس وقت اتفاق سے رسالہ "سیرِ پنجاب" الماری میں ملا۔ شروع کے ۱۰۔۱۵ صفحے پڑھے، آپکی یاد دل میں تازہ ہوگئی۔ یہ دل و دماغ و نظر آپ ہی کا حصّہ ہے۔

میں نے غالباً کئی نیاز نامے لکھے جن کا جواب نہیں ملا۔ تعلق خاطر ہے۔ قیاس کرتا ہوں کہ آپ کے دل میں میری جگہ ہے۔ ورنہ باوجود اس افسردگی اور عزلت پسندی کے کیوں آپ کے خیال سے ایک شگفتگی پیدا ہوتی ہے۔

بزمِ توحید کو آپ سے رونق ہے۔ یہی خوب ہے۔

تا ز میخانہ و مے نام و نشاں خواہد بود　　سرِ ما خاکِ رہِ پیرِ مغاں خواہد بود

خاکسار۔ اکبر

الہ آباد۔ ۲۷ر جنوری ۱۸ء

حضور والا۔

آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار یہ شعر زبان سے ٹپک پڑا۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر آپ کے درشن ہو جائیں — برہمن شیخ ہوں اور شیخ برہمن ہو جائیں

کملی کے ذکر نے مجھ کو آپ کا اور بھی اشتیاق کر دیا۔ میرا یہی حال ہے۔

خودی کی حس سے کبھی ہوتا ہے انتشار اکبر — کہاں رہوں کہ مجھے بھی میرا پتہ نہ چلے

آپ میں اللہ نے بڑا رنگ عرفاں بھر دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اُجلا پن اور زبان آوری۔

افسوس بہت کمزور ہوں۔ دل شکستہ ہوں۔ مغموم ہوں۔ متردد ہوں۔ اللہ فضل کرے ہی گا لَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یاد فرماتے رہیے دل بڑھاتے رہیے۔

خاکسار دُعاگو
اکبر

آپ سے ملنا ہو تو کچھ کام کی باتیں ہوں۔

اکبر کے چھوڑ جانے کی خبر ساقی نے سُنی تو خوب کہا — مرنا تو ضروری تھا ہی اسے رندوں کے لئے کچھ کر بھی گیا

الہ آباد — ۸ فروری ۱۹۱۸ء

مخدومی و مکرمی سلمہٗ اللہ تعالیٰ

کچھ یاد نہیں کہ سرفراز نامے کا جواب لکھا یا نہیں۔ ناتندرستی اور انتشار نے حواس کی خوبی بہت کم کر دی ہے۔ میں بھی اسی کے ساتھ گھٹ رہا ہے[1]۔ ملت ہی رہے گی۔ یہ غزل آپ نے خوب لکھی ہے۔ آئینۂ توحید ہے۔

موجودہ حالات پر آپ کا آرٹیکل بھی نہایت عمدہ اور بزرگانہ ہے۔ داد کے سوا اور کیا دے سکتا ہوں۔ پاکٹ بک میں دو شعر نظر آئے۔ یہ اوقات مختلف لکھ لئے تھے۔ اس وقت خیال آیا کہ گوش گزار کر دوں ؎

جو دشمن شاد کا ہے وہ رہِ باطل کا سالک ہے
موحد کا مقابل ہے اگر کوئی تو مشرک ہے

ہیں شاد داد دہ بھی اور صاحب سخن بھی — ہیں صدرِ انجمن بھی اور شمع انجمن بھی

آپ کا نیاز مند — اکبر

پرتاب گڈھ — ۱۸ فروری ۱۹۱۸ء

حضورِ والا

نامۂ عالی صادر ہوا۔ قطعۂ وحدت خوب ہے۔ بہت صحیح ہے۔ اللہ اسی پر آپ کو قائم رکھے۔ میں

---

[1] یہ جملہ اسی طرح لکھا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس میں کچھ سہوِ کتابت ہے۔

نہیں سمجھا کہ آپ بمبئی کیوں تشریف لے گئے ۔ اور کب تک کے لئے ۔ طبیعت کو تعلق ہے ۔

میں دو چار دن کو یا جب تک اللہ کی مرضی ہو ۔ عشرت کے پاس آیا ہوں ۔ دل گھبرایا کرتا ہے اہلِ دل سے دور ہوں ۔ اللہ اللہ کیا کرتا ہوں ، اللہ ٹھکانے لگا ہی دے گا ۔

فلک سے شکوۂ جور وستم کیا
زمیں چکر میں جب خود ہے تو ہم کیا

آپ سے مراسلت نہ صرف باعثِ عزت ہے بلکہ غذائے روح ہے ۔ خدا آپ کو خوش رکھے ۔

اکبرؔ

الہ آباد ۔ ۱۳ ر فروری ۱۸ ۱۹ء

عالی جناب مدظلہٗ

اپنے نسبی اور قومی بزرگوں سے استناد اور ان سے محبت ایک نیچرل بات ہے ۔ لیکن بلا قیدِ نسب و قوم و ملک تمام بزرگانِ دین اور عارفانِ الٰہی کا احترام کرنا خدا پرستی خدا شناسی اور بلندیٔ طبیعت کی دلیل ہے ۔ آپ کی تصنیفات سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے ۔ بجا کہا گیا ہے کہ آپ کا ارشاد سُن کر اور مذاقِ طبع دیکھ کر ۔

برہمن شیخ ہو اور شیخ برہمن ہو جائے

یعنی ایک دوسرے کے بزرگوں کا ادب اور ذکرِ خیر کرنے لگیں ۔

ہمارے خواجہ حسن نظامی صاحب اسی رنگ کے پروفیسر ہیں ۔ خدا ان کے کاموں میں برکت دے ۔ اور آپ کو مسندِ جاہ پر متمکن رکھے ۔

کیا دیکھتا ہے رشتہ ، کیا دیکھتا ہے صورت
اللہ کی گلی میں جو ہی ملے وہ اپنا

خاکسار ـــــ اکبرؔ

الہ آباد ـ ۳/۳ ۱۸ ء

جناب عالی

والا نامہ مورخہ . . . . جمادی الاوّل ۱۳۳۶ھ اس قابل ہے کہ طبع ہو کر مشتہر ہو جائے ۔

آپ نے جو شعر تحریر فرمایا ہے ۔ خوب ہے ۔ میری زبان پر وہ شعر یوں ہے ؎

ہمہ شہر پُر ز خوباں منم و خیال ماہے
چہ کنم کہ چشمِ بدخو نہ کند بکس نگاہے

معلوم نہیں کہ آپ کا قیام بمبئی میں کب تک ہوگا ۔ افسوس ہے کہ مجھ کو نہایت ضعف محسوس ہوتا ہے ۔ ۳ سال سے دہلی کا ارادہ کر کے رہ جاتا ہوں ۔ راہ میں شاید ۳ ـ ۴ جگہ قیام کر کے پہونچ سکوں ۔ لیکن ہر منزل میں اسباب راحت کا اہتمام اور خلاف معمول

سے بچنے کا انتظام دشوار ہے۔

بہر حال اللہ اللہ کرتا ہوں، اگر یہ بامعنی ہے تو سب کچھ ایک نہ ایک دن مشکل آسان ہو ہی جائے گی۔

دعائے خیر کا امید وار
اکبر

...... ۹ .... ۹ ۱۸ ستمبر ۱۹۰۶ء

حالِ اکبر پر وہ لطفِ حضرتِ شاد اب کہاں
عرض کر دیتا ہوں شعر اب بھی مگر داد اب کہاں

آفتابِ دولت و اقبال تاباں باد
اکبر

اس خط پر وصول کی تاریخ ۱۵/۱، ۲۷ ف درج ہے (یعنی ۵ ار آذر ۱۳۲۷ فصلی)
مرتب

.... بلہ

حضور والا نے ایسے پاکیزہ اشعار موزوں فرمائے ہیں کہ حیرت ہو گئی اور مرحبا و تحسین کا کلمہ بے اختیار زبان پر آیا۔ کیا کہوں۔ بہت دور ہوں۔ ناتواں ہوں، کوئی باسلیقہ رفیق سفر ملتا تو خدمت عالی میں حاضر ہو کر چند روز غم غلط کرتا۔ میرے آرام کا اہتمام حضور والا پر کچھ بار نہ ہو تا قبل اس کے خود جناب نے ارادۂ تشریف آوری اور امید ملاقات کا اظہار فرمایا تھا۔ کاش یہ ارادہ پورا ہو۔ اللہ آپ کو شاد کام رکھے۔

خاکسار
سید اکبر حسین

لہ رقعات اکبر میں یہ خط اسی طرح مقام و تاریخ کے بغیر چھپا تھا۔ اس میں القاب بھی نہیں ہیں۔

اکبر الٰہ آبادی اور مغربی اِنقلاب

(سیّد ابوالخیر کشفی)

زمانہ کا ساتھ دینا اور موجِ وقت کی رَو پر بہنا۔ زندگی کا ثبوت ہے، یہی زندوں کا شیوہ ہے، لیکن وہ زندہ تر ہے جو طوفان میں ٹھہرنا جانتا ہے ــــ یہی وہ منزل ہے جہاں اکبرؔ اور حالیؔ اپنے لئے دو الگ الگ سمتیں چن لیتے ہیں۔ حالی زندہ تھے اور اکبر زندہ تر (یہاں میں ترقی پسند اور رجعت پسند کی بحث نہیں چھیڑنا چاہتا) حالیؔ شاعر تو اکبرؔ سے بڑے تھے لیکن زندگی کی جدوجہد میں اکبر بلند قد ہیں۔

حالیؔ نے اعتراف کیا ہے بلکہ ہمیں سبق بھی دیا ہے کہ اُدھر کو چلو جدھر زمانے کی ہوا ہو، حالیؔ کے یہاں "ساز" ہی ساز ہے "ستیز" نہیں، اکبرؔ کے یہاں "ساز" کم ہے اور "ستیز" زیادہ ــــ مجھے اس بات سے انکار نہیں کہ ان کی ستیز پر بھی مصلحت غالب آجاتی ہے۔ سرکاری ملازمت اکبرؔ کو عزیز تھی، یہی روٹی کا سہارا تھی، اسی ملازمت کی کمائی سے عشرت لندن کی ہوا کھانے گئے اور اکبر کو انھیں گھر کی محبت کا مزا یاد دلانا پڑا۔ لیکن اس مصلحت سے اکبر کا فن گرا نہیں بلکہ اس میں ایک خاص سنبھلی ہوئی کیفیت پیدا ہو گئی۔ اکبرؔ کے "اشارے" اسی کیفیت کے غماز ہیں۔ اگر وہ سرکاری ملازم نہ ہوتے تو شاید وہ اشاروں کی جگہ تفصیلات سے کام لیتے اور ان کی ظرافت میں اشاریت کی یہ چبھن نہ ملتی۔

بات "ساز" اور "ستیز" کی ہو رہی تھی ــ حالیؔ نے نئی تحریکات کا ساتھ دیا۔ وہ خود بھی ایک بڑی تحریک سے وابستہ تھے۔ ان کے ادبی کارنامے بھی اس تحریک سے الگ نہیں کئے جا سکتے، "مسدسِ حالیؔ"، "تہذیب الاخلاق" اور "مسلم یونیورسٹی" ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں ــ سرسیّد اور ان کے رفقائے کار نے صحیح راستہ چنا، اور آج تاریخ کی گواہی ان کے ہی حق میں ہے "اکبر" عام مسلمانوں کے ذہنی انتشار کے نمائندے ہیں، وہ خود کسی تحریک کے ہیرو نہیں، کیونکہ وہ جس گروہ کے نمائندے تھے۔ وہ گروہ اس قدر تھک چکا تھا اور اس کا انتشار اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ اس سے کسی منظم تحریک کی امید بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔

اکبرؔ پر جو دو اعتراض عام طور پر کئے جاتے ہیں، وہ یہی ہیں کہ "اکبر رجعت پسند تھے اور" اکبرؔ آنے والے دور کے بارے میں کوئی صحیح فیصلہ نہیں کر سکے اور نہ مستقبل کے خدوخال ان کے لئے واضح ہو سکے۔" پہلے تو میں نے مضمون کے شروع ہی میں کہہ دیا کہ میں اس وقت ترقی و تنزل کی بحث میں الجھنا نہیں چاہتا۔ لیکن دوسرے اعتراض کو میں نہیں مانتا کیونکہ اکبرؔ نے آنے والے دور کے متعلق جو فیصلہ کیا تھا وہ آج واقعات کے آئینے میں جھلک رہا ہے، مستقبل کے خدوخال ان کی نگاہوں کیلئے واضح تھے۔ انھیں اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ وہ ایک ہاری ہوئی بازی سے دوچار ہیں۔ ان کے گہرے انقلاب کی بساط

برپا رہے تھے۔ جس رجحان اور فلسفۂ زندگی کے وہ نقیب تھے وہ دم توڑ رہا تھا۔ اکبر جانتے تھے کہ وہ جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوگا، وہ جس نظامِ حیات کی برتری کی تمنا اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہیں بکھر کر رہے گا۔ انھیں اپنے مشن کی آواز اور شاعری کے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں تھی وہ دیکھ رہے تھے کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ـــــ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی بات کہتے ہی رہے۔ اگر آج اکبر زندہ ہوتے تو اس برصغیر کی عوامی زندگی اور سیاست میں وہ جمہوری اور آزادی پسند رجحانات اور اختلافِ رائے کے بہت بڑے نمائندے سمجھے جاتے، کیونکہ وہ جس بات کو صحیح سمجھتے تھے، اس کو کہنا اور اس کے لئے لڑنا انھیں خوب آتا تھا۔

اکبر کو معلوم تھا کہ زمانہ ان کے مخالفوں کے ساتھ ہے اور شکست ان کے لئے مقدّر ہو چکی ہے لیکن اس کے باوجود انکی آواز بے آہنگ نہیں ہوئی، ان کا لہجہ کبھی نہیں بدلا، شاعر کو یہ ضرور یقین تھا کہ وہ اس سیلاب کو روک تو نہیں سکتا لیکن اس کے افکار مغربی سیلاب کے مقابل آخری چٹان ضرور بن سکتے ہیں۔ اکبر نے اپنی طنزیہ شاعری کی جو تنقید خود پیش کی ہے، وہ ایک طور پر حرفِ آخر کا حکم رکھتی ہے ؎

شعرِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

دوسرے مصرعے میں گہرے کرب کے ساتھ ساتھ شدید طنز بھی ہے۔ وہ آنے والے دور میں مغرب کے ذہنی تسلط کو مشرق اور "مشرقیوں کے لئے "موت" سمجھتے تھے، ٹلتی نہیں آئی ہوئی ـــ اگر انقلاب کے اس دور میں اکبر نہ ہوتے تو ہمارے انقلاب کی تاریخ میں کسی ردِّ عمل کا نشان بھی نہ ملتا۔ ردِّ عمل مردانگی اور حوصلے کا اظہار ہے۔

جب بھی کوئی انقلاب آتا ہے تو کسی قوم یا اس کے افراد کا رویہ (ATTITUDE) یا تو شریفانہ ہوتا ہے یا بہادرانہ (HEROIC) ہمارے یہاں جب جنگ آزادی (۱۸۵۷ء) کے بعد ذہنی، سماجی اور سیاسی انقلاب پیدا ہوا تو یہ دونوں رجحانات ابھرے، بحیثیت مجموعی قوم کا رجحان شریفانہ رہا۔ کیونکہ مسلمانوں نے پہلے تو اس انقلاب سے بے نیازی برتنے کی کوشش کی حال سے الگ ہو کر ماضی کے دامن میں پناہ لینی چاہی اور جب یہ کوشش ناکام ہوگئی تو چپ چاپ نئے نظام سے سمجھوتہ کر لیا لیکن قوم کے چند افراد اس سمجھوتے سے الگ رہے، مادی طور پر نہ سہی ذہنی طور پر سہی۔ اکبر بھی انھیں افراد میں سے ہیں۔ ویسے تو وہ سرکار انگلشیہ کے نمک خوار تھے لیکن انگریزی تسلّط کو ان کا ذہن کبھی گوارا نہ کر سکا۔ حالانکہ وہ جانتے تھے ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی پردے کی یہ پابندی نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے صنم اپنی نہ ایسا پیچ زلفوں میں، نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا میں ضم ہوں گے

اکبر پر یہ اعتراض بھی روایتی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے کہ مغربی انقلاب کے اثرات پر ان کے اعتراضات بڑے سطحی ہیں، وہ مشرقی کلچر، روایات اور تہذیب کا تحفظ چاہتے تھے لیکن تمدّن اور ثقافت کے صحیح معنوں سے آشنا نہ تھے۔ وہ محض معکوس اور محدود قسم کی وضعداری، رہن سہن، لباس اور پردہ کو زندگی کی بنیادی اور اساسی قدریں سمجھ بیٹھے تھے اور ان کی شاعری میں کہیں پتلون کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ کہیں روٹی کی جگہ بسکٹ کھانے پر طعنے دئے گئے ہیں۔ کہیں سائے کی ہوس انگیز سناسن کا ذکر کیا گیا ہے ـــ اور ان کی نگاہوں میں مغرب کی کوئی چیز کبھی نہیں جچی، مغرب کی کسی خوبی نے انھیں متاثر نہیں

کیا، حالانکہ اقبالؔ جیسا مغرب دشمن بھی مغرب کی جستجو اور ذوقِ علم کی تعریف کرتا ہے ـــــ اکبر کے کلام میں ان عناصر کی موجودگی سے مجھے انکار نہیں، یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کے یہاں مزاح کی ایک سی سطح نہیں، کبھی کبھی وہ وصل کے بعد تھینک یو کہنے کو بھی اعلیٰ درجہ کی ظرافت سمجھ بیٹھتے ہیں یا محض قافیوں کی پینترا بازی کو فن سمجھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن یہ غلط ہے کہ انھوں نے محض پردہ، لباس اور تمدن کے خارجی و غیر اہم مظاہر پر اعتراض کئے ہیں ـــ اکبرؔ کے یہاں اساسی اور بنیادی باتیں بھی ملتی ہیں، مغرب کے خلاف اُن کے اعتراضات محض سطحی نہیں، جو چار اشعار میں نے اوپر پیش کئے ان میں پہلا شعر تمہید ہے، دوسرے اور تیسرے شعر میں پردہ، گھونگھٹ اور زلفوں کے پیچ و خم کا تذکرہ ہے لیکن چوتھے شعر میں اکبر نے آنے والے دور رس لسانی تغیر اور تبدیلی کو پیش کیا ہے، یہ پیش بینی ان کی عظمت کا ایک اور بین ثبوت ہے ـــ مغربی نظامِ تعلیم نے ہمیں ذہنی اور قومی انحطاط کی اس منزل پر پہنچا دیا کہ اپنی زبان ہمیں حقیر نظر آنے لگی ـــ اپنی شاعری میں ہمیں گل و بلبل بادہ و ساغر اور دشنہ و خنجر کے سوا کچھ نہ دکھائی دیا۔ حالانکہ انہی اشاروں میں مشاہدۂ حق کی گفتگو بھی موجود تھی۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات نے اُردو اور انگریزی کے امتزاج سے ایک نئی زبان کو جنم دیا جس کا بہت ہی ہلکا نمونہ یہ ہے کہ میں اِس MATTER میں آپ کے FATHER کی OPINION کے ENTIRELY AGAINST ہوں ـــــ اِن تعلیم یافتہ حضرات کا ذکر چھوڑ دیئے۔ ہمارے چوٹی کے ادیبوں حالیؔ اور نذیر احمد کے یہاں اس بے اعتدالی کے شاندار نمونے ملتے ہیں، یہ حضرات بے تکلف انگریزی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے مترادف اردو الفاظ زیادہ مستعمل تھے۔ انگریزی پڑھے لکھوں سے کیا شکایت! ـــــ عوام بھی اس بدعت سے نہ بچ سکے۔ بگڑے ہوئے انگریزی الفاظ زبان زد ہو گئے۔ وقت کی جگہ "ٹیم" اس کی بہترین مثال ہے۔ میں ہرگز نہیں کہتا کہ سگریٹ کی جگہ "تمباکو ژولیدہ بقرطاسِ ابیض" کہا جائے، لیکن اردو الفاظ پر ان کے انگریزی مترادفات کو ترجیح دینا محض لسانی غلطی نہیں بلکہ قومی احساس کمتری کی دلیل ہے۔

اکبرؔ نے انقلاب اور شکست و ریخت کی سطح سے گزر کر ان اثرات کا جائزہ بھی لیا جو پوری طرح قومی کردار اور اجتماعی زندگی پر چھائے جا رہے تھے۔ اکبرؔ نے مغربی نظامِ تعلیم پر جو تنقید کی ہے وہ محض ایک مُلّا کے پُرخلوص اور متعصب جذبات نہیں بلکہ اس میں ایک ماہرِ تعلیمات کی رائے کی گہرائی ہے۔ مغربی نظامِ تعلیم کا صرف یہی اثر نہیں ہوا کہ بیٹے باپ کو خبطی سمجھنے لگے بلکہ علم و ادب، فنونِ لطیفہ اور مذاقِ صحیح کی قندیلیں جھلملا اٹھیں۔ تعلیم کو تجارتی لباس پہنا دیا گیا۔ علم کا تعلق ادراک سے باقی نہ رہا بلکہ تحصیلِ علم صرف پیٹ سے وابستہ ہو گئی ـــــ مغربی نظامِ تعلیم کو ذہنی نسل کشی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ نئے پڑھے ہوئے نوجوان قومی تاریخ سے بے گانہ ہو گئے۔ مشرق کی تاریخ ان کے لئے ایک سادہ ورق بن گئی اور مغرب کی تاریخ ایک جگمگاتی ہوئی کہانی۔ یہ خیال ان کے ذہن میں راسخ ہو گیا کہ مشرق نے دنیا کی ذہنی اور علمی تاریخ میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ محض جادوگروں، شہزادوں اور موتیوں کی زمین رہی ہے ـــ یہ فلسفہ، یہ تاریخ، یہ منطق یہ علم و ادب یہ سب کچھ مغرب کے ابرِ کرم کا صدقہ ہے، کتنا محدود تھا یہ نقطۂ نظر۔ مغرب نے جدید دور کی ذہنی آبیاری میں جو حصہ لیا ہے۔ اس سے انکار نہیں۔ لیکن مشرق اور ایشیاء کی تاریخ میں زیادہ جان اور وسعت ہے۔ یہاں سے علم و فن اور رشد و ہدایت کے چشمے پھوٹے ہیں۔ یہ ایشیا و عیسیٰؑ، محمد صلعم، رام، گوتم، کرشن اور زرتشت کی سرزمین ـــــ

اس قومی سانحہ پر اکبرؔ نے یوں تبصرہ کیا ہے ؎

وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے
خزینہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

آج کے بیشتر ماہرین تعلیم امتحان کے موجودہ طریقے کو غیر تسلی بخش قرار دے چکے ہیں۔ تین گھنٹوں میں کسی طالب علم کی علمی قابلیت اور ذہنی پہنچ کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ اس کے علاوہ امتحان میں امتیاز حاصل کرنا ایک آرٹ ہے جس کا قابلیت سے کوئی تعلق نہیں امتحان کے موجودہ طریقے کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ طلبا اپنی درسی کتابوں اور نصاب کے دائرے سے آگے نہیں بڑھتے اور اس تنگ دائرہ کو علم کی وسیع دنیا سمجھ بیٹھتے ہیں۔ اکبر نے امتحانات کے بارے میں جو شعر کہا ہے اسے ہم فنی طور پر اُن کے بہترین سرمایہ میں شامل کرتے ہیں ؎

پری کی زلف میں الجھا نہ ریش واعظ میں
دل غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا

اس ترقی یافتہ دور میں پردے کے متعلق اکبر کے اشعار کی بنا پر انھیں رجعت پسند قرار دیا جا چکا ہے۔ اکبر نے پردے کا اکثر مقامات پر ذکر اس لئے کیا ہے کہ پردہ کے موضوع پر مذاحیہ اشعار کی بڑی گنجائش ہے۔ اقبال نے بھی اپنے ابتدائی دور میں پردے پر اشعار کہے۔ مثلاً ؎

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی　　　ڈھونڈھ لی قوم نے فلاح کی راہ
روشِ مغربی ہے مدِ نظر　　　وضعِ مشرق کو جانتے ہیں گناہ
یہ ڈراما دکھائے گا کیا سین　　　پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

شیخ صاحب بھی تو پردے کے کوئی حامی نہیں　　　مفت میں کالج کے لڑکے ان سے بدظن ہو گئے
وعظ میں فرما دیا تھا کل آپ نے یہ صاف صاف　　　"پردہ آخر کس سے ہو جب مرد ہی زن ہو گئے"

لیکن بعد میں انھوں نے پردے اور تعلیم کی جگہ نسوانیت زن کی نگہبانی کا ذمہ دار مرد کو قرار دیا ؎

بے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی
نسوانیتِ زن کا نگہباں ہے فقط مرد

اقبال کے یہاں رجعت کے عناصر ڈھونڈھنے والے نقاد اس شعر میں نسوانیت کی معنویت کو بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ اقبال نے مرد کو زن کا نہیں بلکہ نسوانیت زن کا نگہبان کہا ہے اور ہر سماجی شعور رکھنے والا انسان ان دونوں کے باہمی فرق کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ کیا اقبال کے اس خیال کا سلسلہ اکبر کے اس شعر سے نہیں ملتا ؎

حرم سرا کی حفاظت کو تیغ ہی نہ رہی　　　تو کام دیں گی یہ چلمن کی تیلیاں کب تک

یہ ضرور ہے کہ اکبر کے یہاں اقبال کے شعر کی سی وسعت نہیں۔

اب رہا یہ اعتراض کہ "اکبر کو مغرب کی کسی خوبی نے متاثر نہیں کیا"۔۔۔ اکبر نے مغرب کے معاشرہ اور ہندوستان پر مغربی معاشرت کے اثرات کی مخالفت ضرور کی وہ اسے معاشرت کا کمال کہنے کو تیار نہیں تھے کہ مرد بے کار ہوں اور عورتیں تہی آغوش لیکن اکبر یورپ کی علمی ترقی سے بے خبر نہیں تھے، اقبال کی طرح وہ بھی مغرب کے ذوقِ علم اور جذبۂ جستجو کے

قائل تھے، وہ جانتے تھے کہ اگر مغربیوں کی راتیں نگار خانوں میں بسر ہوتی ہیں تو دن کارخانوں میں گزرتے ہیں —
اکبر کا یہ شعر سنئے اور اس کے بعد تو " حاشیہ آرائی " کی ضرورت نہیں رہتی ؎

ہمارات ایشیا غفلت میں سوتا نظر یورپ کی کام اپنا کیا کی

اکبر مغربی معاشرت سے یقیناً نالاں تھے، کیونکہ ان کے نزدیک یہ معاشرت مشرق کی روایات کے مطابق نہیں تھی اور ہر باشعور قوم اپنی صالح قومی روایات کا تحفظ کرتی ہے اور انھیں روایات کی بنا پر نئے مستقبل کی تعمیر کرتی ہے۔ اکبر کو مشرق سے محبت تھی، مشرقی روایات، رہن سہن علم و ادب اور شاعری سے لگاؤ تھا لیکن وہ مشرق کی برائیوں پر اعتراض اور طنز کرنے سے نہیں چوکتے۔ اکبر ایک بے باک طنز نگار کی طرح کمزوریوں کو اجاگر کرتے ہیں اور اس سلسلہ میں اپنے پرائے کی قید نہیں، اچھا طنز نگار تو اپنے کو بھی نہیں بخشتا — ویسے اکبر مشرقی شاعری اور اسلوب کی لطافتوں پر جان دیتے تھے۔ لیکن معائب سے بھی باخبر تھے۔ ہماری شاعری میں مبالغہ کا جو غیر معتدل عنصر ہے۔ وہ انھیں کبھی نہیں بھایا، اُن کا یہ شعر ہماری روایتی شاعری کے بہت بڑے حصے پر بھرپور اور بے پناہ طنز ہے ؎

غنیمت ہے شبِ فرقت کی فرصت رسالہ لکھو تحقیقِ کمر میں

مغربی سیلاب کی تیز رو موجیں اکبر کے افکار کو روندتی ہوئی آگے بڑھتی گئیں — لیکن آج بھی ان کے اشعار پڑھ کر مغرب پسند دلوں میں ایک خلش سی پیدا ہوتی ہے اور یہی خلش لبوں تک آتے آتے مسکراہٹ بن جاتی ہے۔ اکبر ہمارے لبوں کا تبسم بن گئے ہیں — انسان ہمیشہ مسکراتا رہے گا اور اکبر اردو ادب کے ایوان میں ہمیشہ زندہ رہیں گے —

اکبر بحیثیت رباعی نگار

(ڈاکٹر سلام سندیلوی)

۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۱ء

حالی کی طرح اکبر بھی اس دور کی پیداوار ہیں جو ایک نئی آواز، نئے شعور اور نئے ماحول سے ہم آغوش ہو رہا تھا، یہ آواز، یہ شعور اور یہ ماحول اکبر کو قطعاً پسند نہ تھا، اس ماحول سے ان کو سخت نفرت تھی۔ حالی اور اکبر میں یہی فرق تھا کہ حالی نے اپنے کو زمانے کے نئے مزاج کے مطابق ڈھال لیا اور ہر نئی چیز کو لبیک کہا، اکبر نے ہر نئی چیز کو ٹھکرایا اور قدامت پرستی کا دامن مضبوطی سے پکڑا۔ اکبر کو نئی فضا میں بے دینی، گمراہی اور پستی کے زہریلے جراثیم اڑتے ہوئے نظر آتے تھے، ان جراثیم کو مغربی تہذیب اور مغربی تعلیم نے جنم دیا تھا۔ مغربیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب میں مشرقیت کے محل بہتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ اکبر نے اپنے کلام سے اس سیلاب کو روکنے کی کوشش کی، اس طرح اکبر کا کلام ایک باندھ کا کام کرتا ہے۔

اکبر کی قدامت پسندی میں کوئی کلام نہیں ہے۔ انھوں نے چند لمحات کے لئے بھی کبھی یہ نہیں سوچا کہ مغربی تہذیب و تعلیم ملک کے لئے کچھ مفید بھی ہو سکتی ہے۔ ان کی اس تنگ نظری کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور نے "تنقیدی اشارے" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

اکبر نیک نیت بھی تھے، اور تھوڑے تنگ نظر بھی، طوفان آتے دیکھا تو سمجھے کہ سب کچھ فنا ہو جائے گا۔ یہ بھول گئے کہ اس کے اثر سے زمین زرخیز بھی ہو جائے گی [1]

اگرچہ اکبر کے زمانے میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو نئی تہذیب کا مبلغ تھا، مگر اکبر پرانی قدروں پر عامل رہے اور وہ اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ انھوں نے اپنے نظریات کی اشاعت کے لئے مزاحیہ شاعری کی طرف رجوع کیا۔ کیونکہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ چاہے جتنی مفید بات کہی جائے اگر اصلاحی رنگ میں پیش کی جائے گی تو بے اثر ثابت ہوگی، اس لئے انھوں نے طنز و مزاح کا حربہ استعمال کیا اور طعنوں سے کام نکالنا چاہا۔

دراصل اس ظریفانہ رنگ نے اکبر کو حیات جاوداں بخشی۔ ان کی ظرافت کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریاآبادی نے مندرجہ ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:-

"اکبر کی شہرت و مقبولیت کی سب سے بڑی نقیب ان کی ظرافت تھی، ان کے نام کو قہقہوں نے اچھالا، ان کی شہرت

---

[1] تنقیدی اشارے۔ پروفیسر آل احمد سرور صفحہ ۹۴

کو سکراہٹوں نے چمکایا۔ ہندوستان میں آج جو گھر گھر ان کا نام پھیلا ہوا ہے، اس عمارت کی سادی داغ بیل ان کی شوخ نگاری و لطیفہ گوئی ہی کی ڈالی ہوئی ہے، قوم نے ان کو جانا مگر اس حقیقت سے کہ وہ مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دیتے تھے۔[1]

روتے ہوئے چہروں کو ہنسا دینا اور مرجھائے ہوئے دلوں کو کھلا دینا اکبرؔ کے کلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ اور یہی خصوصیت اکبر کی بیشتر رباعیات میں بھی پائی جاتی ہے، انھوں نے ظاہر میں تو اپنی رباعیات سے ہنسنے اور ہنسانے کا کام لیا ہے۔ مگر ان کے قہقہوں میں لرزتی ہوئی قوم کی سسکیاں اور کراہتے ہوئے ملک کے آنسو موجود ہیں۔ دراصل ہر رباعی میں ان کا کوئی خاص پیام ہوتا ہے۔ جس کو وہ ظرافت کے رنگ میں پیش کر دیتے ہیں، جیساکہ ایک جگہ خود اشارہ کیا ہے:

سرد موسم تھا ہوائیں چل رہی تھیں بہت بار   شاہد معنی نے اوڑھا تھا ظرافت کا لحاف

اکبر کی ظرافت کے لحاف میں ہمیشہ شاہد معنی رو پوش رہتا ہے۔ ان کی ہر رباعی کسی نہ کسی اصلاحی مقصد کی تکمیل کرتی ہے۔ ان کی رباعیات کی سب سے بڑی خوبی ان کی مقصدیت ہے۔ مگر یہ مقصدیت کبھی شعریت پر غالب نہیں آتی۔ اس لئے اکبر انداز بیان کی شگفتگی کو بھی برقرار رکھتے ہیں۔ یہ اکبر کے آرٹ کا کمال ہے اور وہ اس لحاظ سے حالیؔ پر فوقیت رکھتے ہیں۔ دراصل اکبر کی رباعیات کو باقاعدہ سمجھنے کے لئے ان کو موضوعات کے لحاظ سے تقسیم کرنا ضروری ہے۔

اصلاحی رباعیات

درحقیقت انگریزی تہذیب سے سب سے زیادہ متاثر ہونے والا طبقہ نوجوانوں کا تھا۔ اس لئے اکبر نے نوجوانوں کی اصلاح کی کوشش کی۔ کیونکہ یہی قومی تعمیر کے سنگ بنیاد ہیں۔ ایک رباعی میں انھوں نے پردے کی موافقت کی ہے۔ مشرقی تہذیب میں پردے کا رواج ہے۔ اس لئے عشق بازی علی الاعلان نہیں ہو سکتی ہے، مغربی تہذیب میں پردہ ایک مضحکہ خیز چیز ہے، اس لئے اس زمانے میں نوجوانوں کو انگریزی پریوں سے دل بہلانے کا موقع مکمل طور سے ملتا تھا۔ اس پردہ کے سلسلے میں اکبر نے مس اور میڈم وغیرہ انگریزی الفاظ استعمال کئے ہیں اور اس طرح رباعیات میں ظرافت کا رنگ بھر دیا ہے۔ مندرجہ ذیل رباعی ملاحظہ ہو۔

ہیں لیمپ عزیز، شمع بیگانہ ہے   جلتا ہے چراغ سے جو فرزانہ ہے
سب کی ہے مس لیلیٰ کے رُخِ روشن پہ نگاہ   جو ہے نئی روشنی کا پروانہ ہے

انگریزی تہذیب کے اثر سے انگریزی میں خطوط لکھنے اور خطوں میں انگریزی الفاظ استعمال کرنے کا عام رواج ہو چلا تھا جیسے ڈیر فادر، ڈیر سسٹر وغیرہ لوگ بے تکلفی سے لکھتے تھے اور بولتے بھی تھے۔ اکبر نے اس رواج پر طنز کیا ہے۔

چٹھی اس مس کی ہے کہ یہ جادو ہے   دل جوشِ مفاخرت سے بے قابو ہے
ایسی پری اور مجھ کو پیارا لکھے   القاب میں دیکھئے ڈیر کلّو ہے

ایک رباعی میں سرکاری ملازمت حاصل کرنے اور تحصیل علم سے قبل شادی کرنے کی شدید مخالفت کی ہے۔ اس رباعی کے تینوں قافیے انگریزی کے ہیں۔ اس لئے رباعی نہایت لطف دے رہی ہے ؎

علم و حکمت میں ہو اگر خواہشِ فیم   سرکار کی نوکری کو ہرگز نہ کر ایم
شادی نہ کر اپنی قبل تحصیلِ علوم   بت ہو کہ پری ہو، خواہ وہ ہو کوئی میم

[1] اکبر نامہ اکبر میری نظر میں از مولانا عبد الماجد دریابادی مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لکھنؤ سنہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۲

مندرجہ ذیل رباعی میں انگریزی خورد و نوش اور لباس کا مضحکہ اڑایا ہے ۔

کیک کی فکر میں سوروٹی بھی گئی　　چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر　　پتلون کی فکر میں لنگوٹی بھی گئی

اکبر کے عہد میں مغربی تہذیب نے صرف انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ پر اثر نہیں ڈالا بلکہ علماء اور مشرقی و اسلامی تہذیب کے علمبردار بھی اس کی زد سے محفوظ نہ رہ سکے ۔ اکبر نے اس کایا پلٹ کو اپنی مندرجہ ذیل رباعی میں ظاہر کیا ہے ؎

وحشت نئی روشنی سے آخر کو مٹی　　فکرِ روزی میں شیخ کی طبع ڈٹی
کرکٹ، جمناسٹک، ٹریننگ کالج　　مولانا سیکھتے ہیں بالفعل نٹی

مولانا اکبر، اور سرسید ہم عصر تھے ۔ مگر ہم خیال نہ تھے ۔ اکبر مغربیت کے سخت مخالف اور سرسید مغربیت کے مکمل حامی، اسی تضاد کی بناء پر اکبر کے قلم سے مختلف رباعیاں سرسید کے خلاف نکل گئیں ۔ اکبر نے سرسید کی ذات پر چندہ کی دھولیابلی، علی گڑھ انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب کے سلسلے میں متعدد وار کئے ہیں ۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں ؎

سید کی طرف تو چندہ لانے کی ہے ہرج　　اور شیخ کے گھر میں پنجگانے کی ہے ہرج
بہتر ہے یہی کہ بت پرستی کیجئے　　گو اس میں بھی صبح کو نہانے کی ہے ہرج

اعزازِ سلف کے مٹتے جاتے ہیں نشاں　　اگلے سے خیالات ہند میں اب دکھاں
سید بننا نہ ہو تو بنو سرسید　　ہونا ہو جو خوان تو بنو انگریزی خواں

الغرض اس زمانے میں ایک جماعت سرسید کی تھی جو ترقی پسند تھی دوسری طرف اکبر کا ایک حلقہ تھا جو رجعت پسند تھا، ان دونوں کے متضاد خیالات سے بعض وقت عوام گھبرا جاتے تھے اور ان کے لئے یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا تھا کہ کون صحیح راستہ پر ہے اور کون قابلِ تقلید ہے ۔ اکبر نے اسی کشمکش و ہرج کے عالم کی ایک تصویر کھینچی ہے ۔

ہر ایک کو خوش کروں میں کیونکر صاحب　　اپنی ہی طرف بلاتے ہیں ہر صاحب
آسائشِ عمر کے لئے ہے کافی　　بی بی راضی ہوں اور کلکٹر صاحب

غرض کہ اکبر کی نگاہ میں مغربی تعلیم و تہذیب کی کوئی وقعت نہ تھی ۔ اس کے علاوہ مغربی تعلیم کے حصول کا مقصد بھی غلط تھا کیونکہ ہر ایک حصولِ تعلیم کے بعد نوکری کی خواہش کرتا تھا اور ہر ایک کا نوکری سے فیضیاب ہونا بہت مشکل تھا ۔ اکبر کی دوربین نگاہوں نے اس بات کو تاڑ لیا اور انھوں نے نوجوانوں کو سمجھایا کہ محض سرکاری نوکری ہی حصولِ معاش کا ذریعہ نہیں ہے، بلکہ زراعت اور صنعت و حرفت کے ذریعے بھی روزی کمائی جا سکتی ہے ۔ اس طرح سے انھوں نے ہندوستانیوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا ۔

ہر ایک کو نوکری نہیں ملنے کی　　ہر باغ میں یہ کلی نہیں کھلنے کی
کچھ پڑھ کے تو صنعت و زراعت کو دیکھ　　عزت کے لئے کافی ہے اے دل نیکی

مختصر یہ ہے کہ اکبر نے ایک ماہر حکیم کی حیثیت سے اہلِ قوم کے مرض کی تشخیص کی اور ساتھ ہی اس کا علاج بتایا ۔ اس طرح سے انہیں نے قوم کو پستی سے ابھارنے کی کوشش کی ۔

سیاسی رباعیات

اکبر کی رباعیات اپنے دور کی آئینہ دار ہیں۔ ان کی رباعیات میں ہم کو غدر کے بعد کا ہندوستان صاف نظر آتا ہے۔ انگریز ایک تاجر قوم تھی۔ حکومت کرنے کو بھی وہ تجارت ہی سمجھتی تھی۔ اس لئے وہ زیادہ سے زیادہ مال و دولت کو سمندر پار کھینچنے میں مصروف تھی، انگریزوں کی یہ ذہنیت اور پالیسی ہندوستان کے لئے بہت مضر تھی۔ جس سے ہندوستان روز بروز کنگال ہوتا جا رہا تھا۔

اکبر کی ایک رباعی انگریزوں کی اسی نوچ کھسوٹ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

یہ بات غلط کہ دارالاسلام ہے ہند — یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہ انگلش — یورپ کے لئے بس ایک گودام ہے ہند

اکبر کی رباعیات سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اردو ہندی کے جھگڑے کی بنیاد ان کے دور میں پڑ چکی تھی۔ اکبر دراصل ایک ہندوستانی زبان کے قائل تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں نہ عربی رائج ہو سکتی ہے اور نہ سنسکرت، بلکہ ایسی زبان مقبول ہو سکتی ہے جس میں عربی اور سنسکرت کے ثقیل الفاظ نہ ہوں۔ انھیں نظریات کا عکس بعد میں ہم کو گاندھی جی کے یہاں واضح طور پر ملتا ہے۔ اکبر نے مندرجہ ذیل چند رباعیات میں اردو ہندی کے مسائل پر طنزیہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ پہلے ایک رباعی ملاحظہ کیجئے۔ اور "نسخۂ گاؤ زبان" کی ترکیب کی داد دیجئے۔

وہ لطف اب ہندو مسلماں میں کہاں — اغیار ان پہ گذرتے ہیں اب خندہ زناں
جھگڑا کبھی گائے کا، زباں کی کبھی بحث — ہے سخت مُضر یہ "نسخۂ گاؤ زباں"

اکبر کی رباعیات سے اردو کی مخالفت کے علاوہ عربی کی بے قدری بھی ظاہر ہوتی ہے اس مضمون کی ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

اکبر مجھے شک نہیں تری تیزی میں — اور تیرے بیان کی دل آویزی میں
شیطان عربی سے ہند میں ہے بیخوف — لاحول کا ترجمہ کر انگریزی میں

مذہبی رباعیات

مغربی تہذیب نے لباس، خوراک، گفتگو اور طرزِ معاشرت کو ہی نہیں بدلا بلکہ مذہبی خیالات میں بھی انقلاب برپا کر دیا۔ سائنس کی ترقی نے خدا کے وجود پہ بھی حملہ کیا۔ ایک طبقہ کا خیال تھا کہ خدا کا وجود ہی نہیں ہے بلکہ دنیا اپنی تخلیق و تنظیم کے لئے نیچر کی رہین منت ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ روح کی کوئی حقیقت نہیں ہے، بلکہ مختلف عناصر کے توازن سے جسم برقرار رہتا ہے اور جب یہ توازن ختم ہو جاتا ہے انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو نیچری کہا جاتا تھا۔ حالی کی طرح اکبر بھی نیچریوں کے سخت خلاف تھے۔ کیونکہ ان کے عقائد اسلام کے منافی تھے۔ اکبر نے نیچریوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ان کا مضحکہ اڑایا۔

مندرجہ ذیل رباعی میں اکبر کی صدائے باز گشت موجود ہے۔

عینک آنکھوں میں منھ میں مصنوعی دانت — نیچر نے شکھا کے کر دیا جسم کو تانت
ابتک ہے مگر وہی ہوس حضرت کی — ہے طولِ امل ہنوز شیطان کی آنت

نیچریوں کی آواز کو دبانے کے لئے اکبر نے اسلام کی اشاعت و تبلیغ کی کوشش کی وہ کسی صورت میں بھی اسلام کو فراموش نہیں کرتے تھے۔ ان کی اسلام پرستی کا ایک واقعہ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے "اکبر نامہ" میں مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے:

"جولائی ۱۹۲۱ء میں الہ آباد میں نیاز حاصل ہوا (آہ کہ وہی ملاقات آخری تھی) اپنے اوپر وقت کے اکثر نوجوانوں کی طرح نشہ

تحریک خلافت اور ترک موالات کا سوار تھا۔ مہاتما گاندھی کی روحانیت اور تقدس کے تذکرے ورد زبان تھے، بات بات پران کی بزرگی اور روحانیت کا حوالہ، دل میں آرزو کہ حضرت اکبر پر بھی یہ جادو چل جائے اور وہ بھی نان کوآپریشن کمیٹی کے باضابطہ ممبر بن جائیں۔ حضرت نے دو چار منٹ توجہ کی، اس کے بعد یک بیک پوچھ بیٹھے۔ اچھا صاحب آپ کے بیان سے تو معلوم ہوا کہ گاندھی جی بڑے موحد اور روحانیت کے علمبردار ہیں۔ اپنی کمیٹی میں انھوں نے داخلے کی پہلی شرط لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ تو ضرور رکھی ہوگی۔ میں ساری چوکڑی بھول گیا۔ مری ہوئی آواز سے جواب دیا کہ "جی نہیں ایسا تو نہیں۔" بس تو مجھے بھی آگے کچھ پوچھنا نہیں۔ ایک سیاسی انجمن ہے، جیسی اور بہت سی انجمنیں آجکل ہیں۔"

الغرض اکبر کو سب سے زیادہ عزیز اسلام تھا۔ وہ مذہبیت کو وطنیت پر ترجیح دیتے تھے اور اسلامی اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ ایک رُباعی میں انھوں نے قرآن کی برتری کا ذکر کیا ہے :

حق نے جنھیں دی ہے فہم قرآن مجید   ہونے کے نہیں وہ پیر گردوں کے مرید
بدلے سو رنگ انقلاب دنیا   ہر حال میں ان کو ہے خدا سے امید

غرضیکہ اکبر ہر حال میں اسلام کی موافقت کرتے تھے، انھوں نے اسلامی عقائد کو قائم رکھنے میں مسلمانوں کی کافی مدد کی، اور ان کو ایک حد تک کامیابی بھی ہوئی۔

اخلاقی رُباعیات

اکبر نے یہ بھی محسوس کیا کہ مغربی تہذیب کے بھوت نے ہندوستانیوں کے اخلاق پر بھی برا اثر ڈالا، لہٰذا انھوں نے ان کے اخلاق و عادات کو بھی سنوارنے کی کوشش کی۔ اور مختلف رباعیوں کے ذریعہ انھوں نے اپنا پیغام ان تک پہنچایا، انھوں نے ہم کو اپنی نیت درست کرنے اور دل صاف رکھنے کی تلقین کی اور یہ بھی بتایا کہ اگرچہ غصہ کرنا بہت برا ہے۔ مگر دل میں کینہ رکھنا اس سے بھی زیادہ برا ہے۔ ایک رباعی ملاحظہ ہو۔

اونچا نیت کا اپنی زینا رکھنا   احباب سے صاف اپنا سینا رکھنا
غصہ آنا تو نیچرل ہے اکبرؔ   لیکن ہے شدید بغض و کینا رکھنا

ایک رُباعی میں رشوت، عیاشی، خوشامد اور گستاخی کی مذمت کی ہے۔

رشوت ہے گلوئے نیک نامی کا چھُرا   عیاشی ہے بدی کے پہیئے کا دُھرا
ہر چند کہ بے محل خوشامد ہے بری   گستاخ مگر خوشامدی سے بھی بُرا

ایک اور رباعی میں وہ حرص و ہوس کی مذمت کرتے ہیں ۔

تھا سر میں کمال وہ سلطان بنا   تھا دل میں جمال وہ مسلمان بنا
لذت طلبی سے نفس رندی پہ جھکا   تھا پیٹ بہت حریص شیطان بنا

مندرجہ ذیل رُباعی میں مال و دولت کی تحقیر کی گئی ہے اور علم کی سربلندی ظاہر کی گئی ہے۔

بے سُود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش   ذلت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش
اکبرؔ تو سرور طبع کو علم میں ڈھونڈھ   محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

اکبر نے اپنی رباعیات کے ذریعہ شراب نوشی کی بھی مذمت کی ہے اور اس کے مضر نتائج سے لوگوں کو آگاہ کیا ہے۔

پاکیزگیٔ نفس کی دشمن ہے ہے ‌‌‌ انسان کو خراب کرنیوالی شے ہے
شیطان کی ہے پرائیویٹ سکریٹری ‌‌‌ مسلم اور اس کو منہ لگائے ہے ہے

اکبر نے ہندو مسلم اتحاد کی بھی کوشش کی، انھوں نے بتایا کہ آپس میں موجوں کی طرح اگر کبھی لڑ بیٹھو تو کوئی ہرج نہیں مگر انگریزوں کے مقابلہ میں ہمیشہ ایک ہو جاؤ۔

کہتا ہوں میں ہندو و مسلماں سے یہی ‌‌‌ اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
لاٹھی ہے ہوائے دہر، پانی بن جاؤ ‌‌‌ موجوں کی طرح لڑو، مگر ایک رہو

غرضکہ اکبر کی اخلاقی رباعیاں ہندوستانیوں کے کردار کو بلند کرنے میں کافی معین و مددگار ثابت ہوئیں۔ ان رباعیوں میں خاص بات یہ ہے کہ ناصحانہ ہوتے ہوئے بھی شاعرانہ ہیں۔ اس لئے وہ دل کو گرویدہ کر لیتی ہیں۔

عارفانہ متصوفانہ رباعیات

اخلاقی رباعیات کے علاوہ اکبر نے متصوفانہ رباعیاں بھی کہی ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا قول ہے کہ اکبر کا جب جوش شباب ٹھنڈا ہو گیا تو انھوں نے ظرافت کے زعفران زار کو ترک کر دیا اور معرفت کے چمن زار کی سیر میں محو ہو گئے۔ ان کی مندرجہ ذیل عبارت ملاحظہ ہو۔

"جب تک خود جوان رہے۔ شوخ طبعی بھی جوان رہی۔ عمر کا آفتاب جب ڈھلنے لگا تو ظرافت کا بدر کامل بھی رفتہ رفتہ ہلال بنتا گیا۔ اب اس کی جگہ آفتاب معرفت طلوع ہونے لگا۔ بالوں میں سفیدی آئی اور صبح پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ظرافت نے انگڑائیاں لیں اور زندہ دلی کی شمع جھلملانے لگی۔ حکمت کی تابش اور حقیقت کی تڑپ دل میں پیدا ہوئی۔ جمالِ حقیقی کی جلوہ آرائیوں نے چشمِ بصیرت کو محو نظارہ بنایا۔ سوزش عشق نے سینہ کو گرمایا ذوقِ عرفان نے دل کو تڑپایا اور معرفت کی شعاعیں ان کے قلب سے اس نورانیت کے ساتھ پھوٹیں کہ تماشائیوں کی آنکھوں کو قریب تھا کہ چکا چوند لگ جائے"[1]

یہ عبارت اکبر کی رباعیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ اگرچہ اکبر کے یہاں معرفت کی رباعیاں بہت کم ہیں، مگر جو کچھ بھی ہیں وہ ایام پیری کی تخلیق معلوم ہوتی ہیں، اسی لئے ان میں ان کی عارفانہ غزلوں کی طرح "حکمت کی تابش" اور "حقیقت کی تڑپ" موجود ہے ان کی دو متصوفانہ رباعیاں ملاحظہ کیجئے:

کیا تم سے کہیں جہاں کو کیسا پایا ‌‌‌ غفلت ہی میں آدمی کو ڈوبا پایا
آنکھیں تو بے شمار دیکھیں لیکن ‌‌‌ کم تھیں بخدا جنھیں کہ بینا پایا

کھولی ہے زبان خوش بیانی کے لئے ‌‌‌ اٹھا ہے قلم گہر فشانی کے لئے
آیا ہوں میں کوچۂ سخن میں اکبر ‌‌‌ نظارۂ شاہد معانی کے لئے

فلسفیانہ رباعیات

اگرچہ متصوفانہ رباعیاں اکبر نے کم کہی ہیں، مگر ان کے یہاں فلسفیانہ رباعیوں کی تعداد کم نہیں ہے۔ یہ رباعیاں زیادہ تر دنیا کی بے ثباتی پر کہی گئی ہیں اور ان میں آلودگیٔ دنیا سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ دو رباعیاں ملاحظہ ہوں:

---

[1] اکبر نامہ یا اکبر میری نظر میں از مولانا عبدالماجد دریا بادی۔ صفحہ ۱۲

فرمانِ اجل کا آ گیا وقت۔ صدور ہوں گے کوئی دم میں شاملِ اہلِ قبور
دیکھیں منکر نکیر کیا کہتے ہیں یاں سب مجھے کہتے ہیں خدا وند حضور

مسکین گدا ہو یا بادشاہ ذی جاہ بیماری و موت سے کہاں کس کو پناہ
آ ہی جاتا ہے زندگی میں اک وقت کرنا پڑتا ہے سب کو اللہ اللہ

ذاتی رباعیات

اگرچہ اکبر کی رباعی کا خاص موضوع اخلاق و اصلاح ہے تاہم انھوں نے مختلف موضوعات پر بھی کچھ طبع آزمائی کی ہے۔ —————— یہاں تک کہ ان کے یہاں کچھ ذاتی رباعیات بھی مل جاتی ہیں۔ انھوں نے ایک رباعی مولوی محمد حسین آزاد کی وفات پر کہی ہے۔

حضرت کی وفات سے ہے ہر اک دل ریش رکھتے تھے عزیزان کو بیگانہ و خویش
کیا صفتیں تھیں جمع ان میں اکبر حافظ، حاجی، طبیب، عالم، درویش

ایک جگہ مولوی کرامت حسین بیرسٹر کے خیال کی تائید کی ہے۔

اقبال کے ساتھ اب خرد تو بھی گئی عزت کے ساتھ مذہبی بو بھی گئی
سچ کہتے ہیں حضرات کرامت اکبر رخصت ہوئی فارسی تو اردو بھی گئی

اکبر کی رباعیات نے اردو ادب میں حیاتِ جاوداں حاصل کر لی ہے اکبر سے پہلے اور کسی شاعر نے اُردو رباعی کو اس قدر زیادہ طنز کی تلخی سے آشنا نہیں کیا تھا۔ اکبر کا آرٹ یہ ہے کہ وہ طنز کو ظرافت کی مٹھاس میں لپٹا کر پیش کرتے ہیں اس لئے طنز کی کڑواہٹ محسوس نہیں ہوتی ہے۔ اہلِ ظاہر صرف ان کے طنز کے لباس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر اہلِ باطن کی نظریں لباس کو چیر کر معنی کے جسمِ رنگیں تک پہنچ جاتی ہیں۔

اکبر کی ظرافت میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں نزاکت و لطافت کے جوہر نمایاں رہتے ہیں۔ اس لئے ان کی رباعی مزاحیہ ہونے کے باوجود پست، مبتذل اور رکیک نہیں کہی جاسکتی ہے۔ ساتھ ہی اس میں لطفِ زبان اور حسنِ بیان کی بھی خوبیاں موجود ہوتی ہیں۔ روزمرّہ اور محاورہ کا پُر لطف اور برمحل استعمال بھی ان کی رباعیات میں پایا جاتا ہے۔

ان محاسن کے علاوہ اکبر کی رباعیات میں ایک نئی خوبی پائی جاتی ہے۔ اکبر نے قافیوں کے انتخاب میں بھی بہت سلیقہ اور بڑی ندرت سے کام لیا ہے یہ قافیے صرف اُردو زبان ہی سے نہیں لئے گئے ہیں بلکہ انگریزی قافیوں کو انھوں نے اس حسن و خوبی کے ساتھ اشعار میں جڑ دئے ہیں جیسے کہ وہ ہندوستان ہی کے نگینے ہوں۔ ان کے اندازِ بیان نے ان قافیوں کی اجنبیت اور غیر مانوسیت کو ختم کر دیا ہے۔

اکبر کی رباعیات میں اشاریت اور رمزیت بھی موجود ہے۔ جو غزل کی جان ہے۔ وہ رباعیات میں "مشاہدۂ حق" کی گفتگو "بادہ و ساغر" کے پردے میں کہتے ہیں۔ لیکن یہ گفتگو ان کے یہاں بدلے ہوئے انداز میں ہے۔ کیونکہ غزل کے رمزیہ الفاظ ان کے مفہوم کی ادائیگی میں قاصر ہیں۔ اس لئے انھوں نے نئے نئے الفاظ اور تراکیب وضع کیں۔ انھوں نے رباعیات میں منم، مس، شیخ، سید، کلیسا، حرم و بیر، بتکدہ وغیرہ الفاظ استعمال کئے۔ یہ الفاظ ایک خاص اور عمیق مفہوم اپنے اندر چھپائے ہیں۔ اس لئے مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے بقول انھوں نے ان الفاظ کی مدد سے ایک نیا "آئینِ اکبری" تیار کیا ہے۔

اندازِ بیان کی خوبی کے ساتھ ساتھ۔ اکبر کی رباعیات کی افادیت سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ انھوں نے مشرقیت

اور اسلامیت کو برقرار رکھنے کی جان توڑ کوشش کی اور ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے محافظ بنے رہے۔ عوام کو افعال قبیحہ سے باز رکھنا اپنا فرض سمجھا۔ خصوصاً نوجوان طبقہ پر ان کی کڑی نظر رہی۔ کیوں کہ ان کی عمر بہک جانے والی ہوتی ہے۔

اکبر کا رنگ اور ان کی رباعیات کافی مقبول ہوئیں۔ ان کے ہمعصر شعراء بھی ان کے اثر سے نہ بچ سکے۔ خصوصاً اقبال کے طنز میں اکبر کی روح پوشیدہ ہے۔ اقبال نے بلاشبہ ان کی ظرافت سے خوشہ چینی کی ہے۔ اکبر کی آواز اب بھی مدھم نہیں ہو سکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کی آواز اردو رباعی کی فضا میں صدیوں تک گونجتی رہے گی۔ اور سونے والوں کو چونکاتی رہے گی۔

اکبر کی دُور بینی

(سیّد قدرت نقوی)

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں وہ ایک آفاقی انتشار کا دور ہے۔ یہ ساری دنیا ایک کرب و بےچینی کا شکار ہے، اطمینان و سکون عنقا ہے۔ ہر ذی روح برق رفتاری کی زد میں ہے۔ اس برق رفتاری نے زندگی کی جملہ اقدار کو ایسا متاثر کیا ہے کہ انسان و انسانیت لامرکزیت کے نقطۂ عروج پر معلق ہے۔ حیات انسانی کا ثبات و ارتقاء، علم و معرفت معاشرت اور معیشت پر منحصر ہے یعنی ان تینوں سے ایک مثلث قائم ہوتی ہے۔ راسی زاویۂ علم و معرفت ہے اور قاعدے کے زاویے معاشرت اور معیشت ہیں اگر ان میں سے ایک بھی نہ رہے تو انسانی زندگی ثبات و ارتقا اور خوشحالی سے محروم ہوجاتی ہے۔ آج کا المناک حادثہ یہی ہے کہ حیات انسانی کے یہ تینوں زاویے اپنی اپنی جگہ چھوڑ چکے ہیں۔ اسی لئے ہر طرف ہر طرح کا انتشار ملتا ہے، کہیں سکون و اطمینان کی صورت نظر نہیں آتی۔

آج سائنس کی بدولت زمین کی طنابیں کھنچ گئی ہیں اور دنیا قریب سے قریب تر آگئی ہے۔ آج دوری بےمعنی ہوکر رہ گئی ہے ذرائع مواصلات نے تمام فاصلوں کا خاتمہ کردیا ہے اور دنیا ایک برادری بن گئی ہے۔ دنیا کے ہر گوشے سے ہمارا رابطہ اور سلسلہ اتنی جلد قائم ہوجاتا ہے کہ کروڑوں میل کی مسافت بسا اوقات چشم زدن میں طے ہوجاتی ہے اور بسا اوقات اس فاصلے کے ختم ہونے میں چند گھنٹے صرف ہوتے ہیں۔ اس امر سے ہمیں انسانیت کے عروج میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اور ہم انسانی درد میں ہمدرد بن سکتے ہیں، لیکن افسوس جو اتحاد و یگانگت کا سبب ہوسکتا تھا وہی افتراق و مخالفت کا سبب بن گیا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کا جواب یہ ہے کہ موجودہ سائنسی ترقی جس جذبے کی رہین منت ہے وہ فلاح و بہبود عالم کا جذبہ نہیں بلکہ اس ارتقاء میں اوّلیت جذبۂ استیلا، استحصال و استیصال کو حاصل ہے۔ جوع الارض۔ جلب زر، تسلط۔ تصرف، فوقیت و برتری اور حصول اقتدار کی گوناگوں خواہشات نے اس جذبہ کو جنم دیا۔ جن کی تکمیل کی دوڑ کو ارتقاء، تہذیب، انسانی فلاح و بہبود کا نام دیا گیا، اسی دوڑ نے اقوام عالم کو زیر و زبر اور تہ و بالا کر کے رکھ دیا۔ معیار ترقی صرف اعلیٰ ترین و مہلک ترین ہتھیار قرار پائے۔

اب سے کچھ مدت پہلے دنیا کو جنگ کی آماجگاہ صرف تجارت کی خاطر بنایا جاتا رہا ہے، لیکن وہ تجارت اشیاء اور مصنوعات کی تجارت تھی۔ اسی تجارت نے حکومت کے زریں خواب دکھائے تو تجارت کے ساتھ ساتھ حکومت کی داغ بیل بھی پڑنے لگی، گویا جلب زر کی خواہش نے جوع الارض کا روپ دھار لیا اور یہ سونے پر سہاگا ہوا، لہٰذا تجارت کے فروغ، خام مال کے حصول میں حکومت بہترین پشت پناہ اور مددگار ثابت ہوئی۔ حکومت و اقتدار کے استحکام، تجارت کی حفاظت اور مزید خطوں پر قبض و استیلا کی خاطر مہلک ترین ہتھیاروں کی ایجاد و ساخت کی دوڑ شروع ہوئی لیکن ساتھ ہی ان ہتھیاروں کی تجارت سے

جلب زر کے بہترین مواقع مہیا کرنے کے لئے کم حیثیت حکومتوں میں اپنا دخل جما کر ریشہ دوانیاں کر کے ایک دوسرے سے ٹکرا دینے کی روش اختیار کی تاکہ ہتھیاروں کے لئے منڈی مل سکے۔ ان تمام امور نے جذبۂ مسابقت کو ابھارا، اب جوع الارض نے ملی الارض کی راہ سجھائی اور پرواز میں پرواز جہاں کا تصور پیش کیا۔ حالانکہ یہ تصور محض دیگر اقوام کو خوش کرنے کے لئے تھا ورنہ اصلی سبب وہی جلب زر اور جوع الارض کے جذبہ کی تسکین و تکمیل تھا اور ہے۔

اس دور ترقی اور روشِ ارتقاء نے بنی نوع انسان کو ایک بازگردانی گردش مسلسل ولامتناہی کا شکار بنا کر چک پھیریوں کی نذر کر دیا اور ایک ایسی مثلث کو وجود بخشا کہ جس کے اضلاع موجود زاویے غائب۔ ہر انسان کے سامنے اب راستے موجود منزل مفقود، مقصد بے مقصود۔ تمناؤں کا ہجوم، حصول عنقا۔ جس نے بے راہ روی میں فلاح و بہبود کا راستہ دکھایا۔ اس بے راہ روی میں حصول زر نے مرکزی حیثیت اختیار کر لی۔

اس پس منظر کی روشنی میں ثبات وارتقاء حیات کی کفیل مثلث اور اس کے تینوں زاویوں کے متعلق غور فرمایئے تو واضح ہوگا کہ ان تینوں کے نقطہ ہائے اتصال کو کس طرح افتراق کی صورت دی گئی ہے اور کس کس طرح زندگی کو ختم کرنے کے سامان بہم پہنچائے گئے۔

علم و معرفت، مذہبی اقدار کی بقا اور ذہن انسانی کی تہذیب و جلا کا ذریعہ و وسیلہ ہے۔ اس کا دائرہ اتنا وسیع ہے کہ تمام زندگی کو محیط ہے اور زندگی کی بقا و استحکام کی مثلث کا راسی زاویہ ہے اسی سے قاعدے کے زاویے معاشرت و معیشت فیض پاتے ہیں لیکن موجودہ ترقی کی دوڑ میں اس کو صرف مادی فروغ اور تحقیق کے لئے وقف کر دیا گیا۔ یعنی علم کے ذریعہ مادیات کا تجزیہ کر کے ان کے خواص و کیفیات و اثرات کا علم حاصل کیا۔ اس علم کی بدولت مذہب پر ضرب کاری لگائی گئی اور مافوق الفطرت قوتوں اور ان کی اثر اندازی کا انکار کیا گیا۔ مادیین کے خیالات و نتائج کی تائید کی گئی اور اس طرح مذہب کے خلاف نعرہ بلند کر کے مذہب کے تصور ہی کا خاتمہ کر دیا گیا اور ساتھ ہی انسانی جبلت و فطرت کا نام لے کر ان تمام خواہشات کو عین فطرت سمجھا جانے لگا جن پر مذہب نے مضر و مہلک سمجھ کر قدغن لگا رکھی تھی۔ بظاہر عام انسانی زندگی کی فلاح و بہبود کے لئے مال و دولت کی مساویانہ تقسیم کا خوش کن تصور پیش کر کے ایک تازہ نظام حیات پیش کیا گیا جس کو مادی ترقی کی معراج قرار دیا گیا۔ اب انسان صرف اس منزل پر آکر کھڑا ہو گیا کہ اس کا ذہن تخریب کو تعمیر کا روپ دے کر اپنی فوقیت و برتری جتلائے۔ اور بنی نوع کو اپنا مطیع و منقاد بنائے۔ اس ارتقاء کا مرکزی نقطہ یہ قرار پایا کہ مہلک ترین ہتھیار تیار کئے جائیں جن کے ذریعے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں اور وسیع سے وسیع تر بلکہ وسیع ترین خطۂ خاک کو حیات و قوت حیات سے محروم کر دیا جائے اور ایسے آلات و سامان کے ذریعے دنیا کو خوفزدہ کیا جا سکے تاکہ چودھراہٹ قائم رہے۔

علم و معرفت جس سے انسانی زندگی کو استحکام حقیقی بخشا جا سکتا تھا اس سے صرف استہلاک کے سامان مہیا کئے گئے اور ذہن انسانی کے منور آئینہ کو اندھا کر کے صرف ایک روشن نقطہ چھوڑ دیا گیا جس پر شعاعیں معکوسی انداز میں پڑیں اور ان کا انعکاس منقلبانہ۔ عکس لطیف نے بھی عکس کثیف جیسی کیفیت اختیار کر لی اور طیف ذہنی نے یک رنگی کو ہفت رنگی کے جلوے ضرور دیئے مگر ان شعاعوں نے خیرگی کو پناہ دی اور روشنی کو تاریکی میں بدل ڈالا۔ زندگی کے فروغ کے مناظر دکھلائے مگر زندگی کو کرب، درد، اضطراب و انتشار کی دولت بخشی، اس انتشار ذہنی نے بادگردانی کا عمل اختیار کیا جس سے ہر شے میں سلبی اعتقاد پیدا ہوا۔ ہوا یوں کہ تعلیم جو عوام کا نجی اور داخلی مسئلہ تھا اس کو اولاً حکومت کی سرپرستی میں لیا گیا بعد ازاں تعلیم

اور تعلیمی منصوبہ کلیتہً حکومت کے فرائض میں شامل ہوگیا۔ اب حکومتوں نے عوامی فلاح و بہبود، ذہنی جلا اور انسانی فطرت کے مقتضا کو پس پشت ڈالا اور اپنے مفاد کو مدنظر رکھ کر تعلیمی منصوبے بنائے اور ان پر عمل کرایا اور اس کے پس منظر ملازمتوں کے حصول کے سبز باغ سجائے اور دکھائے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام اس طرف لپکے، سونے پر سہاگا طریقۂ امتحان ہوا جس نے ذہنی جلا کے تمام راستے مسدود کردئے کہ صرف سندات کے حصول کی خاطر ہر وہ طریقہ استعمال کیا جانے لگا جو مفید طلب ہو بجز حصول علم۔ اس سلسلہ میں صرف ان حضرات کی کچھ حوصلہ افزائی ضرور ہوئی جو حکومت کے منصوبوں کی تکمیل میں مفید ثابت ہوتے۔

تعلیم کے حقیقی مقصد کو ختم کرنے سے۔ مذہب، تہذیب اور اخلاق خود بخود زوال کی زد میں آگئے۔ کیونکہ اب علم کی حدود سے ان کو خارج کر دیا گیا، ستم ظریفی یہ کہ نہ صرف خارج کر دیا بلکہ ان کے نام تک سے تنفر پیدا کیا گیا۔ مذہب کو مادیاتی تحقیقاتی نتائج کے بل بوتے پر رد کیا گیا، فطرت کے رموز کی دریافت اور نئی تحقیقات کائنات کی سطحیت کو آلۂ کار بنایا گیا کیونکہ بعض قدیم نظریات و موہومات کی تردید اس کے ذریعہ ہوتی تھی لیکن یہ غور نہیں کیا گیا کہ ان فروعی امور سے اصل کا کیا اور کتنا تعلق ہے تہذیب و اخلاق پر نفسیات کے نئے نظریات پیش کر کے ختم کیا گیا حالانکہ نفسیات کے وہ محققین جن کو اولیت و اولیت کا شرف بخشا گیا اور جن کو پیشوا قرار دیا گیا وہ خود ایک بیمار معاشرے کے فرد اور ان کے تمام نتائج اسی بیمار معاشرے کے افراد کی ذہنی تحلیل و تجزیہ کے نتائج ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان نظریات کے فروغ نے پورے کرۂ ارض کو ذہنی مریض بنا دیا اس ذہنی بیماری کا مرکز اول و آخر جنس قرار پائی اس کی تقویت کا سامان ان تفریحی مشاغل کے ذریعہ بہم پہنچایا جو جلب زر کا بہت بڑا وسیلہ تھے اور جن میں عریانیت کے ذریعہ جنسی جذبات کو برانگیختہ کیا جا سکتا تھا۔

علم کو سہل الحصول اور عام بنانے کے خوش کن خواب دکھا کر وہ تمام علوم جو بنی نوع انسان کی خدمت کے لئے مختص تھے اب وہی حصول دولت کا سب سے بڑا ذریعہ بنے اور خدمت میں عظمت ہے کے تصور کو ختم کر کے، دولت میں عظمت ہے کے تصور کو فروغ دیا گیا، اسی علم سے انفرادی اہمیت کا احساس دلا کر اپنی ذات میں استغراق کا نیا نظریہ وجود میں لایا گیا اس نظریہ کو جدید سیاست میں فرد کی اہمیت نے اور تقویت بخشی، اسی انفرادیت کے احساس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انسان معاشرے کا فرد ہوتے ہوئے بھی معاشرے سے لاتعلق ہو گیا اور اس کا نقطۂ عروج یہ ہوا کہ قوم، قبیلہ کی حدود ختم ہوئیں اور انتہا یہ ہوئی کہ خاندان میں رہتے ہوئے اس سے الگ تھلگ ہو گیا کہ ادھر ہوش سنبھالا اور ادھر بزرگوں کی متابعت اور خاندانی اصول و قوانین سے انحراف و انکار کا اظہار ہونے لگا۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے تک اس نے تمام قیود و قوانین کو بالائے طاق رکھ کر اپنی انفرادی آزادی کا اعلان کر دیا۔ یہ احساس ذات کی کرشمہ زائیاں ہیں کہ آج کا فرد ان تمام روحانی رشتوں سے لاتعلق ہے جو زندگی کا اہم جز تھے اور ہیں آج کا فرد باپ، ماں، بیٹا، بیٹی تک کے قریبی رشتوں کے تقدس و احترام کو ختم کر چکا ہے اور تھوڑی مدت کے بعد یہ بالکل معدوم ہو جائیں گے البتہ غیر مہذب طبقات و قبائل میں ان کا وجود خال خال نظر آئے گا۔

علم و معرفت اور معاشرے کی بیخ کنی میں جن حربات سے کام لیا گیا، ان میں صرف مادیت کے تصور کو ہر پہلو سے اہمیت دی گئی تھی۔ ضروریات زندگی کو عام کرنے اور ہر شخص تک پہنچنے کے تصوّر سے ذہنوں میں خوشی کی لہر دوڑائی گئی تھی۔ مگر یہ خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔ کیونکہ خداوندان زر نے اپنی دولت میں اضافہ کے چند در چند طریقے نو بہ نو وسیلے اختیار کرنے شروع کر دیے وہ فرد جو دن بھر کی محنت سے قوت لایموت مہیا کرتا تھا اس کو مشینوں کے ذریعہ مفلوج بنا یا گیا، اور اپنے صنعتی فروغ کے لئے بے بس اور مجبور انسانوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک اختیار کیا گیا۔ انتہا یہ کے دور اوّل میں بچوں اور

عورتوں سے قلیل سرمایہ کے عوض اتنی شدید محنت لی جاتی کہ جب برداشت سے باہر ہو جاتی تو وہ بے دم ہو کر گر پڑتے بیہوش ہو جاتے، اسی عالم میں ان پر دُرّے برسائے جاتے اور مجبور کیا جاتا کہ وہ بلا توقف مسلسل کام کرتے رہیں، انسانی زندگی چیخ اٹھی، آخر کار بغاوت ہوئی مگر ان اہل زر نے حصول زر کے روپ بدل ڈالے اپنے سرمایہ و دولت میں اضافہ کے لئے کارخانوں کے ذریعہ ایسی چیزوں کی ساخت اپنا مقصد بنایا جو انسانی زندگی کے لئے قطعاً لابدی نہ تھیں بلکہ ان کا تعلق صرف عیش و عشرت کے مواقع بہم پہنچانا تھا، یا جن سے دولت و زر میں اضافہ تو ہو سکتا تھا مگر انسانی حیات کو ان سے فائدہ پہنچنا ممکن نہ تھا جو زندگی کے لئے بالکل غیر ضروری تھے مگر ان چیزوں کا لپکا لگا کر ان کی تجارت کا میدان وسیع تر کیا گیا۔

اس طرح وہ سادہ زندگی جو فطرت کے عام اصول و قوانین کے مطابق بسر کی جاتی تھی جس میں تعیش غیر حقیقی کا مطلق دخل نہیں ہوتا تھا۔ جس میں ضروریات کا دائرہ بہت ہی مختصر تھا اب اس میں تصنع آگیا اور انسان نے اپنے گرد ایک جھوٹے وقار کا تانا بانا کرنا شروع کر دیا جس میں اسباب لایعنی و لاتعلق کی افراط کو اہمیت حاصل ہوئی جو صرف نمود و نمائش کا ایک ذریعہ ہوتے ہیں اور جن کے ہونے اور نہ ہونے سے زندگی کی اصل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ان کے بغیر بھی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ ان امور نے معیشت کو بری طرح متاثر کیا اور آج کا انسان ان لایعنی ضروریات کے جال میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ ان کے بغیر زندگی بسر کرنا اسے دشوار نظر آتا ہے۔ اس نے ضرورت زر کا احساس دلایا اور اس احساس نے حصول زر کے غیر فطری ذرائع تلاش کئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ معیشت بھی تباہی کا شکار ہو گئی۔

امور مذکورہ اس دور ترقی سے متعلق ہیں جن کو ہر صاحب عقل سلیم نے محسوس کیا اور اس سیلاب تباہی و بربادی پر بند باندھنے کی کوشش میں مصروف رہا۔ ہمارے بزرگوں نے بھی اسی قسم کی کوششیں کیں۔ سرسید، حالی، اکبر، اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے ہمیں شعور و احساس کی دولت بخشی۔ اب ان امور و مباحث کو اکبر کے کلام میں ملاحظہ فرمائیے اور ان کی دور بینی کی داد دیجئے ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں　　میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیویاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ہم کو　　دعا منہ سے نہ نکلی، پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

مشرقی کو ہے ذوقِ روحانی　　مغربی میں ہے میلِ جسمانی
کہا منصور نے خدا ہوں میں　　ڈارون بولے بوزنہ ہوں میں

نیچر کو ہوئی خواہش زن کی، اور نفس نے چاہا رشک پری　　شیطان نے دی ترغیب کہ ہاں لذت تو ملے زنا ہی سہی
نیچر کی طلب بالکل ہے بجا اور نفس کی خواہش بھی ہے روا　　شیطان کا ساتھ البتہ برا اور خوفِ خدا ہے اسکی دوا

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں　　آدمی آدمی بناتے ہیں
جستجو ہم کو آدمی کی ہے　　وہ کتابیں عبث منگاتے ہیں

اکبر کے کلام سے ان امور و مباحث کے متعلق بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں لیکن یہاں یہ چند اشعار کافی ہیں جو ان تمام امور پر روشنی ڈالتے ہیں۔

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے　　نئی تہذیب ہو گی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی　　نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے

نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردہ کی پابندی
نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے

بدل جائیگا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے
نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہونگے

عقائد پر قیامت آئے گی ترمیمِ ملت سے
نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہونگے

بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے
مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال سم ہونگے

ہماری اصطلاحوں سے زباں نا آشنا ہوگی
لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا سے
زیادہ ہیں جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

گزشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائینگے
کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر
بہت نزدیک ہے وہ دن کہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

کیونکر خدا کے عرش کے قائل ہوں یہ عزیز
جغرافیہ میں عرش کا نقشہ نہیں ملا

ہمیں کیا بالشویک آگیا یا روس آتا ہے
یہاں تو فکرِ سرمائی ہے ماہ پوس آتا ہے

ایرشپ سے ہم اماں اے چرخ پائیں گے کہاں
آسماں بولا کہ ہم سے اڑ کے جائیں گے کہاں

برق کے لیمپ سے آنکھوں کو بچائے اللہ
روشنی آتی ہے اور نور چلا جاتا ہے

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج
بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید

ہر گام پر جو طاعتِ حق سے الگ پڑا
ہوتے رہو گے مرکزِ قومی سے تم بعید

ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہوگی جب
ہو جاؤ گے بتانِ کلیسا کے تم مرید

شاید کہ مدعا بھی تمہارا ہے بس یہی
ہر چند ابھی ہے درس کے پردہ میں ناپدید

حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا
حافظ کا ایک شعر جو معنی کو تھا مفید

سرِ ازل کہ عارفِ سالک بکس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

ہماری تہذیبی قدریں اور اکبر الہ آبادی

(پروفیسر سجاد باقر رضوی)

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر　　تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں　　تو اپنی قوم مچاتی ہے شور واویلا
جو اعتدال کی کہیئے تو وہ ادھر نہ ادھر　　زیادہ حد سے دئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
ادھر یہ ضد ہے کہ لیمنڈ بھی چھو نہیں سکتے　　ادھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی مے لا
ادھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک　　ادھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دوگونہ عذاب است جانِ مجنوں را　　بلائے صحبتِ لیلیٰ و فرقتِ لیلیٰ

اور اکبر الہ آبادی کے زمانے میں مجنوں بیچارہ عجیب مصیبت میں پھنس گیا۔ اور اس کی اس مصیبت کی داستان کا آغاز ۱۸۵۷ء کو سمجھ لیجئے۔ اس لئے کہ ۱۸۵۷ء صرف ہماری آخری سیاسی جدوجہد کی علامت نہیں ہے، سیاسی طور پر ہم شکست کھا گئے اور یہ آخری لڑائی خارجی دنیا میں لڑی گئی اور بالآخر مغلیہ سلطنت کا چراغ گل ہو گیا اور قلعۂ معلیٰ سیاسی شکست کی علامت بن گیا۔ ۱۸۵۷ء تاریخ کا وہ موڑ ہے جس کے بعد ایک ذہنی جنگ شروع ہوتی ہے۔ ہندی مسلمانوں کی ذہنی زندگی کی تنظیم جن معیارات، اقدار، آدرش اور زندگی کرنے کے نظریوں سے ممکن تھی۔ ان کے خلاف بھی جنگ شروع ہوئی اور بقولِ اکبر ؎

توپ کھسکی پروفیسر پہنچے
جب بسولا ہٹا تو رندا ہے

اور اس رندے نے برِ صغیر کے مسلمانوں کے نظریۂ زندگی بالخصوص ان مابعد الطبیعاتی مفروضوں کو جن سے یہ نظریۂ زندگی وجود میں آیا تھا۔ گھس گھس کر چکنا کرنا شروع کر دیا۔ نئے مفروضوں اور زندگی کے نئے زاویوں نے مجنوں اور لیلیٰ کے اس رشتہ کو جس کی بنیاد دلی احساسات اور روحانی واردات پر تھی، جڑ سے صاف کرنا شروع کیا اور پھر یہ ہوا کہ صحبت لیلیٰ بھی ایک بلا ثابت ہوئی، اور فرقت لیلیٰ بھی۔ اور مجنوں اس دوگونہ عذاب میں مبتلا ہو گیا جس سے آج تک چھٹکارا نہیں مل سکا ہے۔

ابھی ہم معیارات، اقدار، آدرش اور زاویہائے نظر کی بات کر رہے تھے۔ ساتھ ہی ان مابعد الطبیعاتی مفروضوں کی جن پر ان تمام اولیاء اللہ واقدار، آدرش اور زاویۂ نظر کی اساس ہے جو ہماری تہذیبی زندگی کی مختلف صورتیں متعین کرتے ہیں۔ یہی معیارات اور اقدار آدرش اور نظریہ ہائے حیات ہماری شعوری زندگی کا جز ہوتے ہیں اور ہماری زندگی کے تنظیمی یا پدری اصول ہیں۔ یہ کبھی مذہب کی شکل میں نمایاں ہوتے ہیں تو کبھی زبان وادب کی صورت میں کبھی مسجد و مقبرے کی شکل اختیار کرتے

ہیں تو کبھی قلعے اور باغ کی ۔ مگر شعوری زندگی کا تنظیمی و پدری اصول صرف تنہا کام نہیں کرتا ۔ تنظیمی و پدری اصول کا براہ راست تعلق تخلیقی و مادری اصول زندگی سے ہوتا ہے ۔ زندگی کے تخلیقی و مادری اصول میں انسانی روح و دل؟ واردات و احساسات جذبات و جبلتیں ، اور خارجی دنیا کے جغرافیائی ، مادی حالات ، یعنی آب و ہوا و سرزمین سب کچھ شامل ہیں ۔

یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے اور وہ یہ کہ تنظیمی و پدری اصول زندگی ، یعنی وہ معیارات اور اقدار ، آدرش اور نظریہ ہائے زندگی جو ہماری شعوری زندگی کا حصّہ ہیں ، خود بخود وجود میں نہیں آتے ۔ سب سے پہلے وہ انسانی روح و دل اور کسی خطۂ سرزمین کے مخصوص مادی حالات کے ذریعہ پیدا ہوتے ہیں ۔ مگر بعد ازاں وہی معیارات و اقدار و آدرش اور نظریہ ہائے حیات ہماری روح و دل سے گفتگو کرتے ہیں ، ان سے رابطہ قائم کرتے ہیں اور اس طرح پدری و تنظیمی اصول کے مادری و تخلیقی اصول کے ملاپ اور تعلق کی وجہ سے ہماری تہذیبی زندگی پیدا ہوتی ہے ۔ اوائل تہذیب کی پرانی کہانیوں پر غور کریں تو پتہ چلے گا کہ ان کہانیوں میں ہیرو کسی دیوی کا بیٹا بھی ہوتا ہے اور اس کا محبوب بھی ، یا پھر رستم کی مثال لے لیں جو سہراب سے آخری لڑائی کے لئے ، زمین سے اپنی پرانی طاقت واپس لے لیتا ہے ۔ یہاں آپ کو دیو مالائی کہانیوں کی دیویاں اور زمین تخلیقی و مادری اصول کی علامت نظر آتی ہیں اور ہیرو پدری اصول زندگی کی ۔

بہر حال اس تمام طول و طویل علامتی گفتگو کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی شعوری تہذیبی زندگی ، جو معیارات ، اقدار آدرش ، نظریۂ زندگی اور ان سب کی مختلف ظاہری شکلوں سے بنتی ہے ، پدری و تنظیمی اصول زندگی بن جاتی ہے ۔ ایک مخصوص معاشرے میں انسان کی داخلی زندگی ، اس کے احساسات و جذبات ، روح و دل جو انسان کے تخلیقی و مادری اصول زندگی ہیں ، اس کے شعوری ، تہذیبی ، تنظیمی و پدری اصولوں سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہیۓ کہ جب یہ دونوں اصول آپس میں رابطہ قائم کرتے ہیں تو اسی وقت زندگی میں صحیح تخلیق ممکن ہوتی ہے ۔

وہ علم کم بصری جس میں ہمکنار نہیں تجلیات کلیم و مشاہدات حکیم

اور شاید علامہ اقبال بھی اس شعر میں اسی سمت اشارہ کرتے ہیں کہ جب تک خارجی محرکات و داخلی تجلیات باہر کی دنیا اور انسانی روح ، شعور و لاشعور ، پدری و تنظیمی ، مادری و تخلیقی اصول زندگی آپس میں ہمکنار نہیں ہوتے ۔ صحیح تخلیق ممکن نہیں ، البتہ علامہ اقبال یہ ضرور کہتے ہیں کہ مادری اصول تخلیق کا مقصد اور پدری اصول محض اس کا ذریعہ ہے ، لہٰذا اچھی شاعری محض فلسفہ نکھارنے اور تصویریں بکھیرنے سے پیدا نہیں ہوگی ۔ اس لئے کہ یہ باتیں شعور کا حصہ ہیں اور شعور محض تخلیق کا ذریعہ ہے اصل چیز تحریک تخلیق کا دباؤ ہے یعنی لاشعوری عمل ہے ۔

آیا کہاں سے نالۂ نے میں سرورِ مے
اصل اس کی نے نواز کا دل ہے کہ چوبِ نے
(اقبال)

دیکھیۓ ہم زندگی میں تخلیقی عنصر کی تلاش میں کہاں سے کہاں نکل گئے ۔ میں بہت سی الجھی الجھی باتیں کرنے کی معافی چاہتا ہوں اور سیدھے لفظوں میں آپ کے سامنے ایک موٹی سی بات کہتا ہوں اور وہ یہ کہ مشرق کا فلسفۂ حیات بالعموم اور برصغیر کے مسلمانوں کا بالخصوص ، زندگی کی اقدار اور اس کے معیارات و آدرش کا تعین روح و دل کے حوالے سے کرتا ہے ۔ جس میں اصل حقیقت ہمیشہ بدلتی ہوئی ۔۔ خارجی دنیا اور مظاہر سے ماوراء ہے ۔ اس اصل حقیقت کی تلاش سے ہی روح کا ارتفاع ممکن ہے اور ہمیں اس اصل حقیقت کی طرف کھینچنے والی بے پناہ قوت ، جذبۂ عشق ہے ۔ لہٰذا عشق اور اصل حقیقت کی تلاش

زندگی کی وہ قدریں ہیں جو زندگی کی دوسری اعلیٰ قدروں کی تشکیل کرتی ہیں اور ہمیں اس دنیا کی آلائشوں سے پاک رکھتی ہیں،

لیکن وہ تہذیبی جنگ جو سر سید احمد خاں صاحب کی سرکردگی میں انگریزوں نے ہم سے شروع کی۔ اس کے نتیجہ کے طور پر قیس و منصور، جو عشق اور حقیقت بینی کی علامت کے طور پر ہماری روحانی واردات کا حصہ بن گئے تھے۔ اب کیا ہو گئے، یہ اکبر سے سنئے ؎

قصۂ منصور سن کے بول اٹھی وہ شوخ مس　　یکسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

ہمارے مصلح اگر یہی ہیں بدل ہی دینگے مزاج لیلیٰ　　یہ مشورے دے رہے ہیں حضرت کہ بھیجدو قیس کو بریلی

اور اسی کے ساتھ ساتھ عشق کے جنون کی جامہ دری بھی گئی اور سینہ و دل سے تجلی بھی رخصت ہوئی ؎

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا!　　جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

صدائے فونوگراف بشنو ہمیں تماشائے لیمپ برقی　　ز سینہ و دل مجو تجلی خموش کن شمع ہائے شرقی

یہاں میں آپ سے معافی مانگتے ہوئے ایک جملہ معترضہ کی اجازت چاہتا ہوں۔ اور وہ یہ کہ ہمارے عقلیت پسند اور خارجی دنیا کو حقیقت جاننے والے ترقی پسند احباب اکبر کے منھ سے برقی لیمپ کی شکایت سن کر یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ساری سائنسی ترقی کے خلاف تھے۔ دراصل یہاں اکبر الہ آبادی نے "لیمپ برقی" کا استعمال علامتی طور پر کیا ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کس طرح ہماری زندگی میں خارجی معیارات، داخلی زندگی کی روحانی تنظیم سے کنارہ کشی کرتے جا رہے تھے، یہ وہی بات ہے جو امریکہ کے فاضل مصنف ہنری ایڈمس نے اپنے سوانح میں کہی ہے ان کی اس کتاب میں ایک باب ہے جس کا عنوان ہے VIRGIN VERSUS DIANAMO (حضرت مریم اور ڈائنمو) فاضل مصنف کا کہنا ہے کہ تاریخ میں ایک دور ایسا تھا کہ حضرت مریم کا مجسمہ انسانی زندگی کی تخلیقی صلاحیتوں کے لئے محرک ہوتا تھا اور اب (یہاں وہ امریکہ کی ۱۸۵۰ کی صنعتی نمائش کا حوالہ دیتے ہیں) ڈائنمو اس کا محرک ہوتا ہے اور اس کا نتیجہ، ان کی زبان سے سنئے،

"آج ہر امریکی عورت، یہ دیکھ کر متعجب ہے کہ وہ بانجھ ہو گئی ہے اور ہر امریکی مرد اس بات پر متعجب ہے کہ وہ نامرد ہو گیا ہے۔"

میں ہنری ایڈمس کے اس قول کی بھی صرف علامتی وضاحت کرتا ہوں اور وہ یہ کہ زندگی جب صرف خارجی معیارات کو اپنائے گی تو وہ صحیح تخلیقی صلاحیتوں کی اہل نہیں ہوگی اور اب مجھے اجازت دیجئے کہ میں اقبال کا یہ شعر پھر دہراؤں کہ؎

وہ علمِ کم بصری جس میں ہمکنار نہیں　　تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم

اور یہیں اکبر کی زبان سے مشرقی و مغربی معیارات کی بات بھی سنتے چلئے کہ ایک جگہ اہمیت ذوقِ روحانی کی ہے۔ تو دوسری جگہ جسمانی میلان کی۔

مشرق کو ہے ذوقِ روحانی　　مغرب میں ہے میل جسمانی

کہا منصور نے خدا ہوں میں　　ڈارون بولے بوزنا ہوں میں

اور پھر اکبر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مغربی معیارات کے ہماری تہذیب میں در آنے سے کیا نتائج برآمد ہوئے اور کس طرح ہماری تخلیقی زندگی بانجھ ہو کر رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ میں یہاں مغربی فلسفۂ زندگی کی بات کر رہا ہوں علوم کی نہیں۔

دکھائی فلسفۂ مغربی نے وہ مردی　　کہ پردہ کھل گیا اس قوم میں زنانوں کا

پری کی زلف میں الجھا نہ ریشِ واعظ میں　　دلِ غریب ہوا لقمہ امتحانوں کا
وہ حافظہ جو مناسب تھا ایشیا کے لئے　　خزانہ بن گیا یورپ کی داستانوں کا

علوم تو ہمیں یقیناً ملے لیکن دل کی روشنی ؛

روشنی سر میں "گدازِ غمِ دلِ مایوس میں　　شمع ساں ہم جل رہے ہیں مغربی فانوس میں
تہذیب مغربی کی ہے یہ دانشِ غضب　　ہم کیا جنابِ شیخ بھی چکنے گھڑے ہوئے
تھے کیک کی فکر میں سو روٹی بھی گئی　　چاہی تھی شے بڑی سو چھوٹی بھی گئی
واعظ کی نصیحتیں نہ مانیں آخر　　پتلون کی تاک میں لنگوٹی بھی گئی

اور پھر لنگوٹی کھو کر پتلون لائے تو وہ بھی صحیح جامہ زیبی اور روایت تہذیب کا حصہ نہ بن سکا اور پھر زبان یعنی روحانی واردات کے اظہار کا ذریعہ بھی متاثر ہونے لگی ؎

تجھے انگلش سے جب موقع نہیں ہے گرم جوشی کا　　تو پھر کیا لطف ہے اے ہمنفس اس بادہ نوشی کا
تکلف سے جواب اس نے دیا سن کر کہ اے اکبر　　ادا کرتا ہوں میں یہ حق فقط پتلون پوشی کا!

اور اس طرح ہماری عظمت جہانبانی کا بھی خاتمہ ہوا اور قلب نورانی کا بھی اور ایک ایسی نسل پیدا ہونے لگی جس میں ان دونوں باتوں میں سے کوئی ایک بھی نہ تھی۔ لے دے کے جو آیا وہ ہوس دنیا۔ ڈپٹی کلکٹری۔ نوکری اور پنشن۔ ؎

انگریز میں عظمتِ جہانبانی ہے　　ہم میں ایک شانِ علمِ روحانی ہے
لیکن تم لوگ تو کسی میں بھی نہیں　　بازو نہ قوی نہ قلب نورانی ہے
پہن لے سایہ مری جان اتار کر پشواز　　زمانہ باتو نہ سازد تو باز مانہ بساز
دنیا آخر تم سے لپٹی　　ہو ہی گئے تم غرضکہ ڈپٹی
ہم کو ابرو کی کجی نے مارا　　شیخ صاحب کو جی نے مارا
خانۂ دیں ہوا القصہ تباہ　　آئی آواز کہ انا للہ

کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

اور وہ معیارات جو ہماری روح اور دل سے پیدا ہوئے تھے اور پھر ہمارے روح اور دل کو منور رکھتے تھے ختم ہونے لگے اور پھر ہماری نظریں لندن پر لگی رہنے لگیں کہ وہ ہماری تہذیبی زندگی کا کعبہ بن گیا۔

دفترِ تدبیر تو کھولا گیا ہے ہند میں　　فیصلہ قسمت کا اے اکبر مگر لندن میں ہے
پہنچے ہوٹل میں تو پھر عید کی پروا نہ رہی　　کیک کو چکھ کے سوئیوں کا مزا بھول گئے
نقلِ مغرب کی ترنگ آئی تمہارے دل میں　　اور یہ نکتہ کہ مری اصل ہے کیا بھول گئے
مرزا غریب چپ ہیں ان کی کتاب ردی　　بدھو اکڑ رہے ہیں صاحب نے یہ کہا ہے

اکبر قوم کے مادی وسائل کی ترقی کے خلاف نہ تھے۔ وہ ہنرمندی اور دنیوی ترقی کے حق میں تھے اور صرف اتنا

چاہتے تھے کہ مسلمان تقلیدِ مغرب صرف ان کے ہنر میں کریں نہ کہ فلسفۂ زندگی اور معیارات و اقدار میں۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ جو قومیں اپنے ماضی اور اپنی تاریخ کو بھول جاتی ہیں ایک بار اپنے مرکز سے ہٹ کر کہیں کی نہیں رہتیں۔

عزم کر تقلیدِ مغرب کا ہنر کے زور سے ۔۔۔ لطف کیا ہے لد لئے موٹر پہ زر کے زور سے
غیر ملکوں میں ہنر کو سیکھ تکلیفیں اُٹھا ۔۔۔ روک سکتے ہیں وہ اگر اپنے اثر کے زور سے
قوم کی تاریخ سے جو بے خبر ہو جائے گا ۔۔۔ رفتہ رفتہ آدمیت کھو کے خر ہو جائے گا

کون کہتا ہے کہ تو علم نہ پڑھ عقل نہ سیکھ ۔۔۔ کون کہتا ہے نہ کر حسرتِ لندن پیدا
کون کہتا ہے تکلف سے نہ کر زیست بسر ۔۔۔ کون کہتا ہے نہ کر وضع میں جوبن پیدا
بس یہ کہتا ہوں کہ ملت کے معانی کو نہ بھول ۔۔۔ راہِ قومی کا تو خود ہی نہ ہو رہزن پیدا
قوم قوم آٹھ پہر سنتے ہیں ہم قوم کہاں ۔۔۔ تار باقی نہیں تو کرتا ہے دامن پیدا
مذہبی شاخ فقط ہے تری قومی ہستی ۔۔۔ یہ جو ٹوٹی تو نہیں کوئی نشیمن پیدا
بزمِ تہذیب سے ہو جائیں گے قطعاً خارج ۔۔۔ حس ہی باقی نہ رہے گا کہ ہو شیون پیدا

درخت جڑ پہ ہو قائم تو استوار بھی ہے ۔۔۔ کبھی خزاں ہے اور اس پر کبھی بہار بھی ہے
خلاف اس کے کرے گی خرد جو بے صبری ۔۔۔ نہیں اُٹھانے کا نیچر حکومتِ جبری
جو کوئی چاہے کہ قائم کرے نئی بنیاد ۔۔۔ تو برگ و باد نہ دارد درخت بھی برباد

اور اب میں اکبر کے تہذیبی مفروضوں کی روشنی میں چند باتیں اور کہنا چاہتا ہوں۔ پہلے میں اپنی بات پاکستان کے قیام سے شروع کرتا ہوں۔ اکبر جن بنیادوں کی بات کرتے تھے انھیں بنیادوں پر پاکستان وجود میں آیا یعنی یہ کہ برصغیر میں ہماری تہذیبی زندگی کی سالمیت نے ایک جسم اختیار کیا۔ ایک سیاسی سالمیت و اکائی پیدا ہوئی اور اس کا نام ہم نے پاکستان رکھا اور دو جملوں میں ساری بات یوں ہے کہ ہندی مسلمانوں کی تہذیبی زندگی دو اصولوں کے اشتراک سے پیدا ہوئی ہے۔ اس میں پہلا اصول مذہب اور فلسفۂ حیات جس میں روح و دل کے حوالے سے زندگی کا اظہار ہوتا ہے اور وہ اقدار و معیارات اور آدرش جو مذہب اور فلسفۂ زندگی سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان اصولوں کو میں نے پدری اور تنظیمی اصول زندگی کا نام دیا ہے۔ دوسرا اصول برصغیر کے جغرافیائی حالات، یہاں کی سرزمین اور اس سرزمین سے پیدا شدہ رسوم و رواج جو مسلمانوں کی آمد سے پہلے تھے اور اس کے علاوہ روحانی واردات اور قلبی تجلیات جو تخلیقی و مادری اصول زندگی کے مترادف ہیں۔ اس طرح ہم زمین کے رشتے سے تو برصغیر میں بسنے والی دیگر اقوام کے ساتھ منسلک ہوتے ہیں لیکن آسمان اور تنظیمی و پدری اصول کے رشتے سے کعبہ کی طرف نظر رکھتے ہیں اور دیگر ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں سے رابطہ رکھتے ہیں۔ یہاں جملہ معترضہ کے طور پر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ اسلامی طرزِ زندگی و تہذیب پر آسمان حاوی ہے۔ نزولِ کتاب، نزولِ پیغمبر، وحی اور معراج یہ تمام باتیں۔ آسمان و زمین کے اس رشتے کی طرف اشارہ کرتی ہیں جنھیں میں تخلیقی زندگی کا ضامن سمجھتا ہوں۔ یعنی آسمان ہمارا رہنما اور ہماری تنظیمی زندگی کا ضامن ہے۔ اور زمین ہماری تخلیقی زندگی کی۔ زمین و آسمان کا رشتہ عیسائیوں اور ہندوؤں کی تہذیبی زندگی میں بھی

ملتا ہے۔ فرق محض بنیادی اہمیت کا ہے اور یہی فرق اہم ہے۔ ہماری تہذیب آسمان سے اترتی ہے اور زمین سے رابطہ پیدا کرتی ہے۔ ہندوؤں کی تہذیب زمین سے پھوٹتی ہے اور آسمان کی طرف جاتی ہے۔ عیسائیوں میں دونوں رشتے اہم ہیں اس لئے ان کا عقیدہ ہے کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے۔

اب آپ اس بات کو برصغیر کے مسلمانوں کی زبان اقدار اور تہذیب پر منطبق کریں تو پتہ چلے گا کہ ان تمام چیزوں میں یہی دو اصول کار فرما رہے ہیں۔ مثلاً وہ زبان ہماری تہذیبی زندگی کی سب سے زیادہ عکاس ہے جو ایک طرف ہماری آسمانی زبان عربی اور اقدار و معیارات کی زبان فارسی اور دوسری طرف مقامی بولیوں سے مل کر بنی ہے۔ وہ اقدار ہماری زندگی کی رہنما اقدار ہیں جن میں ایک غیر تغیر پذیر حقیقت اولیٰ کا تصور، مظاہر کی شکل میں رونما ہوتا ہے اور وہ تہذیب ہماری تہذیب ہے۔ جس میں ہمارے معیارات و اقدار ہماری روحانی و قلبی زندگی سے ہمکنار ہو کر خارجی دنیا میں نئے نئے پیکر اختیار کرتے ہیں۔

مگر ہمارے بہت سے کرم فرما جو یورپ میں پیدا شدہ تحریکوں کو اپنے اوپر حادی کر لیتے ہیں ہماری اقدار، زبان، تہذیب سب چیزوں کو یورپ کے معیارات سے ناپتے ہیں۔ وہ امریکہ سے آئی ہوئی زین بدھ ازم کے متعلق کتاب پڑھ کر مہاتما بدھ کو مسلمانوں کے پیغمبر سے بڑا انسان بتاتے ہیں۔ اپنی پیاسی روحوں کو سیراب کرنے کے لئے موہن جوڈارو اور ہڑپا کے کھنڈرات میں کنوئیں کی تلاش کرتے ہیں اور عجائب گھر میں رکھے ہوئے چند ٹوٹے پھوٹے بتوں کو ہماری تہذیب کی علامت بتاتے ہیں۔ کبھی سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی تہذیب کا نعرہ لگاتے ہیں اور کبھی بقول خود لندن جاکر وہاں لائبریریوں میں پاکستان کی تہذیب کے لئے غیر مذہبی اساس کی تلاش کرتے ہیں۔ وہ ایک طرف تو علاقائی تہذیب کی بات کرتے ہیں اور دوسری طرف بین الاقوامی تہذیب کا۔ پاکستان کی سالمیت اور وحدت کو چاہے سیاسی طور پر تسلیم کریں۔ مگر پاکستان کی روح یعنی اس کی تہذیب کے بارے میں کوئی نظریہ نہیں رکھتے اور ہندوستانی و پاکستانی تہذیب کو ایک ہی قرار دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی ملک کی سیاسی سالمیت محض جسم ہے اور تہذیب اس کی روح۔

ان کی اپنی بھٹکتی ہوئی روح پاکستان کی روح کو نہیں پہچانتی اور اب ایسے لوگوں کے لئے میرے ذہن میں اکبر الہ آبادی کا محض ایک مصرع آرہا ہے جسے میں آپ کو سنا کر اپنا مضمون ختم کرتا ہوں کہ ان کے لئے :۔

آئیں گے غسّال کابل سے کفن جاپان سے

کیا اکبر الہ آبادی ضروری ہے؟

(پروفیسر سلیم اختر)

"نگار پاکستان" کی اکبر الہ آبادی پر اس خصوصی اشاعت سے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ کیا اکبر واقعی اتنا اہم شاعر ہے کہ تقریباً نصف صدی (تاریخ وفات، ۹ ستمبر ۱۹۲۱ء) بیت جانے کے بعد بھی "آج" اس پر خاص نمبر کی ضرورت ہے؟ اس سے اساسی نوعیت کا یہ سوال بھی جنم لیتا ہے کہ کیا خود اکبر الہ آبادی بھی ضروری "ہے"؟ (اس "ہے" پر اعتراض کی صورت میں اسے "تھا" سے تبدیل بھی کیا جا سکتا ہے)

اکبر الہ آبادی کو اپنے عصری رجحانات کے خلاف ردِ عمل قرار دے کر ۱۸۵۷ء اور خصوصیت سے سرسید تحریک کے تناظر میں اس کی اہمیت متعین کی جاتی ہے لیکن جب تک خود عصری رجحانات کی چھان پھٹک نہ کی جائے اس وقت تک ان کے خلاف ردِ عمل کی نوعیت اور پھر اس ردِ عمل کی علامت یعنی اکبر کی قدر و قیمت کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی، شکست اور پھر اس کے نتیجہ میں جنم لینے والا ہنگامۂ دار و گیر ایک ایسا انقلاب تھا جس نے ہند کی تاریخ کو واضح طور سے دو ادوار میں تقسیم کر دیا۔ مسلم سلطنت، مشرقی تمدن اور اسلامی ثقافت کا خاتمہ اور برطانوی حکومت اور مغربی اثرات کا آغاز ہوتا ہے۔ بحیثیت ایک قوم مسلمانوں کے لئے تاریخ کی یہ کروٹ ایک دھچکہ (TRAV MA) کی صورت اختیار کر گئی۔ یوں شکست اور اس سے جنم لینے والا احساس شکست قومی سطح پر شکست خوردہ ذہنیت کی جنم دہی کا باعث بنا۔ ادھر انگریزی اقتدار کے بعد ملک میں وہ سکون اور اذہان پر وہ جمود طاری تھا جو ہر بڑے طوفان کا نتیجہ ہوتا ہے۔ بالخصوص مسلمان تو زندگی کی رمق سے بھی محروم ہو چکے تھے۔

انگریزوں کو سب سے زیادہ خطرہ بھی مسلمانوں سے تھا۔ کیونکہ انھوں نے سلطنت (گو وہ برائے نام ہی سہی) گنوائی تھی اس لئے انگریز مسلمانوں کو شک و شبہ کی نگاہ ہی سے دیکھتے بلکہ معاندانہ رویہ چھپانے کی کوشش بھی نہ کی۔

اِن حالات میں جب سرسید نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو انھیں دو محاذوں پہ جنگ آزما ہونا پڑا ایک طرف تو خود حکومت ہی تھی جو ابھی تک مسلمانوں سے متنفر تھی اور دوسری طرف ابنائے وطن تھے عقلیت کی روشنی سے محروم اور ماضی کی دھول میں اَٹے ہوئے، مذہب جن کی سب سے بڑی پناہ گاہ اور تقلید سب سے بڑا جواز تھی۔ سرسید نے ایک طرف تو "اسباب بغاوت ہند" اور "وفاداران مسلمانان ہند" ایسی کتابیں لکھ کر مسلمانوں کے بارے میں حکومت کی بدظنی، خدشات اور عمومی نفرت ختم کرنے کی کوشش کے ساتھ خود مسلمانوں کو عقلیت سے روشناس کرانے اور جدید علوم (بالخصوص سائنس) سے ذہنی کشادگی پیدا کرنے کی تلقین کرتے ہوئے مذہب، ادب، معاشرت، تعلیم غرضکہ ہم عصر زندگی میں افکارِ نو سے قوم میں حیاتِ نو کی سعی کی۔

۱۸۵۷ء کی شکست نے یہ احساس دلا دیا تھا کہ اب انگریزوں کو یہاں سے نکالنا مشکل ہے۔ اس لئے انھوں نے "حقارت" کی بجائے "مفاہمت" کا درس دیا۔ آج انھیں اسی بنا پر مطعون کیا جاتا ہے کہ کسی تحریکِ آزادی کا آغاز کرنے کی بجائے انگریزی زبان کی تحصیل اور انگریزی ملازمتوں کے حصول پہ زور دے کر محض سرکاری مشینری کے لئے پرزے مہیا کرتے رہے سرسید کی مخالفت بھی بے حد ہوئی بلکہ اتنی شدید کہ انھیں اپنے وقت ہی کی نہیں بلکہ اس صدی کی سب سے زیادہ نزاعی شخصیت بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ کافر، بے دین، انگریز پرست، جاہ پسند (اکبر نے بھی سرسید کے لئے پیرِ نیچر، جنّات کول کا بڑھا۔ تہذیبِ نو کا چند اماموں اور نیچری خلیفہ، ایسے خطابات تجویز کر رکھے تھے) وغیرہ کیا کچھ نہ کہا گیا۔ بلکہ اب تک کہا جارہا ہے۔

مختصر ترین الفاظ میں یہ ہے کہ وہ پس منظر جس میں اکبر کا مطالعہ کرنا ہے اور یہ ہیں وہ عصری رجحانات جن کے خلاف وہ ردِ عمل بنا۔ شاعری کا مجموعی لحاظ سے جائزہ لیا جائے تو اکبر کو ۱۸۵۷ء کے بعد کی شکست خوردہ ذہنیت کی علامت سمجھا جاسکتا ہے۔ وہ ذہنیت جسے ماضی سے لگاؤ تھا اور جو ہر قیمت پر تمدنی اقدار کے تحفظ کی خواہاں! یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں مغرب کے توسط سے آنے والے جدید اثرات کو شک و شبہ ہی سے نہیں بلکہ خوف کی نگاہ سے بھی دیکھا جاتا ہے۔ یہ اندازِ نظر انگریزوں سے ہزیمت کے اس خوف کا پیدا کردہ تھا جس کے باعث مسلم قوم اس وقت دروں بینی کی شکار ہوکر قدیم اقدار کی بقا اور ان کے حوالے سے ماضی کے خول میں مقید رہنے ہی میں عافیت جانتی تھی۔ اس وقت عملی لحاظ سے اور تو کچھ نہ ہوسکتا تھا۔ اس لئے اس نئی نسل کو نشانۂ تنقید بلکہ ہدفِ ملامت بنایا جارہا تھا جو سرسید کے زیرِ اثر انگریزی تعلیم اور انگریزی ملازمت کے ذریعہ مغربی اثرات کے انجذاب سے ایک طرح سے "ابن الوقت" کا روپ دھار رہی تھی۔ اکبر کی سوچ سطحی تھی اور ملکی و ملّی مسائل پر گہری نگاہ نہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک خاص طرح کی جذباتیت بھی تھی اس لئے مغرب کی تنقیص اور سرسید کی مخالفت میں ان کا انداز "اودھ پنچ" کے دیگر قلم کاروں سے خیالات کے لحاظ سے منفرد نہ ہوسکا۔

اکبر ان شاعروں میں سے نہیں جن کے ہاں آفاقیت ملتی ہے وہ خالص مسلمان آدمی اور دنیادار قسم کے انسان تھے۔ اپنے محدود جغرافیائی حلقہ اور قومیت سے بلند ہوکر اشیاء اور وقوعات کو ان کے اعلیٰ تناظر میں دیکھنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ اعلیٰ تخلیقی شعور کے باوجود بھی وہ اس ژرف نگاہی سے محروم رہا جو حال اور مستقبل کو ملانے والے غیر مرئی روابط کو محسوس ہی نہیں کرسکتی بلکہ ان کے تجزیے سے اپنے افکار کو مستقبل کے لئے اشاریہ بھی بنا سکتی ہے۔ اسی لئے تو اس نے حال میں تغیرات کی وقوع پذیری کو مستقبل کے اندازِ نو کے لئے اشاریہ نہ جانا اور اسی لئے دو تمدنوں کے ٹکراؤ سے جنم لینے والی کشمکش کو عالمگیر سطح پر محسوس نہ کرسکا اور نہ ہی اسے کسی عظیم تخلیق کے لئے موضوع بنا سکا۔

اکبر کے لئے مذہب کسی مثبت قوت یا عمل کی ترغیب کا منبع نہیں بلکہ وہ محض چند رسوم اور قواعد کا نام ہے اگر ان "مذہبی" شعائر کی پابندی ہوتی رہے تو وہ مطمئن ہے۔ وہ ماضی کے مآثر کی شکست اور اقدار کی ریخت کا ماتم تو کرتا ہے لیکن ان کے غیر جذباتی تجزیہ سے قاصر ہے اس کی دانست میں ماضی کی کیونکہ ہر چیز اچھی تھی اور مشرقی روحانیت (تصوّف) روشنی کا مینار، اس لئے بدلتے حالات میں بھی ان ہی کی تلاش ہے۔ اقبال چونکہ اکبر سے زیادہ گہری نگاہ اور بہتر تاریخی شعور رکھنے کے ساتھ ساتھ مذہب کی فلسفیانہ اہمیت اور مرئی قوت کو بھی سمجھتا تھا اس لئے وہ "رسم اذاں" اور "روحِ بلالی" میں امتیاز کرسکا۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس وقت اقبال نے "اسرارِ خودی" میں حافظ اور مردہ دلی کے موجب تصوف کی مذمت کی تو

اس کی مخالفت میں جو طوفان اٹھا اکبر بھی اس میں پیش پیش تھے۔ چنانچہ مولوی قمر الدین احمد بدایونی نے اپنی کتاب "ذکر اکبر" ص) میں اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھا۔ اکبر نے " فرمایا ڈاکٹر اقبال نے تصوف اور حضرت حافظ شیرازی پر جو اعتراضات کئے ہیں ان سے مجھے رنج ہوا اور یہ شعر نکل گئے"۔

مولوی ہو ہی چکے تھے نذرِ کالج اس سے قبل
خانقاہیں رہ گئی تھیں اب ہے ان کا انہدام
لکچر و مضمون لکھتے ہیں تصوف کے خلاف
الوداع اے ذوقِ باطن الوداع اے فیضِ عام

اقبال کی یہ تحقیق کہ حافظ کی شرابِ عرفاں حقیقت میں انگور اور میوے کی شراب تھی بذاتِ خود کسی معجونِ فلک سیر[1] کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔

بنیاد ڈالتے ہیں وہ حکمت کے باغ میں
وسکی سے ہو رہی ہے صفائی دماغ کی"

ہماری تنقید میں ایک بڑی غلط اور گمراہ کن کی اصطلاح "خلوص" کی ہے۔ ادیب کا خلوص ایک ایسی سونٹھ کی گانٹھ بن چکا ہے جس سے ہر طرح کی کوتاہیوں اور فکری دیوالیہ پن پر پردہ ڈالا جاتا ہے۔ جس کا نتیجہ اور کچھ نکلے یا نہ نکلے اتنا یقیناً ہوتا ہے کہ بعض اوقات خود نقاد کا اپنی تنقید سے عدم خلوص آشکار ہو جاتا ہے۔ مطالعۂ اکبر میں بھی نقادوں کی اکثریت نے اکبر کے "خلوص" پر بہت زیادہ بلکہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی زور دے کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ سر سید تحریک کی مخالفت بر بنائے خلوص تھی۔ اب اگر خلوص کا تجزیہ کریں تو اس کے بھی دو پہلو نکلیں گے۔ خلوص اپنے خیالات اور نظریات کے پرچار میں اور خلوص دوسروں کی مخالفت میں (ویسے اس مخالفت کی اساس بھی ایک لحاظ سے اپنے ہی خیالات پر استوار ہوتی ہے) گویا سر سید کے نظریات ان کے خلوص کے آئینہ دار ہیں اور اکبر کی مخالفت اس کے خلوص کی مظہر ہے۔ خلوص تنقید کی وہ دو دھاری تلوار بن جاتا ہے جس سے بیک وقت گردن زدنی کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ اور دفاع کا بھی، لیکن خالی خولی خلوص بے معنی، بے کار اور بعض اوقات تو گمراہ کن بھی ثابت ہو سکتا ہے کسی تحریک یا نظریہ کے اجراء کرنے والے اور پھر اس کی مخالفت کرنیوالے کے اثرات کو محض خلوص کے پیمانہ سے نہیں ناپا جا سکتا بلکہ اس مقصد کے لئے تاریخی، ملی، معاشرتی شعور کے ساتھ ساتھ حال کے بے لاگ تجزیہ اور مستقبل کے تقاضوں کا اعلیٰ ادراک بھی ضروری ہے اس سے وہ بصیرت جنم لیتی ہے جو دوسروں کیلئے بصیرت افروز بھی ہوتی ہے اور بصیرت افزا بھی!

اکبر کے خیالات کا ژرف نگاہی سے جائزہ لیں تو مغرب کی مخالفت میں سستی جذباتیت اور سطحیت ملتی ہے۔ اس لئے اقبال کی طرح وہ مغربی تہذیب کے اندرونی انتشار اور ظاہری چمک میں پوشیدہ داخلی تضادات کا تجزیہ کرنے میں ناکام رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو اقبال کی طرح فلسفہ کا گہرا شعور تھا اور نہ ہی تحلیلی نگاہ۔ اقبال نے ایک فلسفیانہ نظام افکار مرتب کرنے کی کوشش کی اور پھر اس کی روشنی میں مغرب اور مغربی زندگی کا تجزیہ کیا لیکن اکبر میں ایسی کوئی خوبی نہ تھی، پھر اقبال کی طرح یورپ نہ دیکھا۔ اس لئے اکبر کو FIRST HAND معلومات نہ تھیں۔ اقبال کی طرح اکبر کو بھی مذہب

---

[1] "معجونِ فلک سیر" اسکے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ (س . .)

سے بہت لگاؤ تھا لیکن یہ لگاؤ ایک عام مسلمان کا جذباتی لگاؤ تھا جس کے لئے مذہب چند رسوم و قواعد اور تقلید سلف کے مترادف ہے ۔ جو مذہب کے لئے جذباتی نعرے تو لگا سکتا ہے ۔ لیکن اس کی تعلیمات کے سانچے میں اپنے جذبات نہیں ڈھال سکتا ۔ الغرض اکبر کا مذہبی شعور محدود ، فکری سرمایہ ناکافی ، تاریخی آگاہی خام اور سیاسی بصیرت برائے نام تھی ۔ اور ان اوصاف کے ساتھ ناصح بننے کی کوشش کی !

چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو جائے گا ۔

شیخ جی کونسل کے ووٹر ہو گئے
لیجئے چھکڑے سے موٹر ہو گئے

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب
بیگم کا مگر عطرِ حنا اور ہی کچھ ہے

اولڈ مرزا ہر طرف بدنام ہیں
ینگ بدھو وارثِ اسلام ہیں

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا
لو کا جو میں نے پوچھا بس بس خموش رہنا
حسن و جنوں بدستور اپنی جگہ ہیں لیکن
ہے لطفِ بحرِ ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے
بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن یہ تجھ سے پوچھتا ہوں اے ہندی
یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

بہت شوق انگریز بننے کا ہے
تو چہرے پہ اپنے گلٹ کیجئے

کیونکر کہیں کہ طرزِ عمل ان کا نیک ہے
جب عید میں بجائے سوئیوں کے کیک ہے

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے ہسپتال جا کر

نہ نماز ہے نہ روزہ ، نہ زکوٰۃ ہے نہ حج ہے
تو پھر اس کی کیا خوشی ہے کوئی جنٹ کوئی جج ہے

مرا منہ تو زیادہ مشرقی ہے شیخ صاحب تیرے
کہ وہ موٹر پہ چڑھتے ہیں یہ موٹر سے بگڑتا ہے

ہم ایسی سب کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
جنھیں پڑھ پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

گزران کا ہو کیونکر حلقۂ اللہ اکبر میں
پلے صاحب کے بنگلے پر مرے صاحب کے دفتر میں

بعض ادیب ایسے ہوتے ہیں جن کے آئینہ میں تمام دنیا کا عکس نظر آجاتا ہے اور جن کی تخلیقات زمانہ کی قیود کو توڑ کر زمان و مکان سے ماورا ہو جاتی ہیں مگر ایسے ادیب چند ہوتے ہیں اور ان کے نام انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ۔ اکبر کا کلام اتنا ہمہ گیر نہیں کہ وہ دنیا بھر کو محیط کر سکے ۔ ان کے یہاں مقامی رنگ ملتا ہے ۔ جو ان کے ماحول ، معاشرے اور تہذیب سے مستعار لیا گیا

ہے۔ ان کا خطاب خصوصیت سے کیونکہ صرف مسلمانوں بلکہ مسلمانوں میں بھی صرف "مغرب زدہ" مسلمانوں سے ہے اس لئے موضوعات کا دائرہ بے حد محدود ہو کر ان کی نگاہ کے زاویوں میں وسعت نہیں آنے دیتا۔ یوں طنز کی تیزی اور زبان کی کاٹ کے باوجود تنوع کم اور تکرار د تواتر زیادہ ہے جس میں مخصوص زاویۂ نگاہ کی بنا پر بعض اوقات یکسانیت قاری میں اکتاہٹ بھی پیدا کر دیتی ہے (خیالات کیونکہ مخصوص اور محدود ہیں اس لئے نئے پن۔ کے لئے وہ انگریزی الفاظ بے ڈھب قوافی، فارسی اشعار پر تضمین اور نئے الفاظ و تراکیب کے اختراع پر خصوصی توجہ ہی نہیں دیتے بلکہ یہ اسلوب کے اہم عناصر بھی قرار پاتے ہیں) صرف تعلیم کے موضوع پر کچھ اشعار سے ہی اس کا اندازہ ہو جاتا ہے :

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی　　اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی
تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر　　خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں
تعلیم کی خرابی سے ہو گئی بالآخر　　شوہر پرست بی بی پبلک پسند لیڈی
ان سے بی بی نے فقط اسکول ہی کی بات کی　　یہ نہ بتلایا کہاں رکھی ہے روٹی رات کی
کمرے میں جو ہنستی ہوئی آئی مس رعنا　　ٹیچر نے کہا علم کی آفت ہے تو یہ ہے
اپنی اسکولی بہو پر ناز ہے ان کو بہت　　ہال میں ناچے کسی دن ان کی پوتی تو سہی
اپنی دھن میں آبرو کی کچھ نہیں پروا انہیں　　نذرِ معجونِ ترقی ہو یہ موتی تو سہی

اکبر کے کلام سے اس امر کا اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ اس نے عصری زندگی کے صرف ان پہلوؤں کو لیا جن کا باآسانی مذاق اڑایا جا سکتا تھا۔ اقبال نے بھی ابتداء میں یہی کیا تھا چنانچہ "بانگِ درا" کے آخر میں درج شدہ ظریفانہ اشعار پر اکبر کا اثر واضح ہے (یہی نہیں بلکہ اقبال نے اکبر کے نام اپنے خطوط میں عقیدت کا اظہار اور تتبع کا اعتراف بھی کیا ہے[1]) لیکن اقبال کی فلسفہ دانی اور مذہب سے گہری واقفیت نے اسے بچا لیا۔ فلسفہ سے اس نے مغرب کے تضادات اور عقل کی نارسائی کو سمجھا اور خودی اور عشق پر استوار مردِ مومن کا تصور ہی نہ پیش کیا، بلکہ قومی بقا کے لئے ایک لائحہ عمل بھی مرتب کیا لیکن اس کے برعکس اکبر صرف یہی کہہ سکتا ہے۔

تائید وضعِ ملت و دیں کی کروں گا میں　　اہلِ زمانہ لاکھ ہنسیں مجھ غریب پر

اور یا پھر بانداز تعلّی :-

شعر اکبر کے تو سن لے ساحبِ عالی دماغ　　قدر کیا اے آسماں اس ابرِ گوہر بار کی

اکبر کی ذاتی زندگی اور شاعری میں جو بُعد ملتا ہے وہ خود اس کے عدم خلوص پر دلالت کرتا ہے۔ اکبر کی پیدائش ۱۸۴۶ء میں ضلع الٰہ آباد کے قصبہ "بارہ" میں ہوئی۔ گھر پر مشرقی اور روایتی انداز کی عام سی تعلیم حاصل کی تھی۔ اس لئے کافی دیر تک بیکار رہنا پڑا ۱۸۶۳ء میں دریائے جمنا پر پل بنانے والے ٹھیکیدار کے ہاں منشی ملازم ہو کر اینٹیں اٹھانے والے مزدوروں کو کوڑیوں کے حساب سے اجرت تقسیم کرنے پر آٹھ آنے روزپر ملازمت شروع کی۔ دو سال بعد ریلوے میں کلرکی شروع کی، اسی دوران اپنے طور سے انگریزی زبان اور قانون کا مطالعہ شروع کیا اور ۱۸۶۷ء میں وکالت (درجہ سوم) کا امتحان پاس

---

[1] ملاحظہ ہو:- اقبال نامہ (جلد دوم) (ص ۴۴ اور ۴۱)

کرکے پریکٹس شروع کردی دو سال بعد نائب تحصیلدار، بعد ازاں داروغہ آبکاری اور پھر ہائی کورٹ میں (مثل خوانی) پر مامور ہوئے۔ اس دوران میں بھی قانون کا مزید مطالعہ جاری رکھا۔ چنانچہ ۱۸۷۳ء میں ہائی کورٹ میں وکالت کا امتحان پاس کرکے اونچے درجے کے وکیل کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ کچھ مدت بعد منصف بناکر ہاتھرس بھیجے گئے۔ اس کے بعد سب جج بنے اور بالآخر جج بنے۔ ۱۹۰۵ء میں پنشن اور دو سال بعد خان بہادر کا خطاب پایا۔

زندگی کے اس مجمل خاکہ سے۔ جہاں اکبر کی محنت، لگن اور قابلیت عیاں ہوتی ہے، وہاں یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ وہ خود ساختہ تھے۔ آٹھ آنے روز کی منشی گیری سے ایک جج کے اعلیٰ عہدے تک پہنچنے میں انھوں نے کتنے پُرپیچ مراحل طے کئے، وہ خود تو اس ضمن میں بس یہی کہہ پائے:

مجھے تو اپنی ترقی میں غور کچھ بھی نہیں
خدا کے نام کی برکت ہے اور کچھ بھی نہیں

عام زندگی اور ملازمت کے دوران۔ اکبر نے انگریز سرکار سے کبھی کسی قسم کی مفاہمت کی[۱] یا نہیں اس سلسلہ میں تو وثوق سے اب کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن شاعری کے آئینہ میں اکبر کی جو تصویر نظر آتی ہے وہ یقیناً ایک مفاہمت پسند کی تصویر معلوم ہوتی ہے:-

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا!
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

اشعار کے علاوہ انھوں نے نجی گفتگو میں بھی حکومت سے خوفزدہ ہونے کا اعتراف کیا۔ چنانچہ "ذکر اکبر" میں اس نوع کی خاصی دلچسپ تفصیلات مل جاتی ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر اکبر نے یہ کہا "آپ کو مسٹن گردی کا حال نہیں معلوم ہے جس سے میں بمشکل نکلا ہوں، دیکھو اس شعر میں میں نے مسٹن صاحب کی سختیوں کی شکایت کی ہے:

ہے منع ملاقات میری ہم نفسوں سے　　فریاد کا موقع نہیں فریاد رسوں سے

مگر خیر میں نے بھی اپنے ستائے جانے کا مسٹن صاحب سے یہ کہہ کر رنج کم کرلیا۔

خانۂ دل کو مرے توڑا تو کیا ایسی نمود　　چشم بد دور آپ تو ہیں مسجدیں ڈھائے ہوئے

اشارہ کانپور کی مسجد کی طرف ہے غرض کہ:-

رکھتی ہے پھونک پھونک کے باتیں مری قدم　　تیغ زباں نہیں ہے عصائے زباں ہے اب

کون پھر سوال وجواب کی مصیبت میں پڑے۔ ان اشعار کو شائع کرنے میں ابھی عجلت نہیں کرنی چاہیئے"[۲] نے مزید — "کیا بتاؤں مسٹن صاحب کے زمانے کی پریشانیوں سے ڈرا ہوا ہوں ورنہ جو کچھ کہتا تھا خوب جی کھول کر کہتا مگر خیر۔

میرے سکوت سے مجھے بے لب نہ جانیئے　　لفظوں ہی کی کمی ہے خیالات کی نہیں[۳]

۱۔ ویسے اکبر کے بقول :- لطف چاہو اک بت نوخیز کو راضی کرو + نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو
۲۔ ذکر اکبر" ص ۱۲۱　　۳۔ ذکر اکبر ص ۱۵۳

مندرجہ ذیل اقتباسات بھی ان ہی کی گفتگو سے ہیں :-

" لوگ کہتے ہیں کہ میں حکومت کے لالچ یا خوف سے خاموش ہو گیا ہوں اور ملک کو آزادی دلانے میں حصہ نہیں لیتا۔ جب میرا یقین ہے کہ حکومت سے کھل کر لڑنا مضر ہے تو بھلا میں کیا کہوں اور میرے کہنے سے ہو بھی کیا سکتا ہے۔ میں نے اسی خیال کو نظم کیا ہے :

دے خار بھی کوئی تو میں بیشک الجھ پڑوں　　　بگڑی ہوئی ہوا ہو تو موسم سے کیا لڑوں
ہم اس زمانے میں رہتے ہیں اپنے گھر میں پڑے　　　ہوا بھی بدلی ہوئی ہے فلک سے کون لڑے
ہے چرخ ہم سے برسرِ کیں غور کیا کریں　　　بیٹھے ہیں سر جھکائے ہوئے اور کیا کریں [1]

" لوگوں کا خیال ہے کہ میں اپنی پنشن کے خیال سے قومی کام میں سامنے نہیں آیا یہ غلط ہے۔ اگر آج میں رعیت کی خاطر قوم کا کام کروں اور پوری قوت اس طرف صرف کر دوں تو کیا مجھ کو پنشن سے زیادہ فائدہ نہ ہو۔ اصل یہ ہے کہ مجھے کانپور کے واقعہ [2] کے بعد کی کشمکش یاد ہے۔ میں دو باتوں سے گھبراتا ہوں ایک تو عشرت کے مصیبت میں پڑنے سے دوسرے اس خیال سے کہ میں اس پیرانہ سالی میں اپنے جسم میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ جیل کے مصائب اٹھا سکوں۔ کاش آج میری جوانی کا زمانہ ہوتا۔ اور مجھ میں جان ہوتی [3] "

سر سید کی تعلیمات سے سب سے زیادہ نئے ابھرتے ہوئے متوسط طبقہ نے فائدہ اٹھایا۔ ان کی جاگیریں نہ تھیں اور بزرگ نہ قتل ہوئے اس لئے انھوں نے آسانی سے انگریزی حکومت کو قبول کر کے خود کو حالات کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہی نہ کیا بلکہ انتہا پسندی میں بعض لوگ تو انگریزوں سے بھی بڑھ کر انگریز بن گئے۔ وہ متوسط طبقہ جو اب تک بے جڑ تھا اب اسے سرکاری ملازمت کی صورت میں جو تحفظ ملا وہی زندگی میں اس کی جڑ قرار پایا۔ اکثریت نے تو اپنی وضع، ملازمت اور وفاداری کے لئے جواز مہیا نہ کئے اور خود کو خاموشی سے حالات کے حوالہ کر دیا جبکہ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہ تھی جنھوں نے منافقت سے کام لیتے ہوئے متوسط طبقہ کی اس دوغلی ذہنیت کا ثبوت دیا جس کی بنا پر جو کرتے ہیں اسے برا بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے جواز بھی تلاش کرتے ہیں۔ اکبر اس گروہ کی نمائندگی کرتا ہے۔ زندگی میں اعلیٰ منصب اور تحفظ کے لئے اس نے بھی انگریزی زبان، وفاداری اور ملازمت کا راستہ اختیار کیا تمام عمر انگریزوں اور انگریزی اثرات کو برا سمجھا اور ان کے پرچارک سر سید کو کبھی بھی معاف نہ کیا لیکن جب خیالات اور نظریات کی بنا پر کسی طرح کی بھی عوامی جدوجہد میں

---

[1] ذکر اکبر ص ۱۴۷　　[2] مؤلف نے اس سلسلہ میں یہ حاشیہ تحریر کیا ہے :-

" کانپور کی مسجد کا مشہور واقعہ ہے کہ اس کے کچھ حصے کے شہید کئے جانے کے سلسلہ میں بڑا ہنگامہ ہوا تھا بہت مسلمان گولیوں سے مارے گئے تھے۔ خواجہ حسن نظامی صاحب عین ہنگامہ کے دن الہ آباد سے ہوتے ہوئے کانپور پہنچے حکومت کو شبہ ہوا کہ مسجد کے واسطے آمادۂ فساد لوگوں میں اکبر بھی شریک ہیں اس شبہ میں اکبر کے اس شعر نے اور تقویت دی ہے (غیر مطبوعہ)

سنا یورپ میں ہر قاصد پیامِ جنگ لایا ہے　　　بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

سمجھا یہ گیا کہ " خونِ شہیداں " سے کانپور کے شہیدوں کی طرف اشارہ ہے اور اس پر شکر خدا اور اظہار مسرت کیا جا رہا ہے کہ حکومت برطانیہ یورپ میں جنگ کی پریشانیوں میں مبتلا ہو گئی۔ سر جیمس مسٹن صاحب گورنر تھے انھوں نے اکبر کو سخت پکڑا آخیر خدا خدا کر کے عافیت اور پنشن دونوں مصیبت سے بچیں، یہاں اس واقعہ اور کشمکش کی طرف اشارہ ہے۔　[3] ذکر اکبر ص ۱۴۲ — ۱۴۳

حصہ لینے یا سیاسی مسلک سے وابستگی کا موقع آتا ہے تو وہ جوازات کو پناہ گاہ بنالیتا ہے۔ اکبر کی زندگی اور اشعار کا تضاد PETIT BOURGEVUS کی ذہنیت کی زندہ تصویر ہے۔ اسی لئے تو انگریزوں کو برا سمجھنے والا ترکِ ملازمت کا حامی نہیں اور خوب گول مول الفاظ میں اصل مقصد کی پردہ پوشی کی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر کہا کہ " ترکِ ملازمت کے بارے میں میرا خیال ہے کہ یہ عام طور پر قابلِ عمل نہیں ہے اور جن سے ممکن ہو وہ کریں۔ ترک ملازمت میں زیادہ زور اس پہلو پر دیا جانا چاہئے کہ لوگ ان محکموں میں ملازمت نہ کریں جن سے ملک و ملت کو سب سے زیادہ نقصان پہنچ سکتا ہے " (ذکرِ اکبر۔ ص ۱۳۱) اس موقع پر ذہن فوراً پریم چند کی طرف جاتا ہے جس نے تمام عمر "مدخولۂ گورنمنٹ" بن کر رہنے کی بجائے ملازمت ہی چھوڑ دی۔ جبکہ اس کے برعکس اکبر کو تو "خان بہادر" کا خطاب چھوڑنا بھی گوارا نہ تھا۔ اکبر کے احباب میں سے کسی نے مشورہ دیا تھا کہ سید صاحب خان بہادری کا خطاب واپس کردیں۔ کہنے لگے یہ خطاب مجھ کو گورنمنٹ نے جوڈیشل سروس کے صلہ میں دیا ہے، اگر میں اس کو واپس کردوں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ میری ایماندارانہ خدماتِ عدالت کا جو اعتراف کیا گیا ہے۔ میں اس سے ناراض ہوں اس طرح دنیا کو یہ سمجھنے کا موقع دوں کہ میں نے عدالتی خدمات بے ایمانی اور ناانصافی سے انجام دی تھیں۔ تو کوئی صاحب اچھا مانیں یا برا میں خطاب واپس کرکے بے ایمان ہونے کو.......... تیار نہیں ہوں " (ذکرِ اکبر ص ۷ - ۱۳۶)

اس جواز میں جو منطقی تضاد ہے اس کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت نہیں کہ اسی صفحہ پر اصل حقیقت کا بھی اعتراف کرلیا گیا۔ لیکن اس طرح کہ اعتراف بھی عظمت خود بن گیا!

"اجی صاحب! بات یہ ہے کہ گورنمنٹ سے مقابلہ کی مجھ میں جان نہیں ہے۔ میں پنشن خوار ضرور ہوں مگر آلۂ کار سرکار نہیں ہوں۔"

اس ضمن میں صرف یہ ملحوظ رہے کہ بولنے کے موقع پر خاموشی یا تو منافقت کی ہوتی ہے اور یا پھر نیم رضامندی کی چنانچہ اس نیم رضامندی اور مفاہمت کا اندازہ اشعار میں خودساختہ زبان بندی سے بھی ہو جاتا ہے۔

زبان بند ہے اس عہد پر نگاہ کے بعد سکوت ہی مجھے رہنا ہے اب تو آہ کے بعد

زیادہ گوئی سے اب ہم اسی سے رکتے ہیں جو خوب کہتے ہیں اکبر وہ کہہ بھی چکتے ہیں

زمانہ جانبِ انصاف ڈھل ہی جائے گا زبان بند کرو حال کھل ہی جائے گا

کھولی نہیں زباں کبھی فریاد کے لئے آواز کیوں نشانہ ہو صیاد کے لئے

۱۹۲۰ء تک ہندوستان میں بہت کچھ ہو چکا تھا اور سیاسی تحریکیں قوت پکڑتی جارہی تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کے قدآور لیڈر سامنے آچکے تھے چنانچہ اس وقت کے دانشور اور قومی زندگی سے متعلق افراد انگریزوں کے بارے میں اپنے طرزِ عمل پر غور کر رہے تھے۔ لیکن اکبر کو اپنی آرام و آسائش کی زندگی اتنی عزیز تھی کہ وہ

---

۵۲ اس شعر کی اشاعت نہ کروائی تھی۔

صرف نل کے پانی ۔ ڈبل روٹی ۔ فیشن ، انجن ، کیک ، انگریزی تعلیم ، ہوٹل ، موٹر اور ایسی ہی دیگر چیزوں پر طنز کرکے اپنی دانست میں قومی خدمت کا حق ادا کر لیتے ہیں ۔ لیکن جب لب کشائی سے "حق و باطل" میں چناؤ کا موقع آئے تو انھیں عشرت بیٹے ، پنشن اور بڑھاپا یاد آتا ہے ۔ ادھر طنز میں بھی عام پسند ، چٹکلہ بازی پر زیادہ زور دیا اس لئے بالعموم اثر سطحی ثابت ہوتا ہے ۔ اس پر مستزاد یہ کہ مغرب کے جن پہلوؤں کو مرکز تنقید اور ہدفِ طنز بنایا آج وہ روز مرہ کا معمول بن کر جزوِ زندگی ہو چکے ہیں اس لئے آج مزاح سے لطف اندوزی کے باوجود بھی طنز کی کاٹ بے معنی اور بے مقصد ثابت ہوتی ہے ۔

اکبر کا مقابلہ اگر شاد عارفی سے کریں تو شاعری میں مفاہمت اور عدم مفاہمت کی دو نمایاں مثالیں نظر آتی ہیں شاد عارفی نے ایک NON ZONFORMIST کی زندگی بسر کی اور مفلسی اور فاقہ کشی کے باوجود بھی اپنی طبع ، خو اور مزاج نہ بدلا ۔ اکبر خاموشی میں پناہ لیتا ہے جبکہ شاد کا یہ انداز ہے ۔

ہم کسی خانہ بر انداز سے ڈرتے ہی نہیں — پئے تحسینِ وطن طنز ہمارا فن ہے

ہم کسی شخص کی تعریف تو کرتے ہی نہیں — ہم سے اس قسم کی امید نہ رکھے دنیا

وہی لکھتا ہے جو کچھ دیکھتا ہے — یہی ہے شاد میں سب سے بڑا عیب

ہاں ! ہم سے غلط بات پہ جی ہاں نہیں ہوتا — سچ اور کھری بات چھپائی نہیں جاتی

شعر سے بچ کے کوئی ظلم گزرنے نہ دیا — عظمتِ فن کی روایات کو مرنے نہ دیا

یہ درست ہے کہ شاد اور اکبر کے طنز کے نشانوں میں کافی بُعد ہے لیکن یہ تقابل دو شاعروں کا ہے ۔ ان کی شاعری کا نہیں ۔

سرسید تحریک عصری تقاضہ تھی ۔ سرسید نہ ہوتے کوئی اور ہوتا ۔ کیونکہ اس عہد میں بحیثیت قوم مسلمانوں کی بقا کا انحصار ہی ان امور پر تھا جن کی طرف سرسید نے توجہ دلائی تھی ۔ سرسید کا قصور یہ تھا کہ انھوں نے سب سے پہلے بدلے ہوئے حالات اور ان کے تقاضوں کا ادراک کیا ۔ مخالفت تو سب نے کی لیکن

ا۔ عشرت حسین اکبر کا بڑا بیٹا تھا اور باپ کے نظریات کے قطعی برعکس ۔ اسی لئے جب انگلینڈ اعلیٰ تعلیم کے لئے گیا تو کئی سال تک آنے کا نام نہ لیا ۔ چنانچہ اکبر نے بڑے دل دوز منظوم خط لکھے ۔ کبھی یہ طعنہ دیا ۔ "کھا کے لندن کی ہوا عہدِ وفا بھول گئے ۔ ۔ ۔ " تو کبھی اپنی اور بیوی کی حالت کا اندازہ کرانے کی کوشش کی ۔ ۔ ۔ "ماں خستہ حال ہوئے بے چارہ باپ مر لئے ۔"

انگریزی تعلیم اور ملازمت کے بغیر گزارہ بھی نہ تھا، اس لئے بالآخر سب کو اسی ڈگر پر چلنا پڑا۔ اکبر بھی اسی ڈگر پر چلا، اور جن باتوں کی مخالفت کی وہ سب کچھ عملی زندگی میں کیا، یہی نہیں موقع آنے پر قومی زندگی سے بھی کٹ جاتا یوں بے عملی کے ساتھ ساتھ دو عملی بھی ملتی ہے۔

آج زمانے نے جو رنگ اختیار کیا اور ہم عصر زندگی نے جو روپ دھارا ہے اس کے تناظر میں اگر اکبر کی شاعری کا مطالعہ کریں تو انجن، ڈبل روٹی اور نل کے پانی ایسے اشعار پڑھ کر طنز کے کھوکھلے پن پر ہنسی آتی ہے ——— اکبر سر سید تحریک کے خلاف ردعمل کی علامت تو ہے۔ لیکن زیادہ دور تک دیکھنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ اس لئے زندہ علامت نہ بن سکے۔ آج اکبر کے اشعار "الگار" کی تاریخی اہمیت تو ہو سکتی ہے مگر عصری نہیں! اس لئے اگر آغاز کے سوال کو دہرایا جائے کہ کیا واقعی اکبر الہ آبادی ضروری تھا تو اس کا جواب غیر مشروط "ہاں" میں نہ دیا جا سکے گا۔

اکبر الہ آبادی اور بنگال

(وفا راشدی)

بنگال اُردو مرکزوں سے دور رہا، یہاں کی سرزمین اُردو شعر و ادب کے لئے سنگلاخ سمجھی جاتی رہی لیکن تحقیقات کی روشنی میں یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اردو نثر و نظم کی تدریج و ترقی جس انداز سے بنگال میں ہوئی اس کی مثال کہیں اور مشکل سے ملے گی۔ بنگال کی سرسبز و شاداب وادیاں، ساحلی علاقوں کے دلفریب مناظر اور شعر، نغمہ و موسیقی کی سحر انگیزی نے ہر آنے والے کے دل کو موہ لیا۔ جس نے بھی ایک بار اس طلسماتی دنیا اور مسحور کن فضا میں قدم رکھا وہ یہیں کا ہو رہا۔ تحریک آزادی ۱۸۵۷ء کی باد خزاں سے دہلی اور لکھنؤ کے گلستانِ سخن اُجڑ گئے۔ شہنشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کر کے رنگون بھیجدیا گیا اور خاتم السلاطین واجد علی شاہ اختر تاجدار اودھ کو معزول کر کے مٹیا برج کلکتہ (جو دریائے ہگلی کے ساحل پر کلکتہ کے مغربی جانب واقع ہے) پہنچا دیا گیا۔ واجد علی شاہ نے بڑے حسرت و یاس کے ساتھ دیار لکھنؤ کو الوداع کہا اور ان جذبات کے ساتھ بنگال کا رُخ کیا ؂

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں
رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

لیکن یہاں کے خوشگوار ماحول اور مٹیا برج کی پُر فضا بستی میں واجد علی شاہ ایسے مانوس و مسحور ہوئے کہ لکھنؤ کو بھول گئے اور یہیں پیوند خاک ہوئے۔ واجد علی شاہ نہ صرف اپنے ہمراہ لکھنوی مذاق اور سرمایۂ زبان لائے بلکہ اپنے تمام خوشہ چیں اور اہلِ علم و فضل کو بھی ساتھ لائے جن کے ذوق شعر و ادب نے مٹیا برج کو لکھنؤ کا ایک قابلِ رشک نمونہ بنا دیا اور شامِ اودھ کی بہار جیسے زینت بنگال میں منتقل ہو گئی۔

ان دنوں بنگال کے نامور اساتذہ سخن عبد الغفور خاں نساخ مصنف "تذکرۂ سخن الشعراء" اور قاضی محمد اختر کا طوطی بول رہا تھا۔ یہی وہ یادگار زمانہ تھا جب مرزا غالب دو بار کلکتہ آئے اور تیسری بار آنے کی حسرت دل میں لے کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔ غالب کو جب کلکتہ یاد آتا تو بے اختیار تڑپ اُٹھتے ؂

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

غالب[1] کا سفر کلکتہ تو بہت مشہور ہے لیکن ان کے علاوہ اور بہت سے مشہور شعرائے کرام اور اکابر ادب نے

---

[1] اس موضوع پر راقم کے دو مضامین نقوش اور راہ نو کے غالب نمبر ۱۹۶۹ء میں شائع ہو چکے ہیں۔

بنگال کے سفر کو اپنی زندگی میں بڑی اہمیت دی ۔ کلکتے کی ادبی محفلوں کی دھوم دور دور تک پہنچ گئی ۔ مرزا نواب داغ دہلی سے اور نظم طباطبائی دکن سے کلکتہ آئے تو زبان و بیان پر بحث و مباحثہ بھی ہوا اور شعر و سخن کی محفلیں بھی گرم ہوئیں داغ نے اپنے قیام کلکتہ کا ذکر اپنی مشہور مثنوی فریادِ داغ میں بڑی محبت اور بڑی بے ساختگی سے کیا ہے ۔

یہ دور اور اس کے بعد کا دور بنگال میں اردو شاعری کے عروج کا دور تھا ۔ بنگال کے ہر چہار طرف شعر و سخن کا چرچا تھا ۔ جب اس کی شہرت شمالی ہند کے علاقوں میں پہنچی تو لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی بھی بنگال آئے بغیر نہ رہ سکے ۔ اکبر الہ آبادی کلکتے میں اودھ پنچ لکھنؤ کے مشہور نامہ نگار نواب سید محمد آزاد کے یہاں مہمان رہے ۔ دورانِ قیام انھوں نے اپنی آنکھوں کا آپریشن کرایا اور مکمل صحتیابی کے بعد بھی کئی دن تک قیام فرمایا ۔ اس عرصے میں کلکتہ مٹیا برج اور مختلف علاقوں میں اکبر الہ آبادی کے اعزاز میں خوب خوب دعوتیں ، نشستیں اور مشاعرے منعقد ہوئے جس کا ذکر اکبر نے اپنے بعض خطوط میں بھی کیا ہے ۔ غالب اور داغ کی طرح اکبر کو بھی کلکتہ بہت پسند آیا چنانچہ اپنے وطن واپس جاکر کلکتے کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے ۔ جس زمانے میں اکبر بنگال آئے اس زمانے میں شمع اردو جابجا روشن تھی اور پروانۂ سخن دیوانہ وار اُمڈ رہے تھے ۔ کلکتے میں رضا علی وحشت مولانا ابوالکلام آزاد ، محمد سرور خاں سرور تلمیذ امیر مینائی ، پروفیسر عبدالغفور شہباز ، اکمل علی اکمل ۔ ڈھاکے میں سید محمد آزاد ۔ شرف الحسینی شرف ، حکیم حبیب الرحمٰن احسن اور مرزا غالب کے تنہا بنگالی شاگرد ۔ سید محمود آزاد ، خواجہ فیض الدین حیدر جہاں شائق اور عبدالغفار اختر ، فرید پور میں ابوالقاسم محمد مظہر الحق شمس[2] ، مرشد آباد میں الفت حسین فریاد ، جرأت ، چاٹگام میں رمز اور رحید بخش حیدری ، مالدہ میں منظوم ۔ ہندسوا میں عبدالحمید النسخ ، سلہٹ میں نجم الدین نادر اور میمن سنگھ میں محمود الرب صدیقی عرف خالد[1] بنگالی جیسے خوش فکر اور قادر الکلام شعرا اور ممتاز انشا پرداز موجود تھے[3] ۔

سید محمد آزاد ، عبدالغفور شہباز ، مرزا فقیر محمد سے اکبر الہ آبادی کے خاص مراسم تھے ۔ جیسا کہ اوپر ذکر کیا جاچکا ہے کہ کلکتہ میں اکبر کا شرف میزبانی سید محمد آزاد کو حاصل ہوا نواب سید محمد آزاد کے چھوٹے بھائی ڈھاکے کے صاحب جاہ و ثروت رئیس تھے ۔ ان کے مزاحیہ مضامین اس زمانے کے تقریباً تمام رسائل و جرائد میں مسلسل شائع ہوتے تھے ۔ اودھ پنچ لکھنؤ کے خاص نامہ نگار تھے ۔ نئی ڈکشنری کے عنوان سے اودھ پنچ میں ایک نہایت دلچسپ اور جدت طراز ظرافت آمیز سلسلہ شروع کیا تھا ۔ اس سلسلے کے کچھ مضامین " خیالاتِ آزاد " کے نام سے پہلی بار ۱۸۸۸ء میں قومی پریس لکھنؤ سے اور دوسری بار ۱۹۰۱ء میں عبدالحمید کے زیر اہتمام رضوان پریس کلکتہ سے شائع ہوئے اکبر الہ آبادی کی تخلیق کے ساتھ ساتھ اودھ پنچ میں سید محمد آزاد کے جو رشحات شامل ہوتے تھے ۔

---

[1] خالد بنگالی ۱۹۲۴ء میں میمن سنگھ (مشرقی بنگال) کے بولائی نامی ایک گاؤں سے ماہنامہ اختر نکالتے تھے ۔ اس رسالے کو برصغیر ہند و پاک کے مشاہیر اہلِ قلم کا تعاون حاصل تھا جس میں اکبر الہ آبادی اور علامہ نیاز فتحپوری خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

[2] شمس فرید پوری عبدالغفور خاں نساخ کے بیٹے ، داغ کے شاگرد اور علامہ وحشت کے استاد تھے ۔ وحشت نے دیوان شمس مرتب کرکے شائع کیا ۔ [3] ان حضرات کے تذکرے " بنگال میں اردو " مصنفہ وفا راشدی میں شامل ہیں ۔ (ادارہ)

ان کے متعلق پروفیسر عبدالغفور شہباز نے "خیالات آزاد" کے دیباچے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے:۔

اس رنگ نے وہ مقبولیت حاصل کی اس وقت کے کل رنگ پھیکے پڑ گئے اور اکبر نے جوش پسندیدگی میں اس کی تقلید کرنی چاہی لیکن آخر وہ مثل ہوئی کہ بھاری پتھر تھا چوم کر اٹھا۔"

عبدالغفور شہباز بھی اکبر کے بنگالی ہمعصر تھے۔ اکبر سے ان کی گرویدگی کا سبب اودھ پنچ کا تعلق تھا۔ شہباز کلکتے کے مشہور اخبار "دارالسلطنت" اور "اردو گائیڈ" کے علاوہ "اودھ پنچ" میں برابر لکھتے تھے۔ بیک وقت کئی زبانوں، انگریزی، اردو، بنگلہ، فارسی اور عربی پر کامل دستگاہ رکھتے تھے۔ شہباز نے خشک سے خشک موضوعات مثلاً مکھی، مکڑی، وفادار کتا، ڈکشنری پر بھی نظمیں لکھیں اور مضامین بھی لکھے مگر تحریر کی دلکشی ہر حال میں قائم رکھی، "اودھ پنچ" کی مطبوعہ نظمیں، تفریح القلوب" کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوئیں۔ اس کتاب کا مقدمہ علامہ رضا علی وحشت کلکتوی اور دیباچہ سر شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن لاہور نے تحریر فرمایا۔

سید محمد آزاد اور عبدالغفور شہباز کے جو مضامین نظم و نثر اودھ پنچ میں شائع ہوتے تھے۔ انھیں اکبر الہ آبادی بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ وہ بنگال کے ان دو اہل قلم کی تحریروں سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے بہترین دوست بن گئے اور عمر بھر یہ رشتۂ راہ و رسم استوار رہا۔

بنگال کے معاصرین و احباب میں مرزا فقیر محمد سے بھی اکبر کے تعلقات خاص تھے۔

مرزا فقیر ڈھاکہ کے نواب خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ خوش فکر شاعر اور اچھے مضمون نگار تھے۔ مرزا داغ دہلوی سے شرف تلمذ تھا۔ تمام عمر مشرقی بنگال میں رہ کر اردو زبان و ادب کی خاموش خدمت کی مشاہیر سے ان کی ہمیشہ راہ و رسم رہی اور یہ سلسلہ بذریعہ خط و کتابت برابر جاری رہا۔ اکبر الہ آبادی جب کلکتہ آئے تو مرزا فقیر محمد ان سے ملنے کلکتہ گئے۔ اکبر نے کہا۔

"مرزا صاحب! میں خود آپ سے ملنے ڈھاکہ آرہا تھا۔ شرف[1] صاحب نے مجھے آپ تک پہنچانے کا وعدہ کیا تھا لیکن آپ خود تشریف لے آئے تو میں شرمندہ بھی ہوں اور مسرور بھی۔"

مرزا فقیر محمد اکبر کے ہم عمر احباب میں سے تھے۔ اکبر ان سے مل کر ان کے اخلاق کے گرویدہ ہو گئے۔ لیکن ان کی تحریر سے پہلے ہی سے متاثر تھے۔ بڑی دلچسپی کے ساتھ انھیں خط لکھا کرتے اس جگہ مرزا فقیر محمد کے نام اکبر کے ایک مکتوب کی نقل پیش کی جاتی ہے۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ ایک خالص بنگالی نژاد شاعر و ادیب کی تحریر کی داد اکبر جیسے بیباک و صاف گو شخص نے کس خلوص و فراخدلی سے دی ہے۔

۱۔ شرف الحسینی شرف کا مولد و مسکن ڈھاکہ تھا۔ گلستان شرف کے مصنف اور محمد آزاد کے بھانجے تھے۔ اردو اور فارسی کے ایک باکمال شاعر تھے۔ اکبر سے ملاقات کرنے والوں میں سب سے کم عمر تھے۔ محمد آزاد سے دوستانہ تعلقات کی بنا پر اکبر شرف کے ساتھ بزرگانہ شفقت سے پیش آئے۔ راقم کو ڈھاکے میں شرف سے ملنے کا شرف رہا۔ اکبر کے سفر کلکتہ کے واقعات شرف سے بھی سنے تھے۔

الہ آباد

۲۶ نومبر ۱۳ء مکرمی السلام علیکم ورحمۃ اللہ

"آپ کی تحریر ایسی اچھی ہے کہ اگر ناتوانی مانع نہ ہوتی تو داد دینے کو خود حاضر ہوتا۔ اس طرز خیال اور اس زبان پر تو خود دہلی اور لکھنؤ کو ناز ہو سکتا ہے۔ آپ کا دل و دماغ اور آپ کی زبان و طبیعت جہاں ہے وہ بنگال نہیں ہے۔ آپ نے میری قدر افزائی کی ہے۔ خدا خوش رکھے۔ میں اپنے آپ کو اس کا مستحق نہیں سمجھتا۔"

دعائے خیر کا طالب

اکبر حسین

علامہ رضا علی وحشت کلکتوی اربابِ علم و ادب کی دل سے قدر کرتے تھے۔ اپنے ہمعصروں اور دوستوں کا ذکر نہایت عزت و احترام سے کرتے تھے۔ اکبر الہ آبادی جب کلکتے میں تھے تو اس زمانے میں مولانا محمد علی جوہر، نواب امداد امام اثر، نظم طباطبائی، مرزا محمد عسکری، ابوالکلام آزاد اور علامہ وحشت کی اکبر سے روزانہ شام کے وقت دفتر "کامریڈ"[1] میں خوشگوار ملاقاتیں اور دلچسپ صحبتیں رہیں۔ سر شیخ عبدالقادر کے مخزن لاہور میں اقبال اور اکبر کے ساتھ وحشت کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ اقبال اور اکبر نے وحشت کی اکثر غزلوں پر بذریعہ خطوط تحسین آمیز خیالات کا اظہار کیا۔ ۱۹۱۰ء میں جب نولکشور لکھنؤ نے "دیوانِ وحشت" شائع کیا تو اکبر الہ آبادی نے وحشت کے نام ایک طویل مکتوب تحریر فرمایا اور یہ قطعۂ تاریخ ارسال کیا ؎

دیوان سے وحشت کے ہر طبع کو اک اُنس | دل کھِل گئے ہیں رنگِ معانی کے چمن سے
حاصل ہوئی لذت بھی جو اشعار کو دیکھا | تاریخ بھی پیدا ہوئی تحقیقِ سخن سے

۱۳۲۸ھ (نقوش و آثار)

شہنشاہِ سخن اکبر اعظم دنیا سے رخصت ہوئے تو ساری دنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ وحشت جادو بیاں نے اکبر رنگیں بیاں کا جس کرب و درد کے ساتھ ماتم کیا اس کی تصویر ان اشعار میں دیکھئے ؎

لسان العصر یعنی حضرتِ اکبر کا ماتم ہے | ہوا ماتم میں ماتم اس برس کیسا محرم ہے
بجھی وہ شمع جو روشن تھی بزمِ نکتہ سنجاں میں | بلا کی تیرہ و تاریک اپنی مجلسِ غم ہے
وہ اکبر تھا جو تھا شہنشاہِ اقلیمِ سخندانی | قیامت کیوں نہ برپا ہو کہ اس کا آج ماتم ہے
جگر چھِد چھِد گئے ہیں بارشِ تیرِ حوادث سے | نہیں اب اس کی صورت امتزاجِ مہر برہم ہے
ظرافت میں متانت تھی، متانت میں ظرافت تھی | عجب انداز تھے اس کے کہ جس کا آج ماتم ہے

رہے گا تیرہ سو چالیس ہجری یاد عالم کو
کہ وحشت یہ شہنشاہِ سخن کا سالِ ماتم ہے

---

[1] یہ وہی ڈیلی کامریڈ (انگریزی اخبار) تھا جس کے ایڈیٹر مولانا محمد علی جوہر تھے۔

اکبر اور اقبال

(پروفیسر عبدالقادر سروری)

اکبر و اقبال میں شاعری کی حد تک بظاہر بہت کم مماثلت دکھائی دیتی ہے۔ اکبر بحیثیت مجموعی سماج کے بے پناہ نقاد تھے اور ان کا انداز انھیں کے ساتھ مخصوص تھا۔ سیاست میں وہ سرکاری ملازمت کی پابندی کی وجہ سے عملی حصہ نہیں لے سکتے تھے یہ اور بات ہے کہ اپنے ملک کے سیاسی مسائل پر بھی وہ کبھی کبھی مزاحیہ اور شاعرانہ انداز میں نرم یا گرم تنقید کر دیا کرتے تھے تاہم اکبر کے زمانہ کی سیاست زیادہ تر گھریلو تھی اور بین قومی سیاست ویسی حرکی اور آتش گیر نہیں تھی جیسی کہ اقبال کے زمانہ میں ہو گئی تھی۔ وسیع تر حیات کے مسئلوں پر اکبر کی شاعری میں جو کچھ ملتا ہے اس کی حیثیت ضمنی ہے۔ اس کے برخلاف اقبال کا زمانہ سیاسی اور فکری اعتبار سے ایک ہیجان خیز زمانہ تھا ملک اور بیرون ملک ہر جگہ ایک شورش سی برپا تھی، اسکے علاوہ اقبال کے طبعی اور ذہنی میلانات کی وسعت نے انھیں محض گھریلو امور تک محدود رہنے نہ دیا اسی لئے ان کی شاعری کا دائرہ بہت وسیع اور ان کی فکر کی کائنات زیادہ ہمہ گیر ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ "ہنسوڑ" تھے اور یہ "مقطع" ان کا اور اُن کا کیا میل۔"

لیکن اس ظاہری یکسانیت کی تہ میں فکری رجحان کا ایک گہرا رشتہ موجود تھا۔ جس کا آغاز جدید دور کی شاعری میں شبلی سے ہوا تھا۔ حالی کے نعرہ نے کہ "پھر دتم ادھر کو جدھر کی ہوا ہو" ابتداء میں اردو شاعروں اور ادیبوں کو اتنا چوکنا کر دیا تھا کہ ہر وہ شخص جو نئے حالات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ، بنانا چاہتا تھا۔ اپنے ماضی سے کٹ جانا ضروری سمجھنے لگا تھا۔ شبلی جیسا عالم بھی اس تجدید پسند قافلے کے ساتھ قدم ملا کر چلنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن تجدید پسندی کی پہلی رو کے مدھم پڑ جانے کے بعد شبلی چونکے نئی شائستگی، سماج کے مسائل کا حل ثابت ہونے کے بجائے خود نئے اور کٹھن مسائل کو پیدا کرنے والی ثابت ہو رہی تھی، نئی روشنی کی چکاچوند میں، جو خدوخال نظر نہیں آسکتے تھے وہ اب دھندلے سہی لیکن دکھائی دینے لگے تھے۔ شبلی کو یہ محسوس ہونے لگا کہ تجدد پسندوں کا یہ قافلہ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر یوں ہی رواں دواں رہے تو اس کا اپنے ماضی سے کٹ کر الگ ہو جانا ضروری ہے۔ انھیں یہ یقین بھی ہو چلا تھا کہ قومیں مانگی تانگی چیزوں پر اترا نہیں سکتیں بلکہ ماضی کے ساتھ رشتہ محکم رکھتے ہوئے نئی معلومات اور تجربات کی روشنی میں اپنی اصلاح کرکے اور "خذ ما صفا ودع ما کدر" کے اصول پر عمل کرنے سے ترقی کر سکتی ہے اور قومی ارتقا کا تسلسل بھی قائم رہ سکتا ہے۔ اکبر الہ آبادی اس میں شک نہیں کہ اپنے عہد کی پیداوار تھے لیکن فکری رجحان کے اعتبار سے ان کا مسلک شبلی کے مسلک سے جدا نہیں تھا بلکہ دونوں ہم فکری جدوجہد کی تہ میں ایک ہی اصول کام کر رہا تھا۔ مثال کے طور پر اکبر کے یہ چند شعر پیش کئے جا سکتے ہیں جو حالی کے مسلک کا براہ راست ردِ عمل نہیں تو اس طرزِ فکر کی تنقید ضرور کہے جا سکتے ہیں :-

ہوس پرستوں کو کیوں یہ کد ہے — ان انقلابوں کی کیا سند ہے
اگر زمانہ بدل رہا ہے — بدلنے ہی کو بدل رہا ہے

عروجِ قومی۔ زوالِ قومی خدا کی قدرت کے ہیں کرشمے
ہمیشہ ردو بدل کے اندر، یہ امر پولیٹیکل رہا ہے

ایک اور موقع پر فرمایا تھا ؎

لوگ کہتے ہیں بدلتا ہے زمانہ سب کو — مرد وہ ہیں جو زمانے کو بدل دیتے ہیں

اکبر سچے معنوں میں رجعت پسند نہیں تھے لیکن قومی ترقی کے بارے میں ان کے عقائد شبلی جیسے تھے۔ اسی لئے ماضی کی توہین کرنے والوں کا انھوں نے خوب مضحکہ اڑایا ہے۔

اقبال کی شاعری کے بنیادی محرکات کی اہمیت کو اس پس منظر میں اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ گو ان کی فکر کی گہرائیوں اور وسعتوں میں یہ بنیادی رشتہ گم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ اقبال اپنے عروج کے زمانے سے عالمی نہیں تو مشرق کے شاعر ضرور ہو گئے تھے۔ چنانچہ یورپ سے واپسی کے بعد سے ان کی فکر کا رُخ مغربی "نظامِ حیات" حکمت عملی اور سماج کی تنقید کی جانب زیادہ پھر گیا تھا اور وہ اکثر مشرق کی عظمت کے راگ گاتے سنائی دیتے ہیں۔

لیکن ان چند سطور کا مقصد اکبر اور اقبال کی شاعری اور فکری رجحانات کا مقابلہ یا موازنہ کرنا اتنا نہیں جتنا کہ ان دو بڑے سخن سنجوں کے نجی تعلقات پر روشنی ڈالنا ہے۔

اکبر اقبال سے کم و بیش ۳۰ سال بڑے تھے اور جس وقت اقبال شاعری کے میدان میں نمود حاصل کرنے کے قابل ہوئے تھے اکبر کافی معمر ہو چکے تھے۔ ان کی شاعری مکمل ہو چکی تھی اور ان کا پیام دیا جا چکا تھا۔ اقبال بہ حیثیت اس کے کہ وہ اپنے عہد کی تخلیق پیداوار تھے۔ ان کا اپنے پیش رو شاعروں کے افکار سے استفادہ نہ کرنا اور ان کے اسالیب سے متاثر نہ ہونا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ انھوں نے ابتداء میں نواب مرزا خاں داغ سے رشتۂ تلمذ جوڑا اور اس معنوی رشتہ کے تعلق سے انھوں نے داغ کے انداز پر لکھنے کی کوشش بھی کی جس کا اثر ان کی ابتدائی غزلوں سے ظاہر ہے، لیکن داغ کے مخصوص انداز فکر سے جلد ہی ان کی طبیعت سیر ہو گئی کیونکہ ان کی گہرائیوں اور خیال کی وسعت کے لئے یہاں گنجائش انھیں نظر نہیں آئی۔ اس کے بعد جب انھیں غالب کے کلام کے مطالعہ کا موقع ملا، تو غالب کے انداز فکر اور اسالیب کی ندرت سے بھی وہ کسی حد تک متاثر ہوئے، گو اقبال نے غالب کا اتباع لفظاً اور معناً نہیں کیا، تاہم ان کی مخصوص طرز فکر کو غالب کے انداز سے ایک ربط سا تھا۔ اس لئے یہ اثرات کسی نہ کسی صورت میں آخر تک باقی رہے۔

اکبر کا انداز بھی انھیں بھایا جس کے اثرات ان کی بعض نظموں سے ظاہر ہیں جو اکبر کے مزاحیہ رنگ میں سماج کی تنقید کرتے ہیں۔ ایک دو نمونے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی — قوم نے ڈھونڈ لی فلاح کی راہ
یہ ڈرامہ دکھائے گا کیا سین — پردہ اٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ — دفع مرض کے واسطے "پل" پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — جی چاہتا تھا ہدیۂ دِل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق — کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجئے

لیکن یہ بات ذہن نشین رہنی چاہئے کہ سارے رجحانات وقتی ہیں اور وقتی تاثرات سے تعلق رکھتے ہیں۔ اقبال کا اندازِ شاعری ان سب سے جدا اور ان کا اپنا ہے۔

اقبال جب شہرت کی سرحد میں قدم رکھ رہے تھے اکبر نے بھی ان کا نام سُنا اور شاید ان کے کان بھی کچھ کھڑے ہوئے لیکن اب معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اقبال کی بڑھتی ہوئی شہرت کو ایک پختہ کار اور کامیاب شاعر کے احساس برتری کے ساتھ دیکھا۔ شاید اسی طرح جس طرح ایک شہرت یافتہ بوڑھا پہلوان کسی ہونہار نو عمر پٹھے کو دنگل میں کودتے ہوئے دیکھتا ہے۔ بدقسمتی سے ذہنوں کے اس ارتباطِ عمل اور ردِ عمل کے زمانہ میں اقبال کے خیالات کے ایک آدھ چھپنے والے کونہ نے اُن کے ذہن کو راست یا بالواسطہ ٹھیس لگا دی تھی۔

مولانا خواجہ حسن نظامی سے اکبر کو جو گہرا لگاؤ تھا وہ پوشیدہ بات نہیں ہے اقبال کی شاعری کے عنفوان میں خواجہ صاحب کے ساتھ کسی مناقشہ میں اقبال کی ہمدردیاں ان کے مخالف کے ساتھ ظاہر ہوئی تھیں۔ پھر اقبال نے نارسائی کے زہد بہانہ راحت تصوف اور خانقاہیت پر جو ایراد کئے تھے وہ ایک طرف تو اکبر کے متصوفانہ عقیدوں کی راست توہین تھی تو دوسری طرف خواجہ صاحب کی خانقاہ نظامی اس کی زد میں آجاتی تھی۔ اس دخل در معقول کے سبب اقبال کے جمے جمائے احساسِ شہرت نے اس نووارد کو نازیبا سا اجنبی بنا دیا۔

ایک اور بات بھی ہے۔ دہلی اور لکھنؤ کے اہلِ سخن کے درمیان زبان کے معاملہ میں مستند اور غیر مستند اہلِ زبان اور غیر اہلِ زبان کے جو معرکے پرانے زمانہ سے برپا رہے تھے اور پھر محض دہلی والے۔ یا محض لکھنؤ والے اور کبھی دونوں مل کر اور کبھی کبھی سارے صوبہ متحدہ کی جانب سے ہندوستان کے دوسرے مقامات کے اردو لکھنے والوں کے مقابلے میں صف آرا ہو جاتے تھے برتری کا یہ احساس اردو کو سارے ہندوستان کی زبان مانتے ہوئے بھی دلوں سے مٹایا نہیں جا سکا تھا، اکبر کی پرورش بھی ان ہی روایتوں کی فضا میں ہوئی تھی، اقبال یو، پی سے باہر پنجاب دیس کے رہنے والے تھے اور ہم نے اپنے قریبی زمانہ میں اس صوبہ سے کسی قابلِ اعتنا اردو شاعر کو اٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے اقبال پر بھی صوبہ متحدہ کے معتبر لکھنے والوں کے اعتراضوں کی بوچھار ہوئی، جس کی گونج ابھی ہمارے کانوں سے محو نہیں ہوئی تھی۔

اس فضا میں اکبر کا اقبال کو ذرا مشتبہ اور کسی حد تک سرپرستانہ نظروں سے دیکھنا کوئی غیر فطری بات نہیں تھی۔

اکبر نے اپنے ہمعصروں سے لجتی کی طرف اپنے کلام میں اشارے بھی کئے ہیں لیکن اس میں اقبال کی طرف کوئی اشارہ نہیں ملتا۔ اس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اکبر نے اوپر بیان کی ہوئی وجوہات کی بنا پر یہ گنجائش پیدا کرنی نہ چاہی ہو کہ وہ اقبال کو ایسا در خور اعتنا نہیں سمجھتے کہ ان کی جانب کوئی اشارہ کیا جا سکے، اقبال کے روابط اکبر کے ساتھ نہ صرف علمی اور ذہنی تھے بلکہ وہ الہ آباد میں اکبر کے ساتھ رہ بھی چکے تھے۔ اس کے علاوہ اکبر نے اقبال کی کچھ باتوں کو ناپسند بھی کیا تھا اور ایک آدھ بات انھیں پسند بھی آئی تھی، پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اقبال اس طرح اکبر سے نظر انداز ہو جاتے۔ حالانکہ اکبر نے اپنے کچھ خطوں میں اقبال کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کا ایک قرین قیاس سبب یہ ہو سکتا ہے کہ اقبال کے منظرِ شہرت پر آنے تک اکبر

کی شاعری کے محرکات ختم ہو چکے تھے اور اس آخری دور میں اکبر نے کچھ غزلیں جو لکھیں اس سے زیادہ قوی تر تحریک کی بنا پر لکھی گئیں جو اقبال کا موافق یا ناموافق اثر ان کے جذبات میں پیدا کر سکتا تھا۔

بہرحال اس کا سبب کچھ بھی ہو اکبر کے کلام میں اقبال کے بارے میں اشاروں کی کمی کی تلافی ان کے ایسے خطوں سے ہو جاتی ہے جن میں اقبال کا تذکرہ موجود ہے اور جو اکثر و بیشتر مولانا خواجہ حسن نظامی کے نام لکھے گئے ہیں۔

اقبال کے یورپ سے واپس ہونے کے تین چار سال بعد ۱۹۱۲ء میں جب اقبال کی اصلی شہرت کی پہلی کرن پھوٹ رہی تھی۔ اکبر کے لئے اقبال سے کچھ تو ہم پیشگی کے سبب اور کچھ اقبال کی غیر معتاد جلت شہرت کے باعث ذہنی تماس کے مواقع پیدا ہو گئے۔ اسی زمانہ میں ایک خط میں وہ مولانا خواجہ حسن نظامی کو لکھتے ہیں :۔

"حضرت اقبال کی مشغولیت فی الطاعۃ سے نہایت خوشی ہوئی۔ اس سے دل لگ جائے تو سلطنت ہیچ ہے۔ ...... میں ان کو مبارک باد لکھوں گا۔ انجمن حمایت الاسلام کے جلسہ میں وہ مجھے اصرار و شوق کے ساتھ مدعو کرتے ہیں۔" (خط مورخہ ۲۹ر فروری ۱۹۱۲ء)

اسی زمانے میں تصوف کے بارے میں اقبال کے کچھ خیالات منظر عام پر آئے تھے۔ تنزل یافتہ تصوف اور رہبانیت کے خلاف اقبال کی تنقید چھپی ہوئی چیز نہیں ہے اب یہ ایک اتفاقی بات ہے کہ اکبر کو بہت سی چیزوں میں سے ایک تصوف کے ساتھ ہی گہرا لگاؤ تھا۔ چنانچہ وہ خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں :۔

"تصوف اور بیخودی کے ذکر میں جو لذت ہے اسی لذت کی گود میں میرا خیال پلا ہے اور میرے نزدیک تو سارے معنی اسی میں ہیں کوئی فلسفہ اس کے خلاف ہو تو ہم کو ہرگز اس سے دلچسپی نہیں ہو سکتی ہم تو اس کو صریح غلط سمجھیں گے یا خود مطیع نفس بے خود مع اللہ میں بھی مایوس ہوا۔ افسوس کیا۔ تعجب ہوا لیکن سمجھا کہ اگر کسی کی بہتری ایسے ہی خیالات میں ہو تو ہم کو کیا دخل بس یہی کہہ دینا کافی ہے۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار

میں امید کرتا ہوں کہ مقصود اچھا ہے گو جوانانہ ہو اظہار میں احتیاط نہیں کی گئی۔ غریب تصوف کا رعب ہی کیا تھا۔ لیکن اس نے کچھ بگاڑا بھی تو نہیں کتنے لوگ اس وقت اس کے دلدادہ ہیں اور وہ باخود بھی ہوں تو کیا کر لیں۔ اور کیا دلیل ہے کہ باخود نہیں ہیں الفاظ سے مزہ لیا جاتا ہے۔ ترک کر دئے جائیں تو کیا نتیجہ"؟ (خط مورخہ ۲ر ستمبر ۱۹۱۵ء)

اسی سلسلہ میں ۳ر اگست ۱۹۱۷ء میں اکبر خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں :۔

نیو ایرا جو لکھنؤ سے انگریزی میں نکلنا شروع ہوا ہے ۲۸ر جولائی کا پرچہ حضرت اقبال نے میرے پاس بھجوایا ہے اس میں ان کا ایک آرٹیکل تصوف کے خلاف چھپا ہے، لیکن میں نہیں جانتا کہ وہ کونسا اسلامی مشہور تصوف ہے جو انسان کو دنیا میں سعی سے روکتا ہے۔ بہرحال پڑھنے لکھوں کا یہ پرانا شغل زندگی ہے۔ انسان کو ضرور مردانگی سے کام لینا چاہئے لیکن کالج کی پروفیسری عرب کی مردانگی نہیں ہے جس کا وعظ کہا جاتا ہے"

اکبر کی نظم ملا اور صوفی غالباً اسی کا جواب تھا جو مئی ۱۹۱۸ء میں چھاپی گئی تھی۔ اس نظم کے بارے میں اکبر لکھتے ہیں :۔

معارف نے میری نظم "ملا اور صوفی" بلا میری درخواست کے چھاپ دی۔ ڈاکٹر اقبال صاحب کو پسند نہ آئی لیکن اس میں کسی کی حمایت نہیں ہے مصلحت اندیشی ہے" (خط مورخہ ۲۳ر مئی ۱۹۱۸ء)

اقبال کو غالباً اس کا احساس تھا کہ تصوف کے بارے میں ان کے خیالات سے غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں اور بعض حضرات (جن میں اکبر بھی شامل ہیں) کے دل کو ٹھیس لگی ہے۔ اس لئے انھوں نے خط لکھا تھا اور اپنے مسلک کو واضح کرنے کی کوشش کی تھی چنانچہ اکبر ہی کے ایک خط سے جو ۱۸ر اگست کا مورخہ ہے پتہ چلتا ہے۔

" اقبال صاحب کا خط آیا ہے لکھتے ہیں۔

میں تصوف کے خلاف نہیں ہوں صرف چند مسائل سے اختلاف ہے جو کچھ ہو، شکستگیٔ دل بری چیز ہے یا گداندل کہئے۔ یہ نہیں تو وہ رنگ نہیں۔ میں نے لکھ دیا کہ خواہش یہی ہے کہ آپ محبوب قلوب رہیں۔"

بعض امور میں جن میں تصوف اور خاص طور پر خانقاہیت شامل ہیں خواجہ صاحب میں اور علامہ اقبال میں کچھ اختلاف رائے اور ذرا تلخی پیدا ہوگئی تھی چنانچہ خواجہ صاحب نے اکبر کے موسومہ ایک خط میں اس طرف طنزیہ اشارہ کیا ہے۔

" ڈاکٹر اقبال کا اور میرا کیا مقابلہ۔ اُن کے ہاتھ پاؤں ہیں اور میں بے دست و پا ہوں۔"

اس نزاع میں ظاہر ہے کہ اکبر خواجہ صاحب کے ساتھ تھے خواجہ صاحب کے جواب کے طور پر شاید اقبال کچھ لکھنا چاہتے تھے، جس کی اطلاع انھوں نے اکبر کو دی اس پر اکبر لکھتے ہیں۔"

" اقبال لکھتے ہیں کہ میں بھی مضمون لکھوں گا۔ نہایت افسوس کی بات ہے۔ زوال اقبال سے مجھ کو بہت ملال ہوا اس باب میں پھر لکھوں گا۔ میں اقبال کو لکھوں گا کہ اگر ممکن ہو تو اپنی قابلیت کو کسی بہتر اور نتیجہ خیز کام میں صرف کریں"
(خط مورخہ یکم رجنوری ۱۹۱۶ء)

اسی زمانہ میں اکبر نے خواجہ صاحب کو لکھا تھا۔

" حضرت اقبال نے میرے نزدیک تمہید میں احتیاط نہیں کی اور ایک بڑا مجموعہ دلوں کا مغموم و مایوس ہوگا۔ لیکن اب وہ سنبھل کر مسئلۂ وحدت وجود اور مسئلۂ رہبانیت پر گفتگو کریں گے۔ حضرت اقبال ہی خودی کو بڑھا کر "ہمہ منم" کہہ دیں مطلب حاصل ہے۔
(خط مورخہ ۱۱ جنوری ۱۹۱۶ء)

اسی سلسلہ میں اکبر نے یہ چند شعر بھی کہے تھے، جنھیں خواجہ صاحب کے پاس بھیجکر لکھا تھا " آپ کو عذر نہ ہو تو ہم کو عذر نہیں کہ یہ اشعار شائع ہوں ثقالت نہیں ہے۔" اشعار حسب ذیل ہیں ؎

حضرت اقبال اور خواجہ حسن — پہلوانی ان میں، اُن میں بانکپن
جب نہیں ہے زور شاہی کے لئے — آؤ کچھ جائیں خدا ہی کے لئے
ورزشوں میں کچھ تکلف ہی سہی — ہاتھا پائی کو تصوف ہی سہی

"ہست" در ہر گوشۂ ویرانہ رقص
می کند دیوانہ با دیوانہ رقص

ان تلخ تعلقات کا سب سے زیادہ برا نتیجہ اکبر کی وہ تنقید ہے جو انھوں نے اقبال کے فارسی کلام پر کی ہے۔ لکھتے ہیں۔

اقبال صاحب کی یہ دیسری فارسی شاعری نے ساتھ مل کر مغرب و مشرق دونوں کے لئے بھیانک ہوگئی ہے۔ اللہ ان کے بیان کو زیادہ صاف کرے اور ہم پر اپنا فضل کرے اور صبر عطا فرمائے ؎

از کلید دین درِ دنیا کشاد

اگر سول کے رنگ میں لیا جائے تو لیسنس کی ضرورت ہے ۔ اگر دین صرف حصول دنیا کے ذریعہ سمجھا جائے جیسا کہ خود مصنف نے کیا ہے اور سب کر رہے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن کالج کو ۔ کلید دین " کیوں کہا ؟ بہر کیف اقبال سے زیادہ نہ لڑئیے ۔ دعائے ترقی و درستی اقبال کیجئے ۔" (خط مورخہ ۲ ر فروری ۱۹۱۶ء)

خواجہ صاحب کی تصنیف " کرشن بیتی " اسی زمانہ میں شائع ہوئی تھی ، پتہ نہیں کہ اکبر کو خواجہ صاحب کی رایوں سے کہاں تک اتفاق تھا لیکن " اسرار خودی " کے مطالعہ سے اکبر کو اطمینان ہوا کہ اقبال کم سے کم سری کرشن جی کے باب میں خواجہ صاحب سے فی الجملہ اختلاف نہیں رکھتے چنانچہ خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں ۔

" ڈاکٹر اقبال صاحب نے " اسرار خودی " میں سری کرشن جی مہاراج کو قابلِ تعریف و ادب کے ساتھ یاد کیا ہے ۔ اور ان کی تعلیم کو برقرار رکھا ہے ۔ (خط مورخہ ۱۵ جولائی ۱۹۱۶ء)

اقبال کا اختلاف خواجہ صاحب سے بہر حال علمی اختلاف تھا ۔ انھیں خواجہ صاحب کی ذات سے کوئی لڑائی نہیں تھی ، چنانچہ اقبال نے خواجہ صاحب سے ملاقات کی خواہش کی تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو ملنے سے انکار تھا ۔ اس پر اکبر اس طرح بیچ بچاؤ کرتے ہیں :

" میں بہت خوش ہوا کہ ڈاکٹر اقبال صاحب نے آپ سے ملنے کا شوق ظاہر کیا ہے ۔"

خواجہ صاحب کو منانے کے لئے اکبر نے یہ چند شعر بھی لکھے تھے جو اسی خط کے آخر میں درج ہیں :-

اے خواجہ حسن کر و نہ اقبال کو رد — تو جی رکنوں کے ہیں نگہبان وہ بھی
تم محو حسن کی تجلی میں اگر — ہیں دشمن فتنہ رقیباں وہ بھی
پریوں کے لئے جنوں ہے تم کو اگر — دیووں کے لئے ہے سلیماں وہ بھی

(خط مورخہ ۶ ر اگست ۱۹۱۶ء)

ادھر اکبر نے اقبال کو بھی فہمائش کی تھی :-

.... حسن نظامی سے محبت رکھنا چاہئے ۔

اقبال نے جواب دیا :-

" محبت تو رکھتا ہوں لیکن وہ برے طریقے سے اظہار مخالفت کرتے ہیں ۔"

اکبر پھر سمجھاتے ہیں :-

" آپ کو محبت اس لئے رکھنا چاہئے کہ خواجہ صاحب کتنا ہی اظہار بے خودی کریں لیکن عملی حالت میں آپ شریک غالب ہیں ۔"

اس سوال و جواب کے بعد اکبر لکھتے ہیں ۔

" اس کا اثر ہے کہ پونے دو برس ہو گئے ۔ ملنا میسر نہیں ہوا ۔ اس خط کا جواب نہیں آیا ۔ حال ہی میں لکھا ہے آپ بھی کہہ سکتے ہیں ______ کہ اقبال صاحب کے مقاصد کی میں قدر کرتا ہوں ، لیکن جو پیرایہ اختیار کیا گیا ہے وہ دل شکن اور ضرر رساں ہے ۔ سوشل تعلقات کی شیرینی رخصت ہوتی ہے ۔

(خط مورخہ ۲۴ ر اگست ۱۹۱۶ء)

اکبر کے بیچ بچاؤ اور فہمائش کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے کہ رنجش میں کچھ کمی ہوئی۔ چنانچہ ۱۷ر نومبر کے خط میں اکبر خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں:

حضرت اقبال کے خیالات میں بہت تبدیلی ہوئی۔ کم سے کم اس کا اظہار ہوا اب ان کو اچھی اور موزوں اور مربوط سوسائٹی مل جائے گی۔"

خواجہ صاحب کی تصنیف "محرم نامہ" اس زمانے میں منظر عام پر آئی۔ اقبال نے بھی اس کا مطالعہ کیا اور اپنے تاثرات اکبر کو لکھ بھیجے۔ اس کا حال اکبر کے ۳۰ر نومبر ۱۹۱۶ء کے خط سے معلوم ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:-

"اقبال صاحب نے تو مجھ کو خط میں لکھا ہے کہ مسئلہ امامت کو انھوں نے مان لیا لیکن یہ اقرار نہیں کیا کہ میں شیعہ ہوگیا۔ خانہ ساز عقائد سے دوسرا مذہب تو قائم ہو نہیں سکتا۔ شغل زندگی سمجھئے۔"

پھر ۲۸ر نومبر کے خط میں "محرم نامہ" کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ "اسرار خودی" سے اس کا مقابلہ کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "اسرار خودی" کے مطالعہ سے اقبال کی عظمت کی بیل کرن ان کے دل پر ضو فگن ہوئی چنانچہ وہ لکھتے ہیں:-

"محرم نامہ" "اسرار خودی" تک نہیں پہنچا، مگر ہے قابل داد اچھا ہے اقبال کا کچھ جواب ہو جائے۔"

"کرشن بیتی" کی اشاعت پر لوگوں میں سری کرشن جی کے صحیح مقام کے بارے میں رایوں میں کچھ اختلاف ظاہر ہوئے تھے اکبر کے جذبات محبت بھی مولانا حسن نظامی کی رائے سے اتفاق کرنے پر انھیں آمادہ نہ کر سکے۔ تاہم وہ ان کے دوست خواجہ صاحب کی تصنیف تھی۔ کم سے کم سری کرشن جی کو وہ ان کے زمانے کی زندگی کی اخلاقی خوبیوں کے معیار پر کھرا اترتے دیکھ سکے۔ اکبر کو اس کا بھی یقین تھا کہ مولوی صاحبان خواجہ صاحب کی رائے سے متفق نہیں ہو سکیں گے۔ تاہم وہ علامہ اقبال کی "اسرار خودی" سے گواہی چاہتے ہیں، انھیں یہ دیکھ کر یک گونہ اطمینان ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے بھی سری کرشن جی کا ذکرِ خیر "اسرار خودی" میں احترام سے کیا ہے۔ کرشن بیتی کا مقابلہ بھی وہ "اسرار خودی" سے کرتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔

"وہ زیادہ پولیٹکل ہے۔ آپ کے رنگ میں سادگی ہے۔" (خط مورخہ ۳۰ر جون ۱۹۱۶ء)

لیکن ساتھ ہی ساتھ تجربہ کار اور کامیاب شاعر کو اس کا بھی احساس ہوتا ہے کہ اس کا اشہب فکر بھی اس میدان میں کسی نوجوان سے پیچھے نہیں رہ سکتا چنانچہ ذرا توجہ کرنے سے یہ شعر ہاتھ آجاتے ہیں۔ ان اشعار کے بارے میں خواجہ صاحب کو لکھتے ہیں۔

"اسرار خودی" کی توضیح میں میں نے واحدی صاحب کو ایک مطلع لکھ بھیجا ہے وہ چار لفظ ہیں۔ لیکن توضیح تو ہوگئی۔"

سوال	جواب
عشق میں کیوں بیخودی مقصود ہے	حسن بیحد ہے، خود محدود ہے
	منکشف ہو جائیں اسرار خودی
	بیخودی کا بھی یہی دستور ہے

اقبال کی مراسلت اکبر سے جاری رہی۔ اور اخلاقاً وہ اقبال کا "آنر" بھی کرتے تھے۔ تاہم وہ اقبال کو نہیں مان سکتے تھے جو دنیا ان کو منانا چاہتی تھی۔ کیونکہ ان کو اقبال کی فکر کے چند جھٹکے لگانے والے پہلوؤں سے شکایت تھی۔ یہ باتیں ان کے خیالات سے میل نہیں کھا سکتی تھیں۔ چنانچہ ذیل کا اقتباس جو مورخہ ۱۴ر ستمبر ۱۹۱۷ء کے خط سے لیا گیا ہے۔ اکبر کے ذہنی رجحان پر روشنی ڈالتا ہے:

"اقبال صاحب مراسلت کرتے ہیں، ان کا اثر کیوں نہ کروں۔ لیکن دلی ذوق جاتا رہا۔ شریعت سے کس کو انحراف ہے لیکن یہ رنگ کہاں کہ ؎

حلقۂ پیر مغانم ز ازل در گوش است　　　برہمانیم کہ بودیم وہماں خواہد بود

قرآن مجید نے بھی اہل دل پر نظر فرمائی ہے ڈاکٹر صاحب صرف اسی دل کو مانتے ہیں جو ایک رخ سے نہ سکتا ہے خیر یہ تو دور کی باتیں ہیں۔

اقبال بہرحال اس بزرگ مفکر سخن کا احترام ملحوظ رکھتے رہے اور مراسلت میں کوتاہی نہیں کی۔ حتیٰ کہ ایک موقع پر اکبر بھی یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ،

"اقبال صاحب ہمارے اور آپ کے دوست ہیں۔ میں نے لکھا ہے کہ اپنی دین داری کو رحمت الٰہی ثابت کیجئے اللہ ہم سب پر رحم کرے۔"　　(خط مورخہ ۲۸ جنوری ۱۹۱۶ء)

اقبال اپنے خطوں میں اکثر اکبر کو احترام کے القاب سے مخاطب کرتے تھے۔ اکبر نے اس طرف جس تیکھے پن سے اشارہ کیا ہے پرلطف چیز ہے لکھتے ہیں۔

میں مخدومیت کا مستحق نہیں لیکن چاہتا ہوں کہ آپ کی عظمت اور محبوبیت قائم رہے۔"

(خط مورخہ ۹ فروری ۱۹۱۸ء)

اکبر سے اقبال کی پہلی ملاقات غالباً ۱۹۱۵ء میں ہوئی تھی۔ ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں اس ملاقات کے تاثرات اس طرح لکھتے ہیں

"تین سال پیشتر اقبال صاحب میرے مہمان ہوئے تھے۔ مجھ ہی سے ملنے آئے تھے دو دفعہ تشریف لائے تھے۔ اس وقت میں اس قدر دل گرفتہ اور ضعیف نہ تھا۔"

پھر مارچ ۱۹۱۸ء میں اقبال کی ملاقات اکبر سے دوبارہ ہوئی۔ اقبال کا خط آنے کے بعد اکبر نے خواجہ صاحب کو لکھا تھا۔

"کل ڈاکٹر اقبال صاحب کا خط آیا ہے کہ ۱۶ یا ۱۷ مارچ کو میں الہ آباد آؤں گا اور میرے ساتھ ایک اور صاحب ہوں گے جو صرف آپ ہی کے اشتیاق میں آتے ہیں۔ ...... کچھ دلچسپی کی امید ہے۔ آپ آتے تو میری قائم مقامی کرتے .... میں تو زیادہ حاضری بھی نہیں دے سکتا۔ ڈاکٹر صاحب سوشل طور پر ایک نعمت ہوں گے۔"

اقبال کی تیسری ملاقات اکبر سے غالباً ۱۹۲۰ء میں ہوئی۔ اس کا تذکرہ ۵ مارچ ۱۹۲۰ء کے خط میں اس طرح فرمایا ہے:

"۲۹ فروری کو ڈاکٹر اقبال صاحب تشریف لائے۔ کسی مقدمہ میں ضلع "گیا" کو گئے تھے۔ مجھ سے ملنے کو اس طرف سے گذرے تین دن رہے۔ ان میں میں نے بہت پولیٹکل نشاط طبع پایا۔"

اردو کے دو بڑے سخن سنجوں کی شاید یہ آخری ملاقات تھی۔

سرسیّد اور اکبر الہ آبادی

(ڈاکٹر فرمان فتحپوری)

حالی نے غالب کو حیوان ظریف کہا تھا۔ اس سے انکار نہیں کہ غالب کے یہاں ظرافت کے بعض بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن غالب کی شاعری حقیقتاً ظرافت کی نہیں، اندیشہ ہائے دور و دراز کی شاعری ہے۔ اس کا جتنا گہرا تعلق فکرِ سنجیدہ سے ہے طنز و مزاح سے نہیں ہے۔ حیوان ظریف کا صحیح اطلاق اکبر الہ آبادی پر ہوتا ہے۔ وہ اردو کے تنہا شاعر ہیں جن کی شاعری، ظرافت کے جملہ اقسام پر محیط ہے طنز، مزاح ہجو ملیح، کنایہ، رمز، بذلہ سنجی، لطیفہ، چٹکلہ اور پیروڈی۔ غرض کہ ظرافت نگاری کی جتنی ممکن صورتیں ہو سکتی ہیں سب ان کے یہاں ملتی ہیں اور اس درجہ موثر و دلکش پیرائے میں کہ اردو شاعری میں نہ ان سے پہلے اس کی نظیر ملتی ہے اور نہ ان کے بعد۔

اکبر کی یہ ہمہ گیری: ظرافت کی مختلف نوعیتوں کو خوش اسلوبی سے برتنے تک محدود نہیں ہے، معانی کی کثرت اور موضوع کی وسعت کے لحاظ سے بھی اس میدان میں ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا، معاشرت، مذہب سیاست اقتصادیات تعلیم، حکومت، تہذیب اور اخلاق کے مختلف شعبوں کے ساتھ ساتھ شیخ، واعظ، مرزا، جمّن، کلّو، بدھو، وفاتی، مولوی مدن، ہرچرن داس۔ گاندھی جی اور کرزن مہاراج سبھی ان کے دائرۂ ظرافت میں داخل ہیں۔ موضوع کے اس تنوع کے باوجود اگر ہم ان کی ظرافت کا مرکز و محور تلاش کرنا چاہیں تو چنداں دقّت نہیں ہوتی۔ کلیاتِ اکبر پر سرسری نظر ڈالتے ہی سرسید احمد خاں سامنے آجاتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ اکبر نے سرسید پر جس جس انداز سے اور جس کثرت سے اشعار کہے ہیں، کسی اور پر نہیں کہے۔ اس قسم کے اشعار جمع کرنے اور سنانے کا یہ موقع نہیں پھر بھی سرسید پر اکبر کے ماخذ کی نوعیت کو سمجھنے کے لئے چند اشعار پیش کرنا ضروری ہے۔

نئی تہذیب میں دقّت زیادہ تو نہیں ہوتی　　　مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایماں نہیں جاتا

یہی بہتر علی گڑھ جا کے سیّد سے کہوں　　　مجھ سے چندہ لیجئے، مجھ کو مسلماں کیجئے

نئی تہذیب میں بھی مذہبی تعلیم شامل ہے　　　مگر یونہی کہ گویا آبِ زمزم مے میں داخل ہے

نظر ان کی رہی کالج کے بس علمی فوائد پر　　　گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

سیّد اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کر دیا کعبہ کو گم اور کلیسا نہ ملا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگِ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

طفلِ دل محوِ طلسمِ رنگِ کالج ہو گیا
ذہن کو تپ آ گئی مذہب کو فالج ہو گیا

کالج میں دھوم مچ رہی ہے پاس پاس کی
عہدوں سے آ رہی ہے صدا دور دور کی

کالج و اسکول و یونیورسٹی
قوم بیچاری اسی میں مر مٹی

دلا دے ہم کو بھی صاحب سے لوائلٹی کا پروانہ
قیامت تک رہے سید ترے آنر کا افسانہ

ابتدا کی جناب سیّد نے
جن کے کالج کا اتنا نام ہوا
انتہا یونیورسٹی پہ ہوئی
قوم کا کام اب تمام ہوا

اکبر نے ان اشعار میں سرسیّد کی ذات یا ذاتی صفات کو نہیں بلکہ ان کی تحریک علی گڑھ کے بعض نتائج و اثرات کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ علی گڑھ تحریک چونکہ ایک ہمہ گیر تہذیبی و تعلیمی تحریک تھی اس لئے برصغیر کی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے اچھے یا برے اثرات سے محفوظ نہ تھا، سائنس۔ سائنسی آلات کے اثرات۔ حکومت و قیادت کی روایات۔ مجلسی آداب و اخلاق، مذہبی عقائد و خیالات طریقۂ تعلیم و تدریس اور علوم و فنون سبھی اس تحریک سے متاثر ہوئے تھے۔ اس لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ اکبر سرسیّد کا ذکر کرتے اور ان چیزوں کو نظر انداز کر دیتے چنانچہ انھوں نے ان مسائل پر رائے زنی کی ہے اور بار بار کی ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اکبر رجعت پسند یا تنگ نظر تھے سرسیّد و علی گڑھ تحریک کے دشمن تھے کسی طرح درست نہیں ہے۔

اکبر نے سائنس، عقلیت اور علم و فن کا مذاق فی نفسہ اڑایا ہی نہیں۔ ہاں سرسیّد دینی اصلاح کے لئے ان کا استعمال جس طرح کر رہے تھے اس کا مذاق انھوں نے ضرور اڑایا ہے اکبر نہ تو سیاسی و تعلیمی جدوجہد کو بیکار سمجھتے تھے، نہ بیجا توکل و قناعت کا پرچار کرتے تھے اور نہ سعی و عمل کو کارِ لایعنی خیال کرتے تھے۔ سعی و عمل کے بارے میں تو سرسید اور ان کے درمیان کوئی اختلاف رائے تھا ہی نہیں۔ انیسویں صدی عیسوی کے مسلمان اقتدار چھن جانے کے بعد جس بے بسی و بے عملی کا شکار تھے اس کا اظہار اکبر، سرسیّد، حالی، نذیر احمد سبھی نے ایک جگہ نہیں جگہ جگہ کیا ہے۔ تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ اکبر کا ایک منظوم لطیفہ سن لیجئے۔

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر　　مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس

یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں　　نہ جائیں گے ولیکن سعی کے پاس

کہا مجنوں سے یہ لیلیٰ کی ماں نے　　کہ بیٹا تو اگر کرلے ایم اے پاس

تو فوراً بیاہ دوں لیلیٰ کو تجھ سے　　کجا عاشق، کجا کالج کی بکواس

بڑی بی آپ کو کیا ہو گیا ہے　　ہرن پہ لادی جاتی ہے کہیں گھاس

یہی ٹھہری جو شرطِ وصلِ لیلیٰ　　تو استعفیٰ مرا باحسرت و یاس

اگر آپ اسے واقعی صرف لطیفہ خیال کرتے ہیں تو ایک رُباعی اور سن لیجئے ؎

بے سود ہے گنج و مال و دولت کی تلاش　　ذلت ہے دراصل جاہ و شوکت کی تلاش

اکبر تو سرورِ طبع کو علم میں ڈھونڈ　　محنت میں کر سکون و راحت کی تلاش

اور اگر اسے بھی محض شاعری سمجھتے ہیں تو اس سلسلے میں ان کے وضاحتی بیان پر نظر ڈالتے چلئے، کہتے ہیں :-

"ہماری قوم اس قدر غافل و مجہول ہو چکی ہے کہ اگر میں مسلمانوں کو دو روپے کی تمدنی یا مذہبی کتاب پڑھنے کو دوں اور اس کتاب کے مفید ہونے کا یقین بھی دلا دوں تب بھی وہ پڑھنے پر تیار نہ ہونگے اور یہی سبب ہے کہ میں اپنے کلام کو ظرافت کی چاشنی سے مرغوب تر بنا دیتا ہوں، تاکہ لوگ ہنس کر متوجہ ہوں اور پھر غور کریں"[1]

اکبر نے اس طرح کا اظہار خیال ایک جگہ نہیں سینکڑوں جگہ کیا ہے۔ اس لئے یہ خیال کرنا کہ وہ سعی و عمل کے قائل نہ تھے یا بے جا توکل و قناعت اور مریض و مجہول روحانیت کا پرچار کر رہے تھے کسی طرح درست نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو وہ خود سعی و عمل کی تلقین کیوں کرتے۔ خدا انگریزی کیوں پڑھتے۔ عشرت کو انگلستان اعلیٰ تعلیم کے لئے کیوں بھیجتے اور مسلمانوں کی بے بسی پر آنسو کیوں بہاتے۔

حقیقتاً اکبر کو سرسید اور علی گڑھ تحریک سے بھی کوئی دشمنی نہ تھی ایک مصلح کی حیثیت سے وہ ان کے دشمن ہو بھی کیسے سکتے تھے، دونوں نیک نیتی سے قومی فلاح کے آرزو مند تھے۔ دونوں چاہتے تھے کہ مسلمان بے عملی، تنگ نظری اور جہالت سے نجات پاکر، غیور، وسیع النظر اور صاحب عمل بن جائیں۔ اصلاح قوم کے سلسلے میں دونوں کی نظر ایک ہی منزل پر تھی، ہاں منزل تک پہنچنے کی راہیں الگ الگ تھیں تو سرسید اور ان کی تحریک علی گڑھ کے زیر اثر مغرب سے مرعوبیت، اپنی چیزوں سے نفرت مذہب و اخلاق سے بیگانگی، ابن الوقتی، خود فراموشی اور مغرب کی کورانہ تقلید کا جو رجحان عام ہو رہا تھا اکبر اسے پسند نہ کرتے تھے یہ خیال بھی غلط ہے کہ اکبر کو علوم جدیدہ، عقلیت اور سائنس سے کد بھی تھی۔ ایسا نہیں ہے سرسید احمد خاں ان کے ذریعے اصلاح دین کا فرض جس طرح ادا کرنا چاہتے تھے اسے البتہ وہ مستحسن خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جس شدت کے ساتھ سرسید نے دینی امور اور مذہبی عقائد میں عقلیت و سائنس کی مداخلت روا رکھی اسی شدت کے ساتھ اکبر نے ان کے اس رویے کی مخالفت کی۔ بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی شاعرانہ قوت زیادہ تر اسی کام میں صرف ہوئی۔

اکبر، سرسید کے خلوص اور جذبۂ ایثار و عمل کے قائل تھے۔ ان کے ذاتی اوصاف کا اعتراف انھوں نے کئی جگہ اس طور پر کیا ہے۔

---

[1] علی گڑھ میگزین ص ۱۲۰

واہ رے سیّد پاکیزہ گہر کیا کہنا　　　یہ دماغ اور حکیمانہ نظر کیا کہنا
قوم کے عشق میں پرسوز جگر کیا کہنا　　　ایک ہی دھن میں ہوئی عمر بسر کیا کہنا

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا　　　نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر　　　خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

ذاتی خوبیوں کے اس اعتراف کے باوجود سرسید نے قومی و دینی اصلاح کے لیے جو طریقۂ کار اختیار کیا تھا اس سے وہ متفق نہ تھے۔ بقول شیخ جتنی نیک نیتی سے سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان زندہ رہیں، اتنی ہی نیک نیتی سے اکبر کی یہ کوشش تھی کہ مسلمان، مسلمان رہ کر زندہ رہیں۔ رشید احمد صدیقی کے لفظوں میں "سرسید کی نظر مسلمانوں کی معاشی پستی اور تعلیم سے بیگانگی پر تھی، وہ سمجھتے تھے کہ یہ دونوں درست ہوگئیں تو اور خود بخود درست ہو جائیں گی، شکستہ دل اور شکستہ قومیں تب ہی سے امن و تجارت کی طرف بڑھتی ہیں تو ہر رہنما کی پالیسی وہی ہوتی ہے جو سید کی تھی۔ آباد کاری کی پہلی منزل یہی ہے۔ اکبر بھی مسلمانوں کی تعلیمی و معاشی زبوں حالی سے پوری طرح آشنا تھے اور ان سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن ایک اعتبار سے سرسید سے آگے دیکھتے تھے اور ان سے زیادہ دیکھتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ علی گڑھ کو مغرب کی پیروی آنکھ بند کرکے نہ کرنی چاہیئے اور مغرب کی برکات سے فائدہ اٹھانے میں خود اپنی میراث کی طرف سے غفلت برتنا مناسب نہ تھا۔ میں یہ نہیں مانتا کہ اکبر علی گڑھ اور سرسید تحریک پر کسی تنگ نظری یا رجعت پسندی کی بنا پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ ان کی نظر قوم کی میراث پر بھی تھی اور قوم کی تقدیر پر بھی، قوم کی میراث قوم کی تقدیر سے علیحدہ نہیں کی جاسکتی۔ حالی اور اقبال دونوں اسے مانتے تھے"

دونوں کے اصلاحی نقطۂ نظر کا یہ فرق بظاہر کوئی فرق نہیں ہے لیکن غور کریں تو بہت بڑا فرق ہے۔ اسی فرق نے تو اکبر کو سرسید کے ساتھ قدم ملا کر چلنے سے باز رکھا۔ گویا اکبر کو سرسید تحریک کے صرف ایک حصے سے جس میں مذہبی امور و اقدار کو سائنس کے اصول و تجربات کے عین مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی تھی، اختلاف تھا اور یہ اختلاف ذاتی نہیں اصولی تھا۔ کلی نہیں جزوی تھا۔ وہ سرسیّد کی تحریک اصلاح کی معاشی و تعلیمی افادیت کو محسوس کرتے تھے۔ لیکن سرسید مذہب اور سائنس کے درمیان جس طرح کا سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے اکبر اسے پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی ان کے سامنے سرسید کی تحریک اصلاح کو من و عن قبول کرنے کا سوال آیا تو انھوں نے اپنا نقطۂ نظر اس طور پہ واضح کردیا کہ۔

سید صاحب سکھا گئے ہیں جو شعور　　　کہتا نہیں میں تم رہو اس سے نفور
سوتوں کو جگا دیا انھوں نے لیکن　　　اللہ کا نام لے کے اٹھنا ہے ضرور

تہذیب وہ ہے کہ رنگ مذہب بھی ہو　　　آزاد وہ ہے کہ جو مؤدب بھی ہے
تزئین وہ ہے کہ خاکساری ہو ساتھ　　　اسپیچ وہ ہے کہ یارب بھی ہو

تم شوق سے کالج میں پھلو پارک میں پھولو　　　جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو

لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا ہے یاد　　اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

اصلاح مذہب کے باب میں بھی سر سید اور اکبر کے باہمی اختلاف کی نوعیت ان کے معاصر مولویوں سے بہت مختلف تھی۔ اسی لئے اصلاح دین کے طریقۂ کار کے اختلاف کے باوجود انھوں نے نہ سر سید کی ذات و صفات کو کبھی طعن و طنز کا نشانہ بنایا۔ نہ ان پر رکیک حملے کئے، نہ اپنے عہد کے بعض تنگ نظر مولویوں کی طرح انھیں نے انگریزی پڑھنے کو حرام قرار دیا نہ مغربی تعلیم کو ملکی و قومی ترقی کے لئے مہلک خیال کیا، نہ علی گڑھ کالج کو گمراہی و ضلالت کا مرکز سمجھا، نہ سر سید اور ان کے ساتھیوں کو بے دین و بے عقیدہ ٹھہرایا اور نہ کبھی ان کو کافر یا دہریہ کہہ کر ان پر جنت کے دروازے بند کئے۔ یہی نہیں سر سید اور علی گڑھ کالج کے خلاف بے عمل اور تنگ نظر مولویوں نے جو ہنگامہ برپا کر رکھا تھا اسے بھی وہ پسند نہ کرتے تھے انھیں سر سید کی نیک نیتی اور مولویوں کی تنگ نظری کی پوری خبر تھی، تبھی تو کہتے تھے کہ اللہ میاں، سر سید کو بخش دیں گے لیکن مذہب کے اجارہ دار مولوی انھیں نہ چھوڑیں گے۔ کیا خوب کہا ہے۔

مر کے چلے جو سوئے جنت سید　　لٹھ لے کے امام ابو حنیفہ دوڑے

مولوی صاحب نہ چھوڑیں گے خدا گر بخش دے　　گھیر ہی لیں گے پولس والے سزا ہو یا نہ ہو

ان امور سے اندازہ ہوتا ہے کہ اکبر کا اس رجعت پسند مولویانہ ذہنیت سے کوئی تعلق نہ تھا جو روایت پرستی و تقلید محض کے سوا زندگی کے کسی شعبہ میں درایت اور اجتہاد کو قبول نہ کرتی تھی۔

بعض ناقدین ایک اور سبب سے اکبر کو رجعت پسند اور مجہول روحانیت کا علمبردار سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں سر سید جس تہذیبی انقلاب کی پیش گوئی و رہنمائی کر رہے تھے۔ وہ تقاضائے وقت کے عین مطابق اور اکبر اس کو روکنے کے لئے جو کچھ کر رہے تھے وہ تقاضائے وقت کے یکسر منافی تھا اور اسی لئے سر سید اپنے مشن میں کامیاب اور اکبر ناکام رہے، کامیابی اور ناکامی کا ذکر بعد میں آئے گا، اس جگہ ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری ہے۔ سر سید مغرب کے زیر اثر جس انقلابی دھارے کا ساتھ دے رہے تھے۔ اکبر اسے روکنے کے لئے نہیں صرف اس کا زور کم کرنے اور اس میں اعتدال و توازن پیدا کرنے کے لئے اُٹھے تھے۔ سر سید کی طرح وہ بھی سرکاری ملازم تھے۔ جج کے عہدے پر فائز تھے۔ مسلمانوں کی معاشی بدحالی اور سیاسی بے بسی کے ساتھ ساتھ مغرب کی مادہ پرست ذہنیت، اس کے تعصبات اور سیاسی منصوبے سب پر ان کی نظر تھی، مغربی تہذیب و تعلیم سے ہر پہلو کو آنکھ بند کر کے قبول کرنے کے جو خطرناک نتائج مرتب ہو رہے تھے یا ہونے والے تھے وہ بھی ان کی نگاہ سے پوشیدہ نہ تھے۔ انھیں مشرق کی بے بسی اور مغرب کے پنجۂ اقتدار کی قوت دونوں کا پورا اندازہ تھا۔ اچھی طرح جانتے تھے کہ جو کچھ ہونے والا ہے نہ وہ ان کے روکے رک سکتا ہے اور نہ وہ خود اس کے اثر سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ تبھی تو کہتے تھے۔

مفر نہیں ہے ہمیں خانقاہِ سید سے　　قفس میں ہیں تو اس اڈے کو چھوڑ جائے کہاں

حضرت واعظ سے اب یہ قوم زندہ ہو گئی　　اتنے مُردوں کو مسیحا بھی جلا سکتے نہیں

شعر اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب　　یہ اسے معلوم ہے تلّی نہیں آئی ہوئی

یہی نہیں اس انقلاب کے ہاتھوں، مشرقی تہذیب و ادب کے لئے جو مستقبل مقدر ہو چکا تھا۔ اس کی تفصیل بھی انھوں نے اپنی ایک غزل میں اس طور پر بیان کر دی ہے ؎

یہ موجودہ طریقے راہیِ ملکِ عدم ہوں گے　　نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے
نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی　　نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہوں گے
نہ خاتونوں میں رہ جائے گی یہ پردے کی پابندی　　نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہوں گے
بدل جائے گا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے　　نئی صورت کی خوشیاں اور نئے اسبابِ غم ہوں گے
خبر دیتی ہے تحریکِ ہوا تبدیلِ ملت سے　　نیا کعبہ بنے گا، مغربی پتلے صنم ہوں گے
بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلیدِ مغرب کے　　مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال و بے سم ہوں گے
ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی　　لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہوں گے
بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں　　زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہوں گے
کسی کو اس تغیر کا نہ حس ہوگا نہ غم ہوگا　　ہوئے جس ساز سے پیدا اسی کے زیر و بم ہوں گے
گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے　　کتابوں ہی میں دفن افسانۂ جاہ و حشم ہوں گے
تمھیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبر　　بہت نزدیک ہیں وہ دن نہ تم ہوگے نہ ہم ہوں گے

اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ اکبر جو کچھ کہہ رہے تھے، نتائج سے بے خبر ہو کر کہہ رہے تھے۔ خود کہنے والے کی بے خبری کا پتہ دیتا ہے۔ سرسید کی کامیابی اور اکبر کی ناکامی کا تصور بھی، تاریخی شعور کی کمی اور برصغیر زندگی پر سرسید اور اکبر کے اثرات سے بے خبری کا نتیجہ ہے۔ سرسید ایک انقلاب لانا چاہتے تھے لاکر رہے، اکبر اس انقلاب کے زور کو کم کرنا چاہتے تھے، کم کرکے رہے، ظاہر ہے کہ اپنے اپنے مشن میں دونوں کامیاب رہے اور دونوں کے مشن سے ہماری تہذیبی و سیاسی زندگی متاثر ہوئی ہے، بلکہ اگر ہم برصغیر کی سیاسی و ملی تحریکوں اور تعلیمی و تہذیبی تنظیموں کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ ان پر جتنا گہرا اثر اکبر کے مسلک کا ہے۔ سرسید کے مسلک کا نہیں ہے۔ مولانا شبلی۔ حالی۔ علامہ اقبال، مولانا حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں۔ مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر اور سلیمان ندوی۔ جنھوں نے مسلمانوں کے دینی و ملی شعور پر گہرا اثر ڈالا ہے سب کے سب سرسید سے کہیں زیادہ اکبر کے خیالات سے متفق و متاثر ہیں۔ یہ مانا کہ ادب، علم و ادب اور ملت و مذہب کے جن مصلحین کے نام لئے گئے ہیں وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ خلفاء سرسید کے تربیت یافتہ ہیں لیکن یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ اس تربیت کا اثر مثبت انداز میں نہیں منفی انداز میں ہوا ہے۔

جن لوگوں نے سرسید، ان کے رفقاءِ کار اور اکبر کے اصلاحی خیالات کا گہرا مطالعہ کیا ہے، ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ ان بزرگوں کے اساسی خیالات میں اتنا فرق نہ تھا جتنا کہ ان کے ناقدین نے بعد کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا اور اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ بعض لوگ اکبر کو سرسید اور ان کی تحریک کا مخالف سمجھنے لگے۔ قومی اصلاحی اور تعلیمی اشاعت کے باب میں تو اتنا بھی جانتے ہیں کہ علی گڑھ کے قیام سے سرسید کا مقصد ہرگز یہ نہ تھا کہ مسلمان قوم میں صرف چند انگریزی داں افسران پیدا ہو جائیں بلکہ ان کے پیش نظر علی گڑھ کالج کے ذریعے ایسے لائق افراد پیدا کرنا تھا .... جو اپنے

اندر مسلمانوں کے روشن مستقبل کے لئے دھڑکتا ہوا دل رکھتے ہوں اور اپنے فکر و عمل کے ذریعے انگریز اور ہندو کے مشترک سیاسی اور اقتصادی حملوں سے مسلمانوں کو ہمیشہ ہمیشہ کیلئے نجات دلا سکتے ہوں اور مسلمانان پاک و ہند کے تہذیبی و ثقافتی ورثے کو نہ صرف محفوظ رکھ سکتے ہوں بلکہ اس میں اضافہ کر سکتے ہوں۔ لیکن جب علی گڑھ، اس مقصد کو پورا کرتا نظر نہ آیا تو ایک اکبر کیا، خود سرسید اور ان کے رفقائے کار اپنی محنت کو رائیگاں خیال کرنے لگے تھے۔ سنہ ۱۸۹۴ء میں جالندھر کے ایک جلسے میں سرسید احمد خاں نے جب یہ کہا تھا کہ :۔

"اے دوستو ہماری پوری تعلیم اس وقت ہوگی جب کہ ہماری تعلیم ہمارے ہاتھ میں ہوگی یونی ورسٹی کی غلامی سے ہم کو آزادی ہوگی، ہم اپنی تعلیم کے مالک ہوں گے اور بغیر یونی ورسٹی کی غلامی کے ہم اپنی قوم میں علم پھیلائیں گے، فلسفہ ہمارے داہنے ہاتھ میں ہوگا، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ لا الٰہ کا تاج سر پر، یونیورسٹی کی تعلیم ہم کو نجر بناتی ہے۔"

تو بے سبب نہیں کہا تھا۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی روش کو دیکھ کر اور وہاں کی تعلیم و تربیت کے بعض مضر اثرات کو ذہن میں رکھ کر کہا تھا اور علی گڑھ کے مستقبل سے مایوس ہو کر کہا تھا۔

بقول مولانا الطاف حسین حالی، جب سید محمود ولایت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے واپس آئے اور ان کا تقرر ہائی کورٹ کی ججی پر ہو گیا تو سرسید احمد خاں نے بارہا یہ بات کہی کہ :۔

"میرا جو اصل مقصد سید محمود کی تعلیم سے تھا وہ حاصل نہ ہوا۔ سید محمود ملازمت کے صیغے میں چاہے کتنی ہی ترقی کر جائیں مگر قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہنچ سکتی۔"

سرسید احمد خاں نے علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کا رونا ایک جگہ نہیں بار بار رویا ہے، بلکہ آخری زندگی میں وہ صرف اس لئے مغموم رہتے تھے کہ انھوں نے علی گڑھ میں تعلیم کا جو درخت لگایا تھا اس نے وہ پھل نہ دیا جس کی ان کو توقع تھی۔ تب ہی تو سنہ ۱۸۹۰ء کے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"تعجب یہ ہے کہ جو تعلیم پاتے ہیں اور جن سے قوم کی بھلائی کی امید تھی وہ خود شیطان اور بدترین قوم بنتے جاتے ہیں۔"

مولانا شبلی تو خیر اکبر کی طرح، علی گڑھ کی تعلیم سے بہت پہلے بدظن ہو چکے تھے اور چند سال بعد ہی سنہ ۱۸۸۳ء میں صاف صاف لکھ دیا تھا کہ :

"معلوم ہوا کہ، انگریزی خواں قوم نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دیجئے۔ خیالات کی وسعت۔ سچی آزادی، بلند ہمتی اور ترقی کا جوش برائے نام ہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر ہی نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلونوں کی نمائش ہے۔"

لیکن خود حالی فرماتے ہیں کہ :۔

"چھبیس برس کے تجربے سے ان (سرسید) کو اس قدر معلوم ہو گیا تھا کہ انگریزی زبان میں بھی ایسی تعلیم ہو سکتی ہے جو اسی زبان کی تعلیم سے بھی زیادہ نکمی فضول اور اصل لیاقت پیدا کرنے سے قاصر ہو۔"

اسی طرح مولوی عبدالحق صاحب حالی کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ،

"جدید تعلیم کے بڑے حامی تھے اور اس کی اشاعت اور تلقین میں مقدور بھر کوشش کرتے رہتے تھے، آخری عمر میں ہمارے کالجوں کے طلبہ کو دیکھ کر انھیں کسی قدر مایوسی ہونے لگی تھی ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب ان کے نام حیدرآباد میں ایک روز اولڈ بوائے آیا تو اسے پڑھ کر بہت افسوس کرنے لگے ۔ اس میں سوائے مسخر ذہن کے کچھ نہیں ہوتا ۔"

ان بیانات سے اندازہ ہوا ہوگا کہ سرسید، انکے رفقاء اور اکبر کے خیالات میں کچھ زیادہ تفاوت نہیں ہے صرف یہ کہ اکبر نے جس چیز کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا سرسید اور ان کے رفیقوں کی نظر اس تک بعد کو پہنچی ۔

اس کے بعد بھی سرسید کو ترقی پسند اور اکبر کو رجعت پسند کہنے کا سوال باقی رہتا ہے تو جو لوگ کسی غلط فہمی کی بنا پر ایسا کہتے ہیں۔ ان کے لئے سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اگر ڈپٹی نذیر احمد، مولانا شبلی، مولانا حالی، حسرت، جوہر، اقبال، سلیمان ندوی اور مولانا ظفر علی خاں رجعت پسند تھے تو یقیناً اکبر بھی رجعت پسند تھے، لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اگر اس طرح کے دو چار رجعت پسند بھی کسی ملک وملت کو میسر آجائیں تو پھر اس کی رہنمائی کے لئے کسی ترقی پسند کی ضرورت باقی نہیں رہتی، البتہ وہ لوگ جو اپنے ذاتی رجحان یا سیاسی مصلحت کی بنا پر کسی کو رجعت پسند اور کسی کو ترقی پسند کہتے رہتے ہیں، ان سے ہمیں کچھ نہیں کہنا، اس لئے کہ جو لوگ کل تک اکبر کو رجعت پسند اور سرسید کو انیسویں صدی کا مجدد خیال کرتے تھے، وہی آج سرسید اور ان کی تحریک علی گڑھ کو طبقاتی منافرت، سیاسی تنگ نظری اور انگریز پرستی کا علمبردار ٹھہراتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ سرسید اور ان کی تحریک علی گڑھ کے ڈانڈے تحریک پاکستان اور قیام پاکستان سے جا ملتے ہیں

اکبر الٰہ آبادی کے خطوط نیاز فتحپوری کے نام

(۱)

الٰہ آباد

۲۶ ر نومبر سنہ ۱۹۱۳ء

عزیزم مکرم ۔ سلمہ اللہ تعالیٰ ، اکثر صاحبوں نے ارادے ظاہر کئے ۔ شاید اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے لئے یہ خدمت تجویز فرمائی ہے ۔ زمانہ اور "مخزن" نے ریویو لکھے مگر پولیٹیکل خیال سے ۔ اگرچہ میں کیا اور میرے شعر کیا ! لیکن آپ کو مجھ سے محبت ہے اور آپ خود قابلیت اور سخن گوئی اور سخن فہمی میں استاد ہیں لہٰذا کچھ تعجب نہیں کہ آپ میرے اشعار کی قدر افزائی فرمائیں ، ان روزوں میں سخت پریشان رہتا ہوں ۔ دنیا سے بالکل دل برداشتہ ہوگیا ہوں ۔ آپ نے لکھا ہے کہ جواب آئے تو شاید سکون ہو ، جواب تو حاضر ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ آپ کے دل کو سکون ہو ۔ دل مضطرب ہی اچھا آپ میرے ساتھ اس حالت میں ہمدردی کر سکیں گے ۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا ۔ دعا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ اطمینان نصیب کرے اور آپ خوش رہیں ، بیشک اس وقت حالت بہت نازک ہو رہی ہے اپنا حال لکھتے رہئے میرا حال اس مطلع سے ظاہر ہے شاید آپ سن چکے ہیں ، نو تصنیف ہے ؎

جب یہ دیکھا کہ جہاں میں کوئی میرا نہ رہا
شدتِ یاس سے میں آپ بھی اپنا نہ رہا

پرسوں شب کو چند اشعار ذہن میں آئے ، لکھ تو لئے لیکن ہنوز نہ تو کہیں بھیجے نہ بھیجنے کا فیصلہ کیا ، خیال کیا کہ آپ کو لکھ بھیجوں ۔ پرائیویٹ اطلاع کے لئے یہ بھی نہیں جانتا یہ کیسے شعر ہیں کیونکہ میں منتشر الحواس ہوں ۔

ہادن تو ہے ہاؤس کا دستہ ہے ہال کا
لیکن ادھر تصور جاتا نہیں کسی کا

ہے کوفت لیکن اس پہ مسرور ہو رہے ہیں
ہر سو اچھل رہے ہیں اور چور ہو رہے ہیں

اس قبلہ رو جماعت کا انتشار دیکھو
اس باغ میں خزاں کی اکبر بہار دیکھو

لکھتا ہے کلکِ حسرت مسلم کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

(اکبر)

(۲)

الٰہ آباد

۵ ر مئی سنہ ۱۹۱۴ء

عزیزی و محبی ، سلمہ اللہ تعالیٰ ۔ آپ کہاں ہیں ؟ کیسے ہیں ؟ کیا شغل ہے ؟ آپ کی خیریت ایڈیٹر "مساوات" سے میں نے دریافت کی تھی ، انھوں نے پتہ بتایا ۔ میں اپنا حال کیا لکھوں ؎

ان مصائب میں بھی مایوس نہیں ہوں اکبر
قیدِ ہستی سے رہائی کی خوشی باقی ہے

خاکسار ، اکبر

ہمارے کلچر کا شاعر

(ڈاکٹر ابواللیث صدیقی)

اکبر الٰہ آبادی کے ظریفانہ اشعار لوگ اکثر پڑھتے ہیں۔ خود ہنستے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے ہیں، یہ اس لئے کہ دوسروں کی ہنسی میں شریک ہونا آسان ہے۔ لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو اکبر کے دردوالم کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوں اور جن کو اکبر کی مسکراہٹ میں آنسو اور ان کی ہنسی میں سسکیاں سنائی دیتی ہیں۔ یہ آنسو اور سسکیاں ایک ایسے شخص کی ہیں جسے اپنا وجود خطرے میں محسوس ہو رہا تھا۔ جو حیات ملی کے سفینے کو ایک بھنور میں پھنسا دیکھ کر مضطرب تھا، وہ ہاتھ پیر مارتا تھا لیکن طوفان کے مقابلہ میں اس کے کمزور دست و بازو کام نہ دیتے تھے وہ دوسروں کو مدد کے لئے پکارتا تھا، لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آتا تھا۔ وہ ایک آنے والے طوفان سے خبردار کرتا تھا اور کوئی اس کی پکار پر کان نہ دھرتا تھا۔

یہ طوفان ایک ذہنی اور تہذیبی انقلاب تھا جس کے آثار تو پہلے سے پیدا ہو چلے تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد اور برصغیر ہند و پاک میں برطانوی تاج کے سلسلے میں امن و امان کے قیام اور استحکام نے اسے اور زور بخشا تھا۔ اس طوفان کی زد میں صرف سیاست اور حکومت، تجارت اور صنعت و حرفت ہی نہ تھی۔ ایک پوری قوم کا کلچر تھا۔ کلچر جسے انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اصل اور اساس سمجھنا چاہئے۔ کلچر کوئی ایسا لباس نہیں کہ اسے جب چاہیں پہن لیں اور جب چاہیں اتار پھینکیں اور کوئی نیا لباس زیب تن کرلیں اور جو لوگ اس طرح لباس بدلنے کے رسیا ہوتے ہیں۔ ان کے نزدیک کلچر کی اہمیت ظاہر ہے۔ انیسویں صدی کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ۔ برصغیر ہند و پاکستان کے مسلمانوں کا بالخصوص اور دوسری اقوام کا بالعموم کلچر خطرہ میں تھا۔ انگریزوں کا مقصد یہ تھا کہ اس ملک میں ایک ایسی قوم پیدا کی جائے جو رنگ کی تو کالی ہو لیکن جس کے سوچنے کا انداز جس کے اقدار کا تصور مغربی سانچے میں ڈھلا ہو کیونکہ ایسی ہی قوم مغرب کی مستقل غلامی کے لئے آمادہ کی جاسکتی تھی۔ اس تحریک کو فروغ دینے کے لئے ایک ذریعہ تعلیم تھا۔ سیاسی اور ملکی انتشار کی طویل صدیوں نے مسلمانوں کے نظام تعلیم کو اس کی فعالی اور افادی اہمیت سے محروم کردیا تھا۔ اور ایک طرح کا ذہنی خلا پیدا ہوگیا تھا۔ نئی تعلیم اس خلا کو پُر کرنے کے لئے آئی۔ بلاشبہ اس جدید تعلیم نے ہمیں انیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے آغاز تک اپنے عہد کی بہت سی نعمتوں سے روشناس کرایا۔ نئے علوم کے دروازے ہم پر کھلے، وسعت فکر کے لئے راہیں ہموار ہوئیں۔ جدید ایجادات اور انکشافات تک ہماری رسائی ہوئی اور کسی حد تک سیاسی بیداری کی تحریک کو بھی اس سے تقویت پہنچی۔ لیکن ان سب کی نفی مغرب پسندی اور مغرب پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے ہوگئی۔ اس سیلاب نے صدیوں کی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا اور اپنے کلچر پر سے ہمارا اعتماد اٹھ گیا۔ یہی المیہ تھا جو اکبر کی شاعری کا موضوع ہے اور میرے خیال میں اس اعتبار سے اکبر اکیلا ایسا شاعر ہے جسے ہم اپنے کلچر کا شاعر کہہ سکتے

ہیں جو شاعر یہ شعر لکھے ؎

کس سے میں پوچھتا گل و بلبل کی سرگزشت دو چار برگ خشک تو دو چار پر ملے

اسے صرف ظریفانہ شاعر کہنا بڑا ظلم ہوگا۔ بات دراصل یہ تھی کہ لوگ جسے قومی ترقی سمجھتے ہیں اکبر کو اس کا انجام نظر آتا تھا۔

میں نے کہا یہ اپنے خیالی خضر سے آج بتلاؤ اس روش سے ترقی کی کیا امید

ہر گام پر جو طاعت حق سے الگ پڑا ہوتے رہوگے مرکزِ قومی سے تم بعید

ہاں انتشار و جہل کی تکمیل ہوگی جب ہو جاؤگے بتانِ کلیسا کے تم مرید

شاید کہ مدعا بھی تمھارا ہے بس یہی ہر چند ابھی ہے درس کے پردہ میں ناپدید

حیرت سے مجھ کو دیکھ کے اس خضر نے پڑھا حافظ کا ایک شعر جو معنی کو تھا مفید

سِرِّ ازل کہ عارفِ سالک بہ کس نہ گفت در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید

اس المیہ کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مذہب اور روشن خیالی کو ایک دوسرے کی ضد سمجھ لیا گیا۔ شیروانی اور پاجامہ کی جگہ کوٹ اور پتلون نے لے لی۔ اور جس طرح اچکن صرف چپراسیوں کے سرکاری لباس کا جزو سمجھی جانے لگی۔ اسی طرح مذہب بھی خانساماں کے حصہ میں رہ گیا۔

جو پوچھا مجھ سے دورِ چرخ نے کیا تو مسلماں ہے میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رازِ پنہاں ہے

کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے اگر انکار کرتا ہوں تو خوفِ قہرِ یزداں ہے

بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

اکبر کو ان کے زمانے میں لوگوں نے رجعت پسند کہا اور ترقی پسندی کا یہ مفہوم قرار پایا کہ ہم اپنے مذہب، تعلیم، رسم و رواج لباس غرض ہر اس چیز کو جس کو کلچر کا جزو کہتے ہیں۔ فرسودہ سمجھنے لگیں۔ یہ اس تہذیبی زوال کا اثر تھا جس کی انتہا ہم سب نے اپنی آنکھوں سے دیکھی اور دیکھ رہے ہیں۔ اکبر ساری عمر اسی کے خلاف جہاد کرتے رہے۔ ان کی آواز کمزور تھی۔ ان کے قویٰ مضمحل تھے وہ ریلے کے بہاؤ کے خلاف ایک کمزور کشتی کی ناخدائی کر رہے تھے اور آخر میں وہ اس جہاد کی کامیابی سے مایوس ہوگئے تھے۔ ان کے یہ شعر اسی مرثیہ کا جزو ہیں ؎

یہ موجودہ طریقے راہیٔ ملکِ عدم ہوں گے نئی تہذیب ہوگی اور نئے ساماں بہم ہوں گے

نئے عنوان سے زینت دکھائیں گے حسیں اپنی نہ ایسا پیچ زلفوں میں نہ گیسو میں یہ خم ہونگے

نہ خاتونوں میں رہ جائیگی یہ پردہ کی پابندی نہ گھونگھٹ اس طرح سے حاجبِ روئے صنم ہونگے

بدل جائیگا اندازِ طبائع دورِ گردوں سے نئی صورت کی خوشیاں اور نئے سامانِ غم ہونگے

عقائد پر قیامت آئیگی ترمیمِ ملت سے نیا کعبہ بنے گا مغربی پتلے صنم ہوں گے

بہت ہوں گے مغنی نغمۂ تقلیدِ یورپ کے مگر بے جوڑ ہوں گے اس لئے بے تال و سم ہونگے

ہماری اصطلاحوں سے زباں ناآشنا ہوگی لغاتِ مغربی بازار کی بھاکا سے ضم ہونگے

بدل جائے گا معیارِ شرافت چشمِ دنیا میں زیادہ تھے جو اپنے زعم میں وہ سب سے کم ہونگے

گذشتہ عظمتوں کے تذکرے بھی رہ نہ جائیں گے کتابوں میں ہی دفن افسانۂ جاہ و حشم ہونگے

تمہیں اس انقلابِ دہر کا کیا غم ہے اے اکبرؔ — بہت نزدیک ہے وہ دن، نہ تم ہوگے نہ ہم ہونگے

اکبرؔ نہ رہے لیکن اس انقلاب کو آپ نے اور ہم نے دیکھ لیا اور اس کے اثرات اور نتائج آج بھی دیکھ رہے ہیں۔ آج ہمارا معاشرہ ان سارے مسائل سے دوچار ہے جن کی طرف اکبرؔ نے اپنے اس مرثیہ میں اشارہ کیا تھا اور جو لوگ اکبر کو رجعت پسند کہتے تھے وہ بھی سوچ رہے ہیں کہ شاید اسی "رجعت پسندی" میں ہماری نجات ہے۔

اکبر سے پہلے اکبر کے بعد

(ڈاکٹر شوکت سبزواری)

سر زند از ماضیٔ تو حالِ تو   خیزد از حالِ تو استقبالِ تو

رشید احمد صدیقی کا قول ہے کہ حالی ماضی کے شاعر ہیں۔ اکبر حال کے اور اقبال مستقبل کے اردو کے یہ تین بڑے شاعر ذہن و فکر اور نقطۂ نظر کے اعتبار سے تاریخی ارتقاء و ترتیب کی بڑی اچھی مثال ہیں۔ رشید احمد صدیقی نے ان کو زمانے کے خانوں میں بانٹنا چاہا تھا۔ کسی بڑے شاعر کو زمان و مکان کی حدود میں اس طرح قید کرنا ممکن نہیں۔ اور نہ اس کے کلام کو اتنی سختی کے ساتھ محصور و محدود کیا جا سکتا ہے شاعر زمان و مکان کی حد بندیوں سے آزاد ہوتا ہے، بقول اقبال زمانہ ایک دوران ہے جس میں ماضی حال و استقبال کی کوئی تفریق نہیں۔ حال کی جڑیں ماضی کی زمین میں پیوست ہوتی ہیں۔ اور مستقبل کی تعمیر حال کی بنیادوں پر کی جاتی ہے۔ کوئی اچھا اور بڑا شاعر ماضی سے منہ موڑ کر اور حال سے اپنا ناتہ توڑ کر مستقبل کی صحیح تعمیر نہیں کر سکتا۔ رشید احمد صدیقی نے غالباً حالی کو ماضی کا شاعر اس لئے بتایا کہ انھوں نے مسدس " مدّ و جزر اسلام " لکھی تھی جس میں مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بڑی اچھی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور اقبال کو مستقبل کا شاعر اس لئے کہا کہ اقبال کے آئینۂ گفتار میں آنے والے دور کی ایک تصویر نظر آتی ہے گو دُھندلی ہی سہی۔ اس لحاظ سے اکبر کو بجا طور پر حال کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا کلام ایک صاف و شفاف آئینہ ہے جس میں اس زمانے کی ساری تمدنی تحریکیں سیاسی انقلابات۔ مذہبی عقیدے معاشرت کے طریقے۔ اوضاع و اطوار رسوم و روایات غرض کہ سب کچھ روشن نظر آتا ہے۔ شاید اسی لئے بعض نقادوں نے اکبر کو تاریخی انقلاب کا شاعر سمجھا اور ان کے کلام کو یادگارِ انقلاب بتایا۔ خود اکبر نے بھی یہی کہا تھا ؎

شعرِ اکبر کو سمجھ لو یادگارِ انقلاب   یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی

لیکن اکبر اس سے بہت زیادہ ہیں۔ کلام اور اس کے موضوعات کی حد تک آپ انہیں جو چاہیں کہیں۔ اکبر کے فکر کی اردو ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ یوں تو وہ سلسلۂ حالی و اقبال کی درمیانی کڑی ہیں۔ ان کو اگر درمیان سے نکال لیں تو برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی ادبی و تہذیبی تاریخ کا تسلسل قائم نہیں رہتا۔ لیکن حقیقت میں اکبر ایک اساس کی حیثیت رکھتے ہیں ان کا ہندی و پاکستانی مسلمانوں سے بڑا گہرا رشتہ ہے۔ اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لئے برصغیر کی گذشتہ صد سالہ تاریخ کے اوراق الٹئے ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ اس سرزمین کے مسلمانوں کی آخری کوشش تھی جو اپنی کھوئی ہوئی عظمت واپس لانے کے لئے کی گئی تھی۔ اس میں انھیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس کا قدرتی اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ دل چھوٹ گئے اس حالت میں سرسید نے ان کے لئے ایک شمع روشن کی انھوں نے مسلمانوں کو بتایا کہ وہ نئے حالات کا جائزہ لیں اور ان کے مطابق

اپنے کو ڈھالیں، انگریز اہلِ کتاب ہے۔ مسلمانوں کی طرح خدا کو مانتا ہے۔ خدا کی شریعت پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کی اطاعت غلامی نہیں وفاداری ہے۔ مسلمانوں کی تہذیب، زبان، معاشرت اور قومی روایات زمانہ گزر جانے کی وجہ سے مردہ اور بے جان ہوگئی ہیں ان کو بندر کی کھلاڑی کی طرح سینے سے لگائے رکھنا اسلام کی روح کے خلاف بھی ہے اور سنّت اللہ (نیچر) کے خلاف بھی۔ انگریزی تہذیب میں زندگی ہے۔ اس کی معاشرت میں تازگی ہے اس کے علوم و فنون میں توانائی ہے۔ مسلمان آگے بڑھیں اور ان کو خوش آمدید کہیں، ان کے علوم پڑھیں اور اپنی رسوم و روایات کو حیاتِ تازہ بخشیں۔ سرسید کی طرف لوگ دوڑ پڑے۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان کو صرف یہی ایک روشنی نظر آئی۔

سرسید کی نیک نیتی میں شبہ نہیں، ان کی تجویز معقول سہی لیکن انھوں نے اپنی تجویز کی حدود کا پوری طرح خیال نہیں رکھا انھوں نے مسلمانوں کے لئے جو نسخہ تجویز کیا اس میں مریض کے مزاج کی رعایت نہیں رکھی۔ انھوں نے مریض کو اتنی سرد دوائیں دیں اور اتنی بڑی مقدار میں کہ اس سے نمونیہ کا اندیشہ پیدا ہوگیا۔ پروانہ روشنی کا عاشق ہے لیکن اس میں اتنا شعور نہیں کہ وہ صرف طوافِ شمع پر ہی قناعت کرے اور اسی نور و روشنی سے اپنی ہستی کو جگمگائے۔ وہ تو شمع پر ٹوٹ کر گرتا ہے اور جل کر خاکستر ہو جاتا ہے۔ سرسید ایک مصلح ضرور تھے مگر وہ یہ بھول گئے کہ ۵۷ء کے بعد کے مسلمان "کرمکِ نادان" کی طرح تھے، تقریباً سو سال کی سیاسی غلامی نے ان کے قومی شعور کی آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے وہ اپنی بصیرت کھو چکے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ مغربی تہذیب و معاشرت اور علوم و فنون کی چمک کی تاب نہ لاسکیں اور اس پر اس طرح ٹوٹ کر گریں کہ ان کی کوئی ہستی ہی نہ رہے۔

حالی نے سب سے پہلے اسے محسوس کیا انھوں نے ایک طرف مغربی رسوم و روایات اور علوم و فنون کی طرف للچائی ہوئی نظریں ڈالیں دوسری طرف وہ ماضی کی سمت بھی مڑ مڑ کر دیکھتے رہے ان کے فکر و خیال نے سرسید کی دکھائی ہوئی وسیع فضا میں دور تک چکر لگائے لیکن اس بلند پروازی میں بھی ان کے طائرِ خیال کی آنکھ برابر نشیمن پر رہی، باخبر حلقوں کا بیان ہے کہ حالی نے مسدس سرسید کے کہنے سے لکھی۔ خود سرسید نے اپنے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے کہ اگر خدا نے قیامت میں مجھ سے دریافت کیا کہ تم کیا لائے تو میں کہوں گا کہ حالی سے مسدس لکھوا لایا ہوں۔ اس سے بھی سرسید کی نیک نیتی کا پتہ چلتا ہے کہ خود انھیں یہ احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی تحریک میں توازن نہیں ہے۔ اور اگر اس میں اب بھی توازن نہ پیدا کیا گیا تو یہ تحریک آگے چل کر بڑی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔

حالی نے یہ توازن پیدا کرنے کے لئے مسلمانوں کو ان کی گزری ہوئی عظمت یاد دلائی ان کے خوابیدہ قومی شعور کو بیدار کیا، اور اس طرح مسلمان جو اپنے ماضی سے کٹ کر مغربی تہذیب و معاشرت کی طرف بڑھ رہے تھے ان کا رشتہ ماضی سے جوڑنا چاہا۔

لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک اور اتنی ہی اہم ضرورت یہ تھی کہ مسلمانوں کو تہذیبِ نو کی مضرتوں سے آگاہ کیا جائے اور انھیں مغرب کی اندھا دھند ریس سے باز رکھا جائے تاکہ وہ پروانہ کی طرح ٹوٹ کر اس پر نہ گر پڑیں، یہ کام اکبر نے کیا میں اس کو بنیادی کام سمجھتا ہوں۔ قومیں غلامی میں بصیرت کھو بیٹھتی ہیں۔ اس کا ذکر میں اوپر کر چکا ہوں۔ بصیرت سے اچھے برے کی تمیز ہوتی ہے۔ غلامی کی حالت میں ایک تو قوم کی اپنی کوئی شخصیت نہیں رہتی۔ وہ ہر بات میں دوسروں کے معیار سے ہر شے کو پرکھتی ہے۔ دوسرے بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے اس میں اتنا سلیقہ نہیں رہ جاتا کہ وہ حاکم قوم کی اچھی

چیزیں لے اور بری چھوڑ دے وہ یا تو نقل کو تکمیل تک پہنچا کر اچھی بری سب چیزیں لے لیتی ہے یا پھر صرف بری چیزوں کو اختیار کر لیتی ہے اور اچھی چیزوں کو چھوڑ دیتی ہے اس کو اقبال کی نظر سے دیکھئے جو اس سلسلے کی تیسری کڑی ہیں ان کے ہاں حالی اور اکبر کے فن اور فکر نے زیادہ بلندی پختگی اور گہرائی اختیار کر لی ہے۔ اقبال نے صاف کہا ہے۔

سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے

اکبر اقبال سے زیادہ قریب ہیں۔ اکبر کے فکر کی بنیاد اقبال کے فکر پر ہیں۔ آل احمد سرور کہتے ہیں اکبر مشرقیت کے عاشق ہیں اور اقبال قوت و توانائی کے مشرق کی توانائی اگر مشرقیت سے ہے تو اکبر بھی قوت و توانائی کے عاشق ہیں یہ غلط ہے کہ اکبر نے کسی ایک معاشرت اور تہذیب سے عشق کیا اور آخر تک وہ اس کے لئے لڑتے رہے۔ اکبر نے تو ملت سے عشق کیا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں ملت مسلم کے عاشق تھے مسلمانوں کو آزاد اور ایک ملت کی حیثیت سے زندہ دیکھنا چاہتے تھے اور یہ بات مغرب کی اندھی تقلید سے ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی تھی اس کے لئے اقبال کے الفاظ میں خودی کی پرورش درکار تھی۔ لذتِ نمود چاہیے تھی۔

اکبر کو ہمارے نئے نقادوں نے سمجھا ہی نہیں۔ کسی نے ان کو معمولی قسم کا ہنسوڑا انسان بنایا تو کسی نے ان کو قدامت پرست اور رجعت پسند ٹھہرایا۔ کسی کو ان کے یہاں عامیانہ پن اور ابتذال نظر آیا تو کسی کو محض مذاق اور چٹکلے بازی اکبر کی عظمت ان کے فکر کی عظمت میں ہے۔ ان کے نقطۂ نگاہ کی بلندی میں ہے ان کے اُس مشن میں ہے جس نے اقبال کو جنم دیا۔ اکبر نہ ہوتے تو شاید اقبال بھی نہ ہوتے۔

میر تقی کا یہ قول سرور صاحب نے نقل کیا ہے کہ سچی ظرافت کی پرکھ یہ ہے کہ وہ ہنسائے مگر ہنسی کے ساتھ فکر کو بھی پیدا کرے۔ اُدھر اکبر نے کہا ہے۔

باطل پہ نہ جاؤ حق کو سن لو کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لو

لوگوں نے اکبر کے کلام کو ہنسنے ہنسانے کا سامان سمجھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ وہ چونکے نہیں۔ وہ چونکے لیکن کانٹوں میں الجھ کر رہ گئے پھولوں تک ان کی رسائی نہیں ہوئی۔ اکبر ماضی پرست بھی نہیں۔ ان میں اور اقبال میں اس لحاظ سے کوئی فرق نہیں کہ دونوں زندگی کی بڑی اور پائیدار قدروں کو ماننے والے ہیں اقبال کے ہاں ایک مفکرانہ سنجیدگی اور گہرائی ہے اور اکبر کے ہاں جذباتیت خوش طبعی اور گہرائی۔

کوئی بڑا ہی ہٹ دھرم ہوگا جو اس سے انکار کرے کہ انگریزی تعلیم اور سرسید کی تلقین کا اثر پوری قوم پر پڑا تھا۔ وہ انگریز کی قوت اس کی تہذیب کی عظمت اور اس کی معاشرت کی برتری کے سامنے جھکنے لگی تھی۔ اکبر نے انگریز کا مذاق اڑایا اس کی تہذیب و معاشرت کی پول کھولی۔ اس کی لائی ہوئی برکتوں کے ساتھ ٹھٹول کیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ سمجھتے تھے۔

ہو اگر قوتِ فرعون کی در پردہ مرید قوم کے حق میں ہے لعنت وہ کلیم اللّٰہی

ہم اکبر کو الزام دیتے ہیں کہ وہ زوال آمادہ تہذیب کے پرستار تھے فرنگی مدنیت کی مذمت کر کے انھوں نے اپنے تصور کی خامی نظر کی سطحیت اور ذہن کے افلاس کا ثبوت پیش کیا اور ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ اقبال کا فیصلہ بھی یہی ہے۔

نظر آتے نہیں بے پردہ حقائق ان کو آنکھ جن کی ہوئی محکومی و تقلید سے کور
زندہ کر سکتی ہے ایران و عرب کو کیونکر یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لبِ گور

اکبر پر یہ اعتراض ہے کہ وہ رجعت پسند تھے۔ تقلید آبا کو بڑی چیز سمجھتے تھے۔ مغرب کے متعلق ان کے فیصلے کو ہم ایک

حجرہ نشیں کٹھ ملّا کا فتویٰ بتاتے ہیں۔ اقبال سے ہمیں عقیدت ہے اور اکبر سے نفرت اس لئے ہم اقبال کی اور اکبر کی مغرب دشمنی میں فرق کرتے ہیں، حالانکہ اقبال نے بھی وہی کہا ہے جو اکبر نے کہا ہے۔

مضمحل گردد چوں تقویمِ حیات ملّت از تقلید می گیرد ثبات
راہِ آبا رو کہ ایں جمعیت است معنیِ تقلید ضبطِ ملّت است

اکبر نے نشتر زن کا کام کیا۔ ان کے ہاتھ میں ایک نشتر ہے جسے وہ بڑی چستی اور تیز دستی کے ساتھ استعمال کرتے ہیں وہ اپنا نشتر اسی جگہ مارتے ہیں جہاں پہلے سے فاسد مادّہ موجود ہے اور شاید اس نازک اور بظاہر ناگوار کام ہی کی وجہ سے اکبر نے طنز و ظرافت کا پیرایۂ بیان اختیار کیا لیکن اس طنز سے بھی انھوں نے بقدرِ ضرورت اور اعتدال کے ساتھ کام لیا ہے۔ اکبر کے طنز میں شدت نہیں بے رحمی اور زہرناکی نہیں۔ نرمی، لطافت اور دل سوزی ہے اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان کا طنز مقصدیت کا حامل ہے۔ وہ اصلاح اور صلاح کے لئے ہے۔ ان کا نشترِ طنز اگر زہر میں بجھا ہوا ہوتا تو وہ اس سے کوئی اچھا اور مفید کام نہ لے سکتے۔

اکبر کو قدامت پرستی کا طعنہ دینے والے انھیں اس لئے رجعت پسند بتاتے ہیں کہ وہ مغرب کی نئی تہذیب سے زندگی اور قوت اخذ کرنے کو موت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ مغرب کی تہذیب مشرق کے لئے شاید نئی ہو مغرب کے لئے تو وہ ویسی ہی پرانی ہے جیسی ہماری تہذیب ہمارے لئے۔

بیشک زندگی تقلید سے نہیں تخلیق سے ہے اور بڑی چیز زندگی ہے۔ زندگی اور تقلید میں بیر ہے وہ خواہ اقارب کی یا اجانب کی۔ لیکن غلامی کی حالت میں جب قوم پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے تو اقارب کی تقلید کم از کم قومی شیرازہ بکھرنے نہیں دیتی۔ ایسے عالم میں غیروں کی نقل سے خطرناک نتائج پیدا ہوتے ہیں جن کی طرف اردو کی اس کہاوت میں اشارہ کیا گیا ہے کہ "کوّا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا"

سرسیّد کی تحریک کے بعد اگر حالیؔ و اکبرؔ نہ آتے تو برصغیر کے مسلمانوں کا کیا حال ہوتا۔ اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا حالیؔ و اکبرؔ کے بعد اقبال نے مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی حالت سدھارنے میں پیش از پیش حصّہ لیا لیکن سرسیّد کے زمانے میں مغرب پرستی کا جو دروازہ کھل چکا تھا۔ وہ آج تک کھلا ہوا ہے اور اس کے مضر اثرات آج بھی (جب کہ پاکستان وجود میں آچکا ہے) پوری قوم کے مذہبی و ملّی شعور اور اس کے اجتماعی کردار کو گھن کی طرح کھائے جا رہے ہیں۔

آج ہمارے تعلیمیافتہ طبقے کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اسے اپنے مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں، اپنی تاریخ سے ہمدردی نہیں، اپنی روایات سے محبت نہیں اور ہو بھی کہاں سے جب اسے ان سب سے واقفیت ہی نہیں۔ اپنی زبان ادب اور تہذیب کے لئے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں۔ وہ مغرب کے علمی کارناموں سے مرعوب ہے اس کی معاشرت پر ریجھا ہوا ہے۔ اور اس کی تہذیب کا سب سے بڑا قدردان ہے۔ اس قومی انتشار کی ذمہ دار وہ روایت ہے جس کا آغاز سرسیّد کے زمانے سے ہوا۔ اس کے مقابلے میں ہندو کو دیکھئے۔ اس نے مغربی علوم و فنون سے اپنے ذہن کو جلا دی اور اپنی ہزارہا سال پرانی تہذیب کو حیاتِ نو دینے کی فکر میں لگ گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اکبر صرف تقلیدِ فرنگ سے بیزار ہوتے تو مضائقہ نہ تھا وہ تو سرے سے ہر نئی چیز کے خلاف ہیں۔ مغرب کی ہر اچھی چیز سے انھیں نفرت ہے۔ سائنس فلسفہ، جدید مشینی آلات اعلیٰ مغربی تعلیم۔ ریل۔ موٹر۔ کیک۔ بسکٹ

کوٹ پتلون، نل کا پانی، بجلی کی روشنی ان میں سے کونسی چیز ہے جس سے وہ نہیں گھنیاتے۔ حقوق نسواں کے وہ مخالف تعلیم و آزادیٔ نسواں سے انہیں خدا واسطے کا بیر۔ وہ صحیح معنوں میں لکیر کے فقیر ہیں۔

اکبر کے ساتھ اس سے بڑھ کر نا انصافی نہیں ہو سکتی۔ اکبر ان میں سے کسی چیز کے مخالف نہیں وہ تو اس جذبے کے خلاف ہیں جس کے تحت لوگ مغرب کی ان برکتوں پر ٹوٹ کر گرے تھے۔ انھیں اس جذبے میں مغرب کی عظمت کا اعتراف عیاں اور اپنی صلاحیتوں کا احساس جس کا فقدان نہاں نظر آیا۔ اکبر اس اعتراف شکست و نارسائی کا گلا گھونٹنا چاہتے ہیں۔ وہ قوم میں خود اعتمادی پیدا کر کے اسے اس قابل بنا دینا چاہتے ہیں۔ کہ وہ اپنے پیروں پر خود کھڑی ہو۔ اور دوسروں کی انگلی پکڑ کر چلنا چھوڑ دے۔ اکبر نے ایک سے زیادہ مقامات پر لکھا ہے کہ میں ترقی و تعلیم نسواں کا مخالف نہیں۔ انہوں نے مغربی تعلیم کا نقطۂ نگاہ پیش کیا ہے۔ جو مادّی ہی نہیں اپیکورین یعنی شہوانی بھی ہے۔ جس میں زندگی کی اعلیٰ قدروں کو ٹھکرا دیا گیا ہے یہ ہے وہ تعلیم اور اس کا نقطۂ نگاہ جس کے اکبر مخالف ہیں،

چھوڑ لٹریچر کو اپنی زندگی کو بھول جا شیخ و مذہب سے تعلق ختم کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

ایک اور شعر ہے ؎

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

جس نے یہ شعر کہا ہے وہ تعلیم نسواں کا مخالف کبھی نہیں ہو سکتا۔

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر خاتونِ خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ذیل کے شعر میں صرف حقیقت کا اظہار ہے کہ انگریزی تعلیم کا بُرا اثر ان لڑکیوں کے اخلاق پر بھی پڑا جو ابھی نوخیز کلی کی طرح خام تھیں اور قومی و مذہبی تعلیم کی کمی نے ان کو پختہ کار نہیں بنا ڈالا تھا۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

عام طور سے اکبر کو پردہ کا حامل بتایا جاتا ہے مگر حقیقت کچھ اور ہے۔ اکبر پردے کے اتنے بڑے حامی نہ تھے جتنے کہ بے پردگی کے مخالف ہیں بے پردگی کیا ہے یہ سب جانتے ہیں اور آج بھی جب مغرب پرستی کا زہر اچھی طرح ہماری رگ و پے میں سرایت کر گیا ہے۔ ہم سب پرانے ہوں یا نئے بے پردگی کے کٹر دشمن ہیں۔ اسلام بھی حقیقت میں بے پردگی کے خلاف ہے قرآن نے اسکو "تبرّج" کہا ہے۔ جس کے معنی ہیں نمائش۔ اکبر بھی اسے تبرّج سے تعبیر کرتے ہیں۔

بحرِ آزادی میں یہ کیسا تموّج ہو گیا قاصرات الطرف کو شوقِ تبرّج ہو گیا

شمعِ انجمن اور سبھا کی پری جیسی نازک اور حسین ترکیبیں بھی ایسی بے پردگی کے اظہار کے لئے ہیں۔ ہم اکبر کے کلام کے پس منظر کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں، میں نے سطور بالا میں غلاموں کی لبصیرت کا ذکر کیا ہے کہ وہ اچھے برے اور مناسب و نامناسب کی تمیز نہیں کرتے۔ وہ ظاہری اور بالکل اوپری باتیں اختیار کر لیتے ہیں اور اصل خوبیاں یعنی بنیادی اخلاق جن سے حاکم قوم کو عروج حاصل ہوا نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے بھی اس زمانے میں یہی کیا انھوں نے مغربی تہذیب کا وہ پہلو اپنا لیا جس کا مغربی قوموں کی ترقی سے دور کا بھی تعلق نہ تھا اور اس کے اصلی خدوخال اور محاسن یکسر چھوڑ دیئے۔ اقبالؔ نے ذیل کے اشعار میں اس نکتہ کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے۔

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب　　نے ز رقصِ دخترانِ بے حجاب
محکمی او را نہ از لادینی ست　　نے فروغش از خطِ لاطینی ست
قوتِ افرنگ از علم و فن ست　　از ہمیں آتش چراغش روشن ست
علم و فن را اے جوانِ شوخ و شنگ　　مغز می باید نہ ملبوسِ فرنگ

اقبال کا آخری شعر اکبر کے کلام کی روح تک پہنچنے میں ہماری مدد کرتا ہے۔ اکبر نے ملبوسِ فرنگ یعنی کوٹ پتلون نکٹائی کی مذمت کی ہے۔ اس سے مجھے انکار نہیں لیکن اس کا مقصد جو بتایا جا رہا ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ مقصد وہ ہے جو اقبال نے بیان کیا ہے۔ یعنی اچھی اصول اور اہم چیزوں کا ترک اور ظاہری یا غیر اہم چیزوں کا اختیار۔ ذیل کا قطعہ اکبر کے نقطۂ نگاہ کی وضاحت بخوبی کرتا ہے۔

جو بات مناسب ہے وہ حاصل نہیں کرتے　　جو اپنی گرہ میں ہے اسے کھو بھی رہے ہیں
بے علم بھی ہم لوگ ہیں غفلت بھی ہے طاری　　افسوس کہ اندھے بھی ہیں اور سو بھی رہے ہیں

ذیل کے اشعار میں یہی بات دوسری طرح کہی ہے اور مغربی تہذیب کے مظاہر کوٹ پتلون بنگلہ، پاٹ اور صابون کو اس لئے بے جوڑ اور بے محل بتایا ہے کہ ان پر مٹنے والے مغربی مدنیت کی روح یعنی کردار کی بلندی اور ذہن کی روشنی سے محروم ہیں۔

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے　　بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں یہ تجھ سے پوچھتا ہوں ہندی　　یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

غلط فہمیاں بہت ہیں کہاں تک وضاحت کروں۔ خاصے اچھے اور باخبر نقادوں نے اکبر پر رسم پرستی کا الزام لگایا ہے۔ یہ غلط فہمی اس لئے ہے کہ اکبر کے خالص مزاحیہ رنگ کے اشعار کو ان کے مرکزی خیال سے الگ کر لیا گیا ہے۔ سرسید کی تحریک کے ذریعہ سے جو تعلیمی، تہذیبی علمی و ادبی قدریں ہمیں ملیں ان پر سرور صاحب بھی خوش ہیں لیکن اکبر و اقبال کی نظر سے دیکھئے تو یہ سب استعمار کا جال ہے جس میں ہم بآسانی پھنس گئے۔ اور نتیجے میں سوائے بسکٹ کے چورا اور لمیٹڈ کے بھین کے کچھ نہ ملا۔ انگریز خوش ہے مالک ایر ویلین ہے، ہندو مگن ہے۔ اس کا بڑا لین دین ہے۔

بس اک ہمیں ہیں ڈھول پول اور خدا کا نام　　بسکٹ کا صرف چورا ہے لمیٹڈ کا بھین

اکبر کی شاعری پر ایک نظر

(ڈاکٹر ممتاز حسن)

اکبر کو کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ۔ کسی نے انھیں ظرافت نگار کہا اور کسی نے مصلحِ وقت۔ حقیقت یہ ہے کہ انکی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا رنگ الگ ہے وہ یہ بھی ہیں اور وہ بھی۔ مگر نہ محض یہ ہیں نہ محض وہ۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اگر ان کے ہاں ظرافت نہ ہوتی تو لوگ اُن کی آواز پر کان بھی نہ دھرتے مگر انھیں محض ظرافت نگار کہنا اور ان کی شاعری کو مسخرا پن سمجھنا غلطی ہے۔ ان کے ہاں ظرافت کا مقام کم و بیش وہی ہے جو برنارڈ شا کے ہاں ہے۔ شاؔ نے ڈاڑھی بڑھائی۔ سُرخ کپڑے پہنے، ضلع جگت میں مہارت پیدا کی، مگر اس کا مقصد مسخرگی نہ تھا، صرف لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا تھا تاکہ ہو سکے تو باتوں باتوں میں انھیں کوئی کام کی بات بھی سنا دے۔ یہی حال اکبر کا ہے اگر خدا تعالیٰ نے انھیں ہنسنے ہنسانے کا کمال نہ بخشا ہوتا تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوتا کہ لوگ ان کی چند غزلیں اور چند نظمیں سُن کر واہ واہ کر لیتے اور بس اردو میں بے شمار شاعر ایسے ہو گذرے ہیں جو درباروں اور مشاعروں میں آئے۔ کچھ دیر اُچھلے کودے اور پھر حسبِ معمول بالائے طاق رکھ دیئے گئے۔ اکبرؔ زیادہ تر اپنی ظرافت نگاری کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ مگر ان کا غیر ظریفانہ کلام بھی مقدار اور اہمیت میں کم نہیں ہے۔ یہ کلام غزلوں اور نظموں اور متفرقات پر مشتمل ہے۔ ایک مرقع ہے جس میں مختلف رنگوں کی دلفریب آمیزش ہے جہاں عشق و محبت کے معاملات باندھے ہیں وہاں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کی بجائے داغؔ دہلوی کی روح نفسِ مضمون سے ہم کلام ہے ؂

کچھ آج علاجِ دلِ بیمار تو کر لیں — اے جانِ جہاں آؤ ذرا پیار تو کر لیں
سو جان سے ہو جاؤں گا راضی میں سزا پر — پہلے وہ مجھے اپنا گنہ گار تو کر لیں

کس ناز سے کہتا ہے شبِ وصل وہ ظالم — برہم نہ کرے گیسوؤں کو پیار تمہارا

پھر گئی آپ کی دو دن میں طبیعت کیسی — یہ وفا کیسی تھی صاحب یہ مروّت کیسی

آہ جو دل سے نکالی جائے گی — کیا سمجھتے ہو کہ خالی جائے گی

اللہ نے دی ہے جو تمہیں چاند سی صورت
روشن بھی کرو جا کے سیہ خانہ کسی کا

غمزہ نہیں ہوتا کہ اشارا نہیں ہوتا
آنکھ ان سے جو ملتی ہے تو کیا کیا نہیں ہوتا

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام
وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

تمہیں سے ہوئی مجھ کو الفت کچھ ایسی
نہ تھی ورنہ میری طبیعت کچھ ایسی
حیا کی نگاہوں نے مارا ہے مجھ کو
نہیں چتونوں کی شرارت کچھ ایسی

جو اس سرو قد سے جدائی ہوئی ہے
قیامت مرے سر پہ آئی ہوئی ہے
ہمیں نے ابھارے ہیں جوبن تمھارے
ہماری یہ آفت اٹھائی ہوئی ہے

سینے کا زخم آہ کی سختی سے چھل گیا
اچھا ہوا مزا تو محبت کا مل گیا

جہاں تصوف کی طرف مائل ہوئے ہیں تو میر درد کا پرتو نظر آتا ہے۔

سو جان سے محو رخِ جاناں ہیں تو ہم ہیں
اس آئینہ خانے میں جو حیراں ہیں تو ہم ہیں

ایک صوتِ سرمدی ہے جسکا اتنا جوش ہے
ورنہ ہر ذرہ ازل سے تا ابد خاموش ہے

نگاہ اٹھی ہے احساس ماسوا کے لئے
کہاں ہے دل ذرا روکے اسے خدا کیلئے

مری حقیقتِ ہستی یہ مشتِ خاک نہیں
بجا ہے مجھ سے جو پوچھے کوئی پتا میرا
انھیں ہے عقل جو محتاجِ غیر ہے ہر دم
مجھے ہے عشق کہ جو خود ہے مدعا میرا
غرور انھیں ہے تو مجھ کو بھی ناز ہے اکبر
سوا خدا کے سب ان کا ہے اور خدا میرا

دنیا میں ہوں دنیا کا طلب گار نہیں ہوں
بازار سے گذرا ہوں خریدار نہیں ہوں

فلسفہ ان کے ہاں مقابلتاً کم ہے۔ مگر جو کچھ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس سے ان کی ژرف نگاہی کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ فلسفیت کا مظاہرہ نہیں کرتے مگر جو کچھ کہتے ہیں۔ زندگی کی گہرائیوں میں اتر کر کہتے ہیں۔ غالب اور اقبال کو چھوڑ کر اردو کا کوئی

فلسفی شاعران سے بلند نہیں ہے ؎

نئے عنصر نہیں آتے چمن میں گل کھلانے کو — یہی ذرّے اُبھرتے ہیں یہی مٹی سنورتی ہے

جہاں ہستی ہوئی محدود لاکھوں پیچ پڑتے ہیں — عقیدے، عقل، عنصر، سب کے سب آپس میں لڑتے ہیں

عالمِ ہستی کو تھا مدِّ نظر کتمانِ راز — ایک شے کو دوسری شے کا سبب کرنا پڑا

فلسفی بھی نوحہ گر ہیں ذہن کے مقسوم پہ — پاتے ہیں معلوم کی بنیاد نا معلوم پہ

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں — ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

سمجھا تھا میں کہ وقت جو آیا گذر گیا — کہتا ہے فلسفہ کہ تجھی میں ٹھہر گیا!
کہتا ہے وقت جس کو ترا ہی ظہور ہے — دامانِ عمر تیری ہی ہستی سے بھر گیا!

ان کی شاعری کے سدا بہار باغ میں رنگ رنگ کے پھول ہیں۔ جہاں نادر الکلامی کا رنگ ہے وہاں وہ بڑے بڑے اساتذہ کے دوش بدوش ہیں۔ تشبیہیں اور استعارے تو ان کے ہاں ایسے ایسے ہیں کہ صائب اور کلیم کی یاد دلاتے ہیں ؎

پختہ طبعوں پر نہیں ہوتا حوادث کا اثر — کوہساروں میں نشانِ نقشِ پا ملتا نہیں

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی — کہیں چھپتا ہے اکبر پھول پتّوں میں نہاں ہو کر

قوتِ سیر جو حاصل ہے تو دیوار نہ بن — پنجۂ غیر میں رہتا ہے تو تلوار نہ بن

زبان پر قدرت کی ایک زندۂ جاوید مثال اکبر کی "آبِ لوڈور" ہے۔ سودا، ذوق اور مومن کے قصیدوں میں الفاظ بکثرت اور پُرشکوہ ہیں۔ نظیر اکبرآبادی اور انشا کے یہاں ایک غیر معمولی روانی ہے۔ اکبر کی "آبِ لوڈور" میں الفاظ کی بہتات اور روانی دونوں غیر معمولی ہیں۔ بہتات کا یہ عالم ہے کہ الفاظ بادل کی طرح اُڑے چلے آتے ہیں، رہی روانی سو خود آبِ لوڈور کی روانی بھی اکبر کی نظم کے تلاطمِ پُرخروش بہاؤ کے آگے کیا ہو گی۔

اچھلتا ہوا اور اُبلتا ہوا — اکڑتا ہوا اور مچلتا ہوا
روانی میں اک شور کرتا ہوا — رکاوٹ میں اک زور کرتا ہوا!
پہاڑوں پہ سر کو پٹکتا ہوا! — چٹانوں پہ دامن جھٹکتا ہوا

بپھرتا ہوا جوشش کھاتا ہوا   بگڑ کر وہ کف منہ میں لاتا ہوا
پھسلتا ہوا ڈگمگاتا ہوا!   چھلکتا ہوا لڑکھڑاتا ہوا
لپکتا ہوا دندناتا ہوا!   اُمنڈتا ہوا سنسناتا ہوا
ہواؤں سے موجیں لڑاتا ہوا   حبابوں کی فوجیں بڑھاتا ہوا

کثرت الفاظ کے باوجود اس نظم میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں ہے جسے زائد یا غیر ضروری کہا جا سکے۔ ہر لفظ ایک مستقل کیفیت کا آئینہ دار ہے اور سارے الفاظ مل کر ایک واضح تصویر پیش کرتے ہیں جسے ذہن آسانی سے محفوظ کر لیتا ہے ..... زبان کی صفائی اور بندش کی چستی اکبر کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے!   خدا کیا ہے؟ خدا ہے اور کیا ہے

پروانے کا حال اس محفل میں ہے قابلِ رشکِ اہلِ نظر   اک رات میں یہ پیدا بھی ہوا شیدا بھی ہوا اور مر بھی گیا

محفل اِن کی ساقی ان کا   آنکھیں میری، باقی اُن کا

فرمائیے اس آخری شعر کا کوئی جواب ہے؟

اکبر کی قادر الکلامی کا ایک نمایاں پہلو قافیوں کی ندرت ہے۔

پکائیں بیس کر دو روٹیاں تھوڑے سے جو لانا   ہماری کیا ہے اے بھائی نہ مسٹر ہیں نہ مولانا

نہ سن تو قرآن کا وعظ بھائی خوشی سے تقلید کیجئے کر   پھرے گا کیمپوں میں آ کے اک دن دیا سلائی کا بکس لیکر

بنج بنا کر وہ بھالیتے ہیں ہر انسان کا دل   ہیں نہایت خوشنما دو جیم ان کے ہاتھ میں

عقل نے ابھی ہی کل لالہ مجلس رائے سے   جھک کے ملنا چاہئے ہم سب کو وائسرائے سے

ایسے نادر قافیے کسی اور کے بس کی بات نہیں۔ اور ظفر علی خاں کے علاوہ جو ایک حد تک کامیاب ہیں۔ کسی اور نے کوئی قابلِ قدر کوشش بھی نہیں کی۔

اکبر کے کلام میں نفسیاتی عنصر کی بھی کمی نہیں، وہ اپنے حساس دل کے واردات تحلیلِ نفسی کا سہارا لئے بغیر الفاظ میں منتقل کر دیتے ہیں، مگر ان کی سادگی پر معنی ہوتی ہے ؎

دلِ مایوس میں کچھ شورشیں برپا نہیں ہوتیں   امیدیں اس قدر ٹوٹیں کہ اب پیدا نہیں ہوتیں

مجھی پر جب گذرتی ہے تو اب انکار کیا معنی   جو کوئی دوسرا کہتا تو مشکل سے یقین آتا

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی — ترکِ خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

اور ان سب موضوعات سے ہٹ کر جہاں محض شاعرانہ جذبہ برسرِ کار ہے، وہاں ان کے کلام میں ایک خاص لطف آتا ہے۔

بہار آئی ہے گویا اب نہ جائے گی گلستاں سے — کھلی پڑتی ہیں کلیاں بھی صبا بھی ناز کرتی ہے

حُسن ہے بے وفا بھی فانی بھی — کاش سمجھے اسے جوانی بھی

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے — خدا ہی خوب واقف ہے کہ کس پر کیا گذرتی ہے

دیکھنے والوں کو اور بھی بہت سی خوبیاں نظر آئیں گی۔ مگر ان کے کلام کی خوبیاں دیکھنے کے لئے خوردبین سے مدد لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان کے اشعار خود ہماری نگاہ اور توجہ کو اپنی طرف پھیر لیتے ہیں۔

اکبر کی غزل کو اردو شاعری کی تاریخ میں ایک خاص مقام حاصل ہے۔ ان کے استاد وحید الہ آبادی طرزِ قدیم کے شاعر تھے اکبر کے ابتدائی کلام کا رنگ بھی قدیم اور روایتی ہے۔ مگر وہ روایت کی منزل سے جلد ہی آگے گذر گئے۔ اب ان کا انداز نیا تھا۔ ظرافت سے قطع نظر ان کے تغزل میں ایک تنوع وسعت اور گہرائی ہے۔ جو انہی کا حصہ ہے وہ متقدمین اور متاخرین دونوں کی خصوصیات کے حامل ہیں۔ یوں سمجھئے کہ اردو شاعری کا قدم داغ اور امیر سے حسرت اور اصغر گونڈوی کی طرف اٹھتا ہے تو اکبر راستے میں پڑتے ہیں۔

جہاں تک ظرافت کا تعلق ہے، اکبر کی ظرافت، سادگی اور پرکاری کا ایک دلفریب امتزاج ہے اور ایک حد تک ظرافتِ محض ہے۔

انھیں شوقِ عبادت بھی ہے اور گانے کی عادت بھی — نکلتی ہیں دعائیں ان کے منھ سے ٹھمریاں ہو کر

باہم شبِ وصال غلط فہمیاں ہوئیں — مجھ کو پری کا شبہ ہوا اُن کو بھوت کا

شیخ ڈرتے ہیں کہیں دم نہ نکل جائے مرا — اُنس اس واسطے کم رکھتے ہیں یا میرے ساتھ

بتائیں ہم تمھیں مرنے کے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ہجر ہو یا وصال ہو اکبر — جاگنا ساری رات مشکل ہے

ان سے رخصت ہوا میں لے اکبر — وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر

پھرتی ہے ارض آفتاب کے گرد — بندہ چکر میں ہے جناب کے گرد

آمادگی مجھے تو رہی ہر گناہ پر فضلِ خدا سے بت ہی نہیں آئے راہ پر

بتوں کا ذکر آیا۔ تو یادش بخیر "مس" کا ذکر خیر بھی لازم ہے۔ "مس" اور "حسنِ مس" اکبر کی شاعری کا مستقل موضوع ہے ؎

ممکن نہیں اے مس ترا نوٹس نہ لیا جائے گال ایسے پریزاد ہوں اور کِس نہ لیا جائے

قصۂ منصور سن کر بول اٹھی وہ شوخ مس کیسا احمق لوگ تھا پاگل کو پھانسی کیوں دیا

وہ مس بولی میں کرتی آپکا ذکر اپنے فادر سے مگر آپ اللہ اللہ کرتا ہے پاگل کا مافک ہے

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

جو حُسنِ بت کی جگہ حکمِ مس ہوا قائم تو عشق چھوڑ کے ہم نے بھی نوکری کر لی

رات اِس مس سے کلیسا میں ہوا میں دوچار ہائے وہ حُسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار

زلفِ پیچاں میں وہ سج دھج کہ بلائیں بھی مرید قدِ رعنا میں وہ چم خم کہ قیامت بھی شہید

دل کشی چال میں ایسی کہ ستارے رک جائیں سرکشی ناز میں ایسی کہ گورنر جھک جائیں

آنکھیں وہ فتنۂ دوراں کہ گنہگار کریں گال وہ صبحِ درخشاں کہ ملک پیار کریں

اِک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد اِس خطا پر سُن رہا ہوں طعنہ ہائے دلخراش

سازِ عیش مغربی کی دل نوازی کچھ نہ پوچھ میں نے جس مس کو یہاں چھیڑا استاری ہو گئی

کیا ہی اچھی تھی وہ میری مس تہذیب پسند کبھی وسکی مجھے دیتی تھی کبھی شربت قند
ملک الموت نے ناگاہ بھری ایک زقند پارک کو چھوڑ کے ہونا ہی پڑا قبر میں بند

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

"حسن مس" اکبر کے نزدیک "عشقِ بت" ہی کی نئی جون ہے۔ اس فلسفے کو انھوں نے وضاحت سے بیان بھی فرمایا ہے ؎

لیلیٰ نے سایہ پہنا مجنوں نے کوٹ پہنا — ٹوکا جو میں نے بولے بس بس خموش رہنا
حسن اور عشق اپنی اپنی جگہ ہیں قائم — ہے لطفِ بحرِ ہستی فیشن کے ساتھ بہنا

یہ تو ایک موضوع ہے۔ ایسے بیسیوں موضوع اور سیکڑوں اشعار ہیں۔ جو شہادت دیتے ہیں کہ اقلیم سخن میں ظرافت کی صوبہ داری اکبر ہی کے لئے مقرر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ایک خودسر اور بے لگام حاکم کی طرح وہ ہمسایہ علاقوں میں بھی دھاوا بول دیتے ہیں۔ حتیٰ کہ میر جعفر زٹلی کی قلمرو بھی ان کی یلغار سے محفوظ نہیں ہے۔

بی سُشتانی بھی ہیں بہت فیشن — کہتی ہیں شیخ سے با جوش و خروش
خواہ تہمد ہو خواہ ہو لنگی — در عمل کوش و ہر چہ خواہی پوش

ہم سے شبِ وصال وہ ملے میل ہوگئے — افسوس انٹرنس میں ہم فیل ہوگئے

تو بھی گریجویٹ ہے میں بھی گریجویٹ — علمی مباحثے ہوں ذرا پاس آکے لیٹ

حقیقی اور مجازی شاعری میں فرق ہے اتنا — کہ یہ جامے سے باہر ہے وہ پاجامے سے باہر ہے

کاش کرلے وہ مجھے شاہدِ ہوٹل منظور — کیک تو روز ہے اک رات مثنجن بھی سہی

تھی جوانی میں جو میڈم نان پاؤ — اب بڑھاپے میں ملائی ہوگئی

سینے پہ بتوں کے دسترس مشکل ہے — پوائنٹ یہ سخت ہے اسے ریچ نہ کرو

لپٹ بھی جانہ رک اکبر غضب کی بیوٹی ہے — نہیں نہیں یہ نہ جا یہ حیا کی ڈیوٹی ہے

اک پیر نے تہذیب سے لڑکے کو سنوارا — اک پیر نے تعلیم سے لڑکی کو ابھارا
وہ سائے میں پھیلی تو یہ پتلون میں اکڑے — پاجامہ غرض یہ ہے کہ دونوں نے اتارا

بدگماں ہرگز نہ ہوں وہ ہم جواں کو چت کریں — ہے فقط یہ مدعا ان کی کمر ثابت کریں

اور اسی قسم کے اشعار کو غزل کہیے گا یا ہزل ؟

فسردگی ہوئی پیدا اس انتشار کے بعد　　ہزار حیف کہ فالج گرا بخار کے بعد
کہا جو میں نے کہ دل چاہتا ہے پیار کروں　　تو مسکرا کے وہ کہنے لگے کہ پیار کے بعد
بہت ہی بگڑے وہ کل مجھ سے ایک بوسے پر　　خوش ہو گئے آخر کو تین چار کے بعد

اگر نوبت یہیں تک رہتی جب بھی شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں ان کی جگہ یقینی تھی بلکہ یوں کہیے کہ صف اول میں انھیں ایک اونچی کرسی الاٹ ہوتی۔ مگر وہ ظرافت محض کی حدود سے آگے نکل گئے اور سچ تو یہ ہے کہ یہاں پہنچنے کا کسی اور میں مقدور نہ تھا یہی مقام ان کا اصلی مقام ہے یہاں وہ ایک بلند پایہ مبصر ہیں جن کی نگاہ ...... ظاہر کے حجاب سے گزر کر باطن کے حقائق تک جا پہنچی ہے ان کے سامنے تمام چہرے بے نقاب ہو جاتے ہیں وہ خواہ شیخ ہوں خواہ صوفی، خواہ ملا، خواہ نئی روشنی کے لیڈر اور پلیڈر۔ اکبر کے ہاں سب کی منافقت اور کھوکھلے پن کے پردے اٹھ جاتے ہیں۔ یہاں اکبر لسان العصر ہیں جو عصر حاضر کے نشیب و فراز سے آگاہ ہیں۔ ان کا کلام ایک آئینہ ہے جسے وہ اپنی قوم کے سامنے پیش کرتے ہیں تاکہ اس میں وہ اپنے اصلی خد و خال دیکھ سکے۔ اور اسے معلوم ہو کہ

زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا تیرا

اکبر کے کلام کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے اس کے پس منظر کا جائزہ لینا ضروری ہے۔ انھوں نے وہ زمانہ دیکھا ہے جب مسلمان ہندوستان میں اپنی ہزار سالہ حکومت کھو چکے تھے اور ان پر ایک ایسی قوم مسلط ہو چکی تھی، جو انھیں پورے طور سے غلامی اور ذلت کا احساس دلانا چاہتی تھی۔ اسلام اور عیسائیت کی تیرہ سو سال پرانی مذہبی اور سیاسی کشمکش دوبارہ زندہ ہو چکی تھی۔ مسلمان اپنی ثقافتی، تمدنی اور مذہبی قدروں کو پست اور حقیر سمجھنے لگے تھے۔ ان حالات میں ان کے نزدیک اگر کوئی بات صحیح ہو سکتی تھی تو وہ انگریز کی بات تھی اور کوئی عمل صحیح ہو سکتا تھا تو وہ انگریز کا عمل تھا۔ کیونکہ انگریزوں کے طرز خیال اور طرز عمل کا نتیجہ نظروں کے سامنے تھا۔ اس پر آفت یہ تھی کہ انگریز ہندوؤں کو مسلمانوں کے مقابلے میں ابھارنا چاہتے تھے اور ہندو خود اپنی دانشمندی سے اور انگریزوں کی حکمت عملی سے پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ اس کے برعکس انگریز مسلمانوں کو دبا رہے تھے اور مسلمان خود بھی دب رہے تھے۔ سر سید احمد خاں کی کوشش تھی کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور اپنی کھوئی ہوئی دنیوی حیثیت دوبارہ حاصل کر لیں، وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں نے جس جہالت اور سستی کی وجہ سے اپنے آپ کو تباہ کیا ہے وہ ان سے دور ہو جائے وہ علم و حکمت کے محاذ پر خاص طور پر زور دے رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ مسلمان دوبارہ علوم و فنون پر حاوی ہو جائیں اور اپنی اسلامیت پر از سر نو قائم ہوں۔ سید احمد خاں کی تحریک جس کا نتیجہ ہم آج اپنی آنکھوں کے سامنے پاکستان کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ اس زمانے میں شدید غلط فہمیوں اور مخالفتوں کا شکار ہوئی۔ ایک گروہ نے اس کا خیر مقدم کیا اور اسے دنیوی ترقی اور حصول منصب کا ذریعہ سمجھ کر اس کی حمایت کی۔ ایک دوسرے گروہ نے اس کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ اس گروہ کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم اسلام کو تباہ کر دے گی اور مسلمان کرشان ہو جائیں گے۔ ڈارون کی تھیوری قرآن کو باطل قرار دے گی اور سارے کے سارے برصغیر میں شریعت محمدی کا کوئی نام لیوا باقی نہ رہے گا۔ اور اس گروہ نے سید احمد خاں کو کافر کہا اور بقول حالی۔ یہ لوگ اس تکفیر کو اسلام سمجھتے،

سید احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

اکبر ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک خاص حیثیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے سید کی تعلیم کی تضحیک کی۔ علی گڑھ کالج کے طلبا کو مشن اسکول کے لڑکے کہا اور نئی پود کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

جان سپرد ڈاکٹر، مال سپرد آں جناب　　عقل سپرد ماسٹر، روح سپرد ڈارون

الا یا ایہا الطفلک بجو راحت بہ نادلہا　　کہ قرآں سہل بود اول دلے افتاد مشکلہا
بکن تزئین پائے خود بہ بوٹِ ڈاسن ڈیکون　　کہ سر سید خبر دارد ز رسم و راہ منزلہا

علی گڑھ کو شرف بخشا ہے اقبالِ نصاریٰ نے　　کہ جو مسلم اٹھا شوقِ ترقی میں یہیں آیا

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا　　افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

خود سید احمد خاں کی ذات بھی اکبر کے طعنوں سے محفوظ نہ رہ سکی۔

سید اُٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے　　شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

سید کی سرگزشت کو حالی سے پوچھئے　　بابے میاں کا حال ڈفالی سے پوچھئے

مگر حقیقت یہ ہے کہ اگرچہ ان کا دل سید کے خلاف تھا۔ ان کا دماغ سید کے ساتھ تھا۔ ایک موقع پر فرمایا:

تعلیم اگر نہیں ہے زمانے کے حسبِ حال　　پھر کیا امید دولت و آرام و احترام
سید کے دل میں نقش ہوا اس خیال کا　　ڈالی بنائے مدرسہ لے کر خدا کا نام
صدمے اٹھائے رنج سہے گالیاں سہیں　　لیکن نہ چھوڑا قوم کے خادم نے اپنا کام
دکھلا دیا زمانے کو زورِ دل و دماغ　　بتلا دیا کہ کرتے ہیں یوں کرنے والے کام
نیت جو تھی بخیر تو برکت خدا نے دی　　کالج ہوا درست بصد شان و احتشام

انھوں نے خود بھی انگریزی پڑھی اور بچوں کو بھی پڑھوائی۔ حتیٰ کہ ان کے صاحبزادے ولایت بھی گئے۔ اکبر خود سرکار کے ملازم بھی تھے اور خان بہادر بھی، مگر ان کا دل ان تغیرات سے خوش نہیں تھا جو ان کی آنکھوں کے سامنے عام مسلمانوں پر گذر رہے تھے۔ گذرا ہوا زمانہ قدم قدم پر انھیں آواز دے رہا تھا۔ کاش یہ انگریز نہ آتے اور مسلمان اپنی پرانی تہذیب سے بیگانہ نہ ہو جاتے مولوی صاحب اور ان کی ڈاڑھی۔ جناب شیخ کا عمامہ اور پاجامہ۔ صوفی اور ان کی شرابِ معرفت۔ مسجدیں اور ان کے نمازی، عیدین اور سوئیاں، حرم سرا اور پردہ، کاش یہ سب چیزیں جوں کی توں برقرار رہتیں۔ خدا تعالےٰ جانے آج مسلمانوں کی حمیتِ ملی کہاں ہے اور ان کے اعمال کو کیا ہو گیا۔

کیونکر کہیں کہ طرزِ عمل ان کا نیک ہے　　جب عید میں بجائے سوئیوں کے کیک ہے

وہ زندگی کے ہر شعبے میں مشرقیت ڈھونڈتے تھے۔ دو شعر سنئے:

ہر چند کہ ہے مس کا لونڈر بھی بہت خوب | بیگم کا مگر عطر حنا اور ہی کچھ ہے !

سلئے کی بھی سن سن ہوس انگیز ہے لیکن | اس شوخ کے گھنگھرو کی صدا اور ہی کچھ ہے

دیکھا آپ نے ؟ کیسے ہوس انگیزی میں بھی مشرق و مغرب کی تمیز قائم رکھی ہے ۔ اگرچہ "مس" اور "حسن مس" کے متعلق جس ذوق شوق کا خفیہ یا علانیہ اظہار اکبر اپنی شاعری میں جا بجا فرماتے ہیں ۔ وہ ماہرین تحلیل نفسی کے لئے ایک دعوت تحقیق ہے مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مسلمانوں کی پرانی تہذیب اور رسم و رواج سے اکبر کا لگاؤ جذباتی قسم کا ہے ۔ اور یہ جذباتی لگاؤ ان کی طبیعت کا جزو ہے اور ایک بڑی حد تک ان کی شاعری کی بنیاد اسی پر ہے ۔ ان کا تصوف بھی قدامت پرستی کا ہی ایک مظاہرہ تھا ، جب اقبال نے "اسرار خودی" میں حافظ کے خلاف لکھا تو اکبر ان بزرگوں میں سے تھے ۔ جنھوں نے اقبال کو مغرب زدہ قرار دیا دراصل وہ کسی نئے طرز عمل اور نقطۂ نگاہ کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے وہ تغیر سے خائف اور بیزار تھے ۔

تغیر کے تعمیری امکانات پر ان کی نظر نہیں تھی یہی ان کے نقطۂ نگاہ کی کمزوری ہے وہ سمجھتے تھے کہ سید اور ان کے ساتھی غلط راستے پر چل رہے ہیں مگر خود انھیں بھی اس راستے کے علاوہ اور کوئی راستہ نظر نہ آیا اور آخر وہ خود بھی انہی غلط روؤں کے ساتھ ہو لئے نیا راستہ دیکھنا اور دکھانا ان کا کام بھی نہیں تھا ، وہ اکبر تھے ، اقبال نہیں تھے ۔ ان کی خدمت یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو مغربیت کی اندھا دھند تقلید اور غلامانہ نقالی کے خلاف تنبیہہ کی اور ذاتی اور اجتماعی زندگی میں خلوص اور دیانت کی دعوت دی ۔ ان کی یہ دعوت آج بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی ان کی زندگی میں تھی ۔ اکبر نے اپنا پیام موثر طور سے لوگوں تک پہنچانے کیلئے طنز کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا ، ان کی طنز ایک بے پناہ حربہ ہے جس کی زد سے کوئی نہیں بچا ۔ انگریز پرستی پر ان کی ضرب خاص طور پر کاری ہے ۔

ہوا آج خارج جو میرا اصول | کہا میں نے صاحب سے باصد ملال

کہاں جاؤں اب میں تمھیں یہ بتاؤ | وہ جھنجھلا کے بولے جہنم میں جاؤ

یہ سن کر بہت طبع غمگیں ہوئی | مگر اس تصور سے تسکیں ہوئی

کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے | تو بے شک جہنم بھی ہے کوئی شے !

سدھاریں شیخ کعبہ کو ہم انگلستان دیکھیں گے | خدا کا گھر وہ دیکھیں ہم خدا کی شان دیکھیں گے

کہا منصور نے خدا ہوں میں | ڈارون بولا بوزنا ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست | فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

لیڈران قوم وقت سے متاثر ہو کر مسلمان کا قرب حاصل کرنے کیلئے اور سوسائٹی میں اپنی ذاتی عزت قائم کرنے کی خاطر جو کچھ کر رہے تھے اکبر نے اس کا گہرا جائزہ لیا ۔ ذرا یہ تصویر دیکھئے :-

مرے شکوؤں سے کیوں بھڑتے ہیں وہ اخبار کے کالم | کوئی یہ شیخ سے کہدے کہ سنئے قبلۂ عالم

جدھر مسٹر ادھر دولت ، جدھر دولت ادھر چندہ | جدھر چندہ ادھر آنر ، جدھر آنر ادھر بندہ

ان کی آنکھوں میں جناب شیخ کا درجہ بھی کچھ بہت بلند نہ تھا ۔

شیخ تثلیث کی تردید تو کر سکتے نہیں | گھر میں بیٹھے ہوئے "والتین" پڑھا کرتے ہیں

خلافِ شرع کبھی شیخ تھوکتا بھی نہیں　　　مگر اندھیرے اجالے میں چوکتا بھی نہیں

شیخ جی کونسل کے ووٹر ہو گئے　　　لیجئے جھگڑے سے موٹر ہو گئے

اس زمانے میں اڑنگے دیکھ کر قانون کے　　　شیخ نے تہمد سے ہجرت کی طرف پتلون کے

جناب شیخ کا انجام بھی بخیر نہ ہوا۔

شیخ جی کے دونوں بیٹے باہنر پیدا ہوئے　　　ایک ہیں خفیہ پولیس میں ایک پھانسی پا گئے

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ　　　رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

یوسف کو نہ سمجھے کہ حسیں بھی ہے جواں بھی　　　شاید نرے لیڈر تھے زلیخا کے میاں بھی

مسلمانوں کے ایمان کی حقیقت ایک شعر میں کیا خوب واضح کی ہے :۔

زبان سے کہتے ہیں سب کچھ مگر حقیقت میں　　　فقط وہ قوتِ فرماں روا کو مانتے ہیں

اور اس سے بھی بڑھ کر یہ :۔

مری قرآن دانی پر نہ ہوں یوں بدگماں حضرت　　　مجھے تفسیر بھی آتی ہے اپنا مدعا کہیے

رہے مولوی صاحب تو ان کو تقاضائے شکم اور ذہنی تنگ نظری کی کشمکش نے جس حالت پر پہنچا دیا تھا وہ بھی اکبر کی آنکھوں سے اوجھل نہیں تھی ۔

مولوی صاحب نہ بخشیں گے خدا گو بخش دے　　　گھیر ہی لیں گے پولیس والے سزا ہو یا نہ ہو

ہر گز کے مولوی کو تم جانتے ہو کیا ہے ؟　　　انگلش کی پالیسی کا عربی میں ترجمہ ہے !

مغربی تعلیم قوم کے نوجوان لڑکے لڑکیوں پر جو اثر ڈال رہی تھی ۔ اکبر کے فنی کیمرے نے اس کی بھی عکاسی کی ہے ۔

بی اے کی کمال کامیابی ہے یہی　　　سروس کے لگاؤ سے معزز بننا

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا　　　کھا ڈبل روٹی ۔ کلرکی کر خوشی سے پھول جا

اور جو سب سے اچھے رہے ان کی کیفیت بھی سنئے ،

تھے معزز شخص لیکن ان کی لائف کیا لکھوں　　　گفتنی درج گزٹ باقی جو ہے ناگفتنی

عورتوں کے پردے کی حمایت میں ان کے یہ اشعار زبان زد عام ہیں ۔

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مگر وہ عورتوں کی تعلیم کے مخالف نہیں تھے ۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

تعلیم عورتوں کو بھی دینی ضرور ہے — لڑکی جو بے پڑھی ہو تو وہ بے شعور ہے

البتہ ذیل کے دو اشعار میں انھوں نے نئی روشنی کی مسلمان عورت پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ بات آج تک پہنچتا ہے اور اب بھی اس میں ہمارے لئے ایک سبق ہے ۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی — اب ہے شمع انجمن پہلے چراغ خانہ تھی

تعلیم لڑکیوں کی ضروری تو ہے مگر — خاتون خانہ ہوں وہ سبھا کی پری نہ ہوں

ان کی یہ تعلیم ہندو اور مسلمان دونوں کے لئے تھی ۔

داتا نے دھن دیا ہے تو دل سے غنی رہو — پڑھ لکھ کے اپنے گھر میں ہی دیوی بنی رہو

اکبر کی طنز میں کہیں کہیں مایوسی اور تلخی کی اس قدر گہری آمیزش ہے کہ ان کی ظرافت از ہر خندہ معلوم ہوتا ہے ۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ۔ ظرافت دراصل ان کے ہاں مایوسی اور بے زاری کا پردہ ہے وہ اپنی صبح عید میں شام محرم چھپائے ہوئے ہیں ۔ مگر کبھی کبھی یہ مایوسی اور بے زاری اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ کسی طرح چھپ نہیں سکتی ۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کر لی — نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کر لی

لطف چاہو اک بت نوخیز کو راضی کرو — نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو
لیڈری چاہو تو لفظ قوم ہے مہماں نواز — گپ نویسوں کو اور اہل میز کو راضی کرو

بتوں سے میل خدا پر نظر یہ خوب کہی — شب گناہ و نماز سحر یہ خوب کہی
فش نفیس سڑک خوشنما ڈنر ہر شب — یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

اس سے بھی آگے بڑھ کر دیکھئے تو محض مایوسی نظر آئے گی ۔ جس میں ظرافت اور طنز نام کو بھی نہیں ہے ۔

رہی نہ قلب میں قوت زمانہ سازی کی — دعا کرو نہ مری عمر کی درازی کی
فلک نے ہم کو کیا منتخب مٹانے کو — ہمیں سے داد بھی چاہی خوش امتیازی کی

راج انگلش کا ملک ہندو کا — اللہ حافظ ہے بھائی صلو کا

خدا حافظ مسلمانوں کا اکبر ۔۔۔ مجھے تو ان کی خوش حالی سے ہے یاس
یہ عاشق شاہد مقصود کے ہیں ۔۔۔ نہ جائیں گے و لیکن سعی کے پاس

پھر ایک مقام وہ بھی ہے جہاں ان کی نظروں میں کسی بات کی وقعت نہیں رہتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دیو جانس کلبی آنجہانی کی روح ان میں حلول کر آئی ہے۔

یہ سنت ہے تو پھر کیا وہ تیز ہے تو پھر کیا ۔۔۔ نیٹو جو ہے تو پھر کیا انگریز ہے تو پھر کیا

لوگ ہنستے ہیں جو پیش آتی ہے یہ حالت کبھی ۔۔۔ من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو
لیکن اخلاقی نظر میں اس سے تو بہتر ہے یہ ۔۔۔ من ترا پاجی بگویم تو مرا پاجی بگو

اکبر کے ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اپنی قوم کی حالت دیکھ کر ان کے دل پر کیا گذر رہی تھی، اگرچہ ان کی طبیعت میں فطرت نے ظرافت کا مادہ فراوانی سے ودیعت کیا تھا اور ان کی شاعری اس دولت سے مالا مال ہے مگر جب وہ اپنی قوم کی سیاسی بے شعوری مغرب کی کورانہ تقلید اور عام منافقت پر ہنستے ہیں تو ان کی ہنسی سطحی معلوم ہوتی ہے اور یہ بات چھپائے سے چھپ نہیں سکتی کہ وہ ہنس اس لئے رہے ہیں کہ اپنے آنسوؤں پر قابو پا سکیں۔

اکبر کی طنزیہ ظرافت نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی خدمت کی ہے۔ ان کے اشعار اکثر سیاسی رہنماؤں کی تقریروں کی زینت بنتے رہے ہیں اور زیادہ تر اسی ذریعہ سے عام لوگوں تک پہنچے ہیں ورنہ ان کا کلام ابھی تک نہ تو باقاعدہ طور پر ترتیب دیا گیا ہے۔ نہ ہی تمام و کمال چھپا ہے۔ تقسیم سے پہلے کلیات اکبر کے تین حصے چھپے تھے۔ بعد میں ان کا "گاندھی نامہ" کلیات حصہ چہارم اور متفرق کلام منظر عام پر آئے کراچی کی بزم اکبر نے اکبر کا کلام دوبارہ چھاپنے کی سعی کی، یہ بڑی مستحسن کوشش تھی۔ مگر ابھی اس بارے میں مزید کام کرنے کی گنجائش ہے۔ کلام اکبر کے بیشتر مسودات اب پاکستان کے قومی آثار خانے میں محفوظ ہیں خدا کرے کہ ہمارے اہل علم ان سے کما حقہٗ فائدے اٹھا سکیں۔

کلام اکبر کے سلسلے میں مختلف اشعار کی شان نزول کی تحقیق ضروری ہے۔ اکبر کے اکثر اشعار کا پس منظر سیاسی یا سماجی ہے۔ اگر کلام اکبر کے مختلف محرکات پیش نظر ہوں۔ تو اکبر کے زمانے کی مفصل تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ ان کے واقعاتی اشعار کے چند نمونے ملاحظہ ہوں۔

شملے میں لیگ کا ڈپوٹیشن۔

ڈپوٹیشن کی سرسبزی جو دیکھی اس نے شملے میں ۔۔۔ برہمن نے کہا یہ شاخ بید اور ایسے گملے میں

نمائش الہ آباد:

چھٹ گئی ہاتھ سے تہذیب کی جھنڈی افسوس ۔۔۔ اگر ہیش میں نچانے لگے رنڈی افسوس

ترک موالات کے مسلمان لیڈر:۔

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں ۔۔۔ گو گرد راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

سرکار پرستی اور کانگریس پرستی :-

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا　　اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یلغار مر :-

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے　　صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

پہلی عالمگیر جنگ :-

سنا یورپ میں ہر قاصد پیام جنگ لایا ہے　　بحمد اللہ اب خونِ شہیداں رنگ لایا ہے

بہت کیں سختیاں بلقانیوں نے بے گناہوں پر　　بالآخر چرخ ان کے سر کو زیرِ سنگ لایا ہے

نشاطِ دل کو کافی ہے صدا اللہ اکبر کی　　عبث یہ مدعی پولیٹکل فرہنگ لایا ہے

خلافت ڈیپوٹیشن (محمد علی کی قیادت اور سید سلیمان ندوی کی رکنیت)

سلیمان کی بات کیسی بنی　　کہ ندوی سے اب ہو گئے لندنی

رہے بادہ نوشو سے بے شک کھنچے　　مگر چائے والوں سے گاڑھی چھنی

محمد علی کی رفاقت میں ہیں　　خدا غیر سے ان کو کر دے غنی

ایسی بہت سی مثالیں ان کے کلام میں ملیں گی، ایک خاص بات یہ ہے کہ اگرچہ ان کے واقعاتی اور تاریخی اشعار میں مختلف لوگوں کے نام آتے ہیں۔ اور اکبر ان پر طنز بھی کرتے ہیں، مگر ان کا مقصد کہیں بھی کسی کی دل آزاری نہیں ہے، انھیں ذاتیات سے کوئی بحث نہیں۔ وہ اگر شعر میں کسی کا نام لیتے ہیں۔ تو ان کا خطاب خود اس شخص سے نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس کی شخصیت کا سہارا لے کر ہماری توجہ اس تحریک یا نقطۂ نگاہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں جس کا وہ علمبردار ہے۔ اکبر کی ظرافت میں ہجویات کا کوئی عنصر موجود نہیں ہے۔ سب و شتم سے ان کا دامن پاک ہے اور یوں کہنا چاہئے کہ سودا اور انشا کے کوچے کی انہیں ہوا بھی نہیں لگی۔

اپنے دور پر اکبر کی ظریفانہ طنز اور طنزیہ تنقید ایک حد تک انقلاب فرانس کے معمار والٹیر کے ادبی کارنامے کی یاد دلاتی ہے والٹیر نے قدیم فرانس کے بادشاہانہ اور جاگیردارانہ نظام کی ہنسی اڑائی۔ اور اس کی طنز کے پے در پے حملوں نے ان اداروں کی بنیادوں کو متزلزل کر دیا۔ چنانچہ جب انقلاب کی آندھی چلی تو یہ بظاہر عالی شان عمارتیں اس کے سامنے نہ ٹھہر سکیں اکبر کے کلام کو انقلاب انگیز اس لئے نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ایک گذرے ہوئے دور کے دلدادہ تھے کسی آنے والے روشن مستقبل کا انہیں انتظار نہ تھا، لیکن اس رجعت پسندی کے باوجود ان کا کلام ایک انقلاب کی یادگار ضرور ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تہذیب مغرب پر ان کی تنقید ایک منفی قسم کی تنقید تھی۔ مگر اس تنقید نے اقبال کا کام آسان کر دیا اور لوگوں کو ان کا پیغام سمجھنے میں مدد دی۔ اکبر نے مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی مسئلے کے اونچ نیچ پر بصیرت کی نظر ڈالی اور معاملہ کی تہ تک پہنچے، مگر انہیں اس مسئلے کا کوئی

حل نہ ملا۔ مغربی تعلیم اور مغربی تہذیب مسلمانوں کو یقیناً اپنے آپ سے بیگانہ بنا رہی تھی اور اکبر کا دردمند دل اس منظر کو دیکھ کر بے قرار تھا۔ مگر مسلمان آخر کرتے بھی تو کیا کرتے۔ اس سوال کا جواب اکبر کے پاس نہ تھا۔ یہی وہ چیز ہے۔ جس نے ان کی ظرافت کو زہرخند میں تبدیل کر دیا اور انھیں مایوسی اور منفیت کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔ اقبال نے کہا ہے:۔

آئین نو سے ڈرنا۔ طرز کہن پہ اڑنا منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اکبر آئین نو سے ڈر کے طرز کہن کی پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ آئین نو کو اپنی طرز پر ڈھالنا ان کے بس کی بات نہیں ان کی قدامت پسندی کو رجعت پسندی کہنا ممکن ہے ایک حد تک ناانصافی ہو مگر وہ رجعت پسندی کا سہارا ضرور بن سکتی ہے۔ وہ نئی تعلیم اور نئی تہذیب کو ناگزیر سمجھتے تھے مگر یہ چاہتے تھے کہ مسلمان اپنے آپ کو نہ بھولیں اور اپنی وضع قائم رکھیں لیکن یہ مقصد کیسے حاصل ہو اس کی کوئی عملی صورت ان کے سامنے نہ تھی ان کا نقطۂ نظر صحیح تھا۔ مگر کسی لائحۂ عمل کا تعین نہ ہونے کی وجہ سے وہ دوسروں کی غلط فہمیوں کا شکار رہے۔ نئی تجدد پسند پود نے انھیں محض ایک قہقہہ باز مسخرا خیال کیا اور ان کی اچھی اور سچی نصیحتوں کو بھی ٹھکرا دیا جو لوگ سکون اور جمود کے حامی تھے۔ انھوں نے ان کی قدامت پسندی کا فائدہ اٹھایا اور ان کے کلام سے اپنے غلط مقاصد کی تائید حاصل کرنا چاہی۔ اکبر سید احمد خاں کا مقام سمجھ لیتے تو شاید ان کی تنقید کا رخ اور ہوتا۔ سید کی مسلسل اور بے جا مخالفت اکبر کے حق میں جتنی نقصان دہ ثابت ہوئی ہے اتنی شاید کوئی اور چیز نہیں ہوئی۔ ان کا اس قسم کا کلام زیادہ تر غالباً اس ابتدائی دور کی یادگار ہے۔ جب وہ مرزا مچھو بیگ ستم ظریف۔ پنڈت تربھون ناتھ ہجر۔ اور نواب سید محمد آزاد کی طرح اودھ پنچ کے قلمی معاونین میں سے تھے۔ اودھ پنچ کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین ایک مستعد اور ثابت قدم کانگریسی تھے۔ سید احمد خاں کے سیاسی اور اصلاحی مسلک کے ہمیشہ مخالف رہے انھیں نیچری اور کیا کچھ نہ کہا۔ ممکن ہے منشی صاحب کی دوستی نے بھی اکبر کی طبیعت پر اثر ڈالا ہو۔ بعد کو وہ تائب ہو گئے حتیٰ کہ یہ بھی کہہ دیا کہ "ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا" "نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں" مگر وہ دیوبند اور الہلال کی طرح سید کے اصل مقصد کو آخر تک صحیح طور پر سمجھنے سے قاصر رہے۔ دراصل وہ جس منفیت کی دلدل میں پھنس چکے تھے اس سے نکلنا ان کے لئے ناممکن تھا۔

جہاں تک اکبر کی ظرافت کا تعلق ہے وہ نہ صرف اردو میں اپنی مثال آپ ہے بلکہ شاید دنیا بھر کے ادب میں اس انداز اور اس معیار کی ظرافت کہیں نہیں ملے گی۔ اردو میں ان سے پہلے مرزا سودا اور ایک آدھ اور شاعر نے ہجو اور شہر آشوب کے ذریعے سے اپنے ہمعصروں کو تنبیہ کرنا چاہی مگر اس قسم کی کوششیں اکبر کے کارنامے کے آگے حقیر ہیں۔ ظفر علی خاں۔ احمق پھپھوندوی حافظ ولایت اللہ وغیرہم نے اکبر کی طرز اڑانے کی کوشش کی، مگر وہ بات کہاں؟ اکبر کی طنز الگ ہے۔ اقبال نے بھی "اکبری اقبال" کی شکل میں جو کوشش فرمائی ہے۔ اس کے متعلق یہی کہہ دینا کافی ہوگا کہ وہ ان سے ایک چوک ہوگئی ہے۔ انہیں اکبر سے بے انتہا عقیدت تھی۔ اکبر کی وفات پر انھوں نے جو اشعار کہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی نگاہ میں اکبر کا مقام کیا تھا۔

دریغا کہ رخت از جہاں بست اکبر حیاتش بحق بود روشن دلیلے
سر زد دہ طور معنی کلیمے بہ بت خانۂ دور حاضر خلیلے
گہے گریۂ او چو ابر بہارے گہے خندۂ او چو تیغ اصیلے

اکبر کی زندگی اور ان کے مشن کو اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اکبر الہ آبادی کا پُرخلوص طنز

(سید ہاشم رضا)

اپنے طالب علمی کے دور میں اکبر الہ آبادی کی پہلی غزل جو میں نے پڑھی تھی وہ ساتویں جماعت کے کورس میں شامل تھی جس کا مطلع تھا ؎

بنوگے خسروِ اقلیم دل شیریں زباں ہوکر
جہانگیری کرے گی یہ ادا نور جہاں ہوکر

جب ہم لوگ مقطع تک پہنچے تو اردو کے مدرس پنڈت مولچند شرما نے ایسے معنی سمجھائے کہ آج تک لطف آ رہا ہے۔ مقطع یہ ہے ؎

نگاہیں کاملوں پر پڑ ہی جاتی ہیں زمانے کی
کہیں چھپتا ہے اکبؔر پھول پتوں میں نہاں ہوکر

انہوں نے فرمایا کہ اکبر پھول کے معنی ہیں بڑا پھول اور مطلب یہ ہے کہ اکبر پھول بڑا ہو تو پتیاں اسے چھپا نہیں سکتیں، چھوٹا پھول ہو تو وہ پتیوں میں چھپ جائے گا۔

بہرحال اس شعر میں اکبر نے خود اپنی روئیداد بیان کی ہے۔ ان کی قدر جتنی ان کی زندگی میں ہوئی۔ اس سے زیادہ ہی ان کے مرنے کے بعد ہوئی اور آج بھی طنز و ظرافت کے بازار میں ان کے نام کا سکّہ رواں ہے۔

ہر شاعر کا مقصد سمجھنے کے لئے اس کے ماحول سے واقفیت ضروری ہے، اکبر الہ آبادی کا زمانہ وہ تھا جب دنیا میں تاج برطانیہ اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ہندوستان میں ہندوؤں نے انگریزوں سے تعاون کیا اور ان کے سامنے جھک جھک کر رفعتیں حاصل کر لی تھیں اور مسلمانوں نے انگریزوں سے ہر شعبۂ حیات میں عدم تعاون کا مظاہرہ کیا تھا۔ سر سید احمد خاں اس عدم تعاون کے خلاف تھے اور یہ چاہتے تھے کہ انگریزوں اور مسلمانوں میں مفاہمت ہو جائے۔ اسی تگ و دو میں انھوں نے ولایت کا سفر کیا اور مسلمانوں کی سب سے بڑی اور کارآمد درسگاہ علی گڑھ میں قائم کی، اکبر الہ آبادی نے عملاً سر سید کی تعاون کی پالیسی سے اتفاق کیا۔ خود انگریزی تعلیم حاصل کی اور اپنے بیٹے سید عشرت حسین کو تعلیم کے لئے ولایت بھیجا اور انگریزوں کی نوکری بھی کی۔

سر سید کی عظمت آج مسلّم الثبوت ہے۔ لیکن ان کی زندگی میں ان کی مخالفت کی کمی نہ تھی خدا ان کے مرقد کو منوّر کرے جنھوں نے ہندوستان کے مسلمانوں کو تعلیم کے پلیٹ فارم پر جمع کیا، ان کو ہندوؤں کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کیا اور دو

قوموں کا نظریہ پیش کیا جو بعد میں تحریک پاکستان کی اساس بنا، میری رائے میں سرسید اور اکبر الہ آبادی کی منزل ایک تھی ۔ گوکہ راہیں مختلف تھیں ۔ دونوں یہ چاہتے تھے کہ برصغیر ہندوستان و پاکستان میں مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت پھر حاصل کریں اور ترقی کی راہ میں ہندوؤں سے پیچھے نہ رہیں ۔ سرسید نے تعلیم پر زور دیا اور اکبر الہ آبادی نے مذہب پر، اور واقعہ یہ ہے کہ اگر مسلمان تعلیم نہ حاصل کرتے یا اگر وہ مذہب سے بیگانہ رہتے تو پاکستان کی مہم سر نہ ہوتی ۔ اکبر الہ آبادی کے مزار پر فاتحہ کے ساتھ یہ مصرعہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔ ؏

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

مذہب کے معاملے میں اکبر، حالی اور اقبال ایک ہی صف میں نظر آتے ہیں ۔ اکبر کبھی تعلیمیافتہ نوجوانوں کو یوں آگاہ کرتے ہیں ۔

فلسفی کو بحث کے اندر خدا ملتا نہیں
ڈور کو سلجھا رہا ہے اور سرا ملتا نہیں

کبھی تہذیب نو کے بتوں کے پجاریوں سے یوں مخاطب ہوتے ہیں ۔

کعبے سے بت نکال دئے تھے رسولؐ نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

اللہ کی قدرت کا سب سے بڑا کرشمہ اکبر کی نظر میں یہ تھا کہ اس نے محمدؐ جیسا بندہ پیدا کیا ۔

جو لوگ قانون کا لحاظ تو کرتے ہیں لیکن مذہب کے احکام پر عمل پیرا نہیں ہوتے ان کے بارے میں اکبر فرماتے ہیں ۔

کافی ہیں امیروں کو قوانین گورمنٹ
مذہب کی ضرورت تو غریبوں کے لئے ہے

ان مسلمانوں کو جو انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنے عقیدوں کا اظہار کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے، اکبر نے یوں جھنجوڑا۔

جو پوچھا مجھ سے دور چرخ نے کیا تو مسلماں ہے؟ — میں گھبرایا کہ اس دریافت میں کیا رمز پنہاں ہے
کروں اقرار تو شاید یہ بے مہری کرے مجھ سے — اگر انکار کرتا ہوں تو خوف قہر یزداں ہے
بالآخر کہہ دیا میں نے کہ گو مسلم تو ہے بندہ — ولیکن مولوی ہرگز نہیں ہے خانساماں ہے

اور ان مسلمان نوجوانوں کا نقشہ یوں کھینچا جو عشق کی بازی میں مذہب کا داؤں لگانے کے لئے تیار تھے ۔

رات اس مس سے کلب میں جو ہوا میں دوچار — ہائے وہ حسن وہ شوخی وہ نزاکت وہ ابھار
عرض کی میں نے کہ اے گلشن فطرت کی بہار — دولت و عزت و ایماں ترے قدموں پہ نثار
شوق کے جوش میں میں نے جو زباں یوں کھولی — نازو انداز سے تیوری کو چڑھا کر بولی
غیر ممکن ہے مجھے انس مسلمانوں سے — بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے
عرض کی میں نے کہ اے لذت جان راحت روح — اب زمانے پہ نہیں ہے اثر آدم و نوح
میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو — ہنس کے بولی کہ تو پھر مجھ کو بھی راضی سمجھو

(ایک زمانے میں لکھنؤ کے سسشن جج) مسٹر اے پی ڈیو ہرسٹ آئی سی ایس تھے ۔ جنھیں اردو سے بڑی محبت تھی، انھوں نے اپنے اجلاس کے لئے یہ طریقۂ کار نکالا تھا کہ ہندوستانی اردو میں بحث کریں اور وہ خود انگریزی

ہیں جواب دیں اور فیصلے لکھیں۔ ایک ہندوستانی بیرسٹر نے ان سے پوچھا کہ آپ ہندوستانیوں کی انگریزی سننے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ اس کا جواب انھوں نے دیا کہ انگریزی میری مادری زبان ہے اور اردو اکتسابی زبان، اردو آپ کی مادری زبان ہے اور انگریزی اکتسابی زبان ہم دونوں کو اپنی اپنی مادری زبان میں گفتگو کرنا چاہئے اور جب ہندوستانی بیرسٹر اس جواب سے مطمئن نہ ہوئے تو انھوں نے کہا کہ معاف فرمائیے گا آپ کا انگریزی تلفظ میرے کانوں پر اتنا ہی گراں گزرتا ہے جتنا کہ میری اردو کا تلفظ۔ آپ کے کانوں پر گراں گذرے گا۔ جن نوجوانوں کو اکبر الٰہ آبادی اپنے مذہب اور اپنی تہذیب کا گرویدہ بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان نوجوانوں سے ڈیو ہرسٹ صاحب کا خطاب سنئے۔ یہ اشعار انھوں نے آکسفورڈ میں ۱۹۳۳ء میں پڑھے تھے ان کا خطاب ان ہندوستانی طالب علموں سے تھا۔ جو ولایت میں انگریزوں کی تعلیم حاصل کر کے واپس ہندوستان آرہے تھے۔

اسی زمانے میں آپ اس بڑے مدرسے سے
روانہ ہوں گے۔ زیادہ کچھ انتظار نہیں
خدا کرے کہ سلامت سے سب وہاں پہنچیں
وطن میں جس کی محبت کسی پہ بار نہیں
برا نہ مانئے گر میں نصیحتیں کر دوں
کہ دل میں بات رکھوں یہ میرا شعار نہیں
وطن میں لوٹ کے اپنے رسوم اور مذہب
نہ ترک ہوں نہ یہ سمجھیں کہ استوار نہیں
سب اپنے اپنے دھرم پہ قدم جمائے رکھیں
کہ نقلِ غیر میں اپنا کچھ افتخار نہیں!
نہ گھر نہ گھاٹ کا ہے یہ کہیں گے سب طنزاً
یہ ہے عجائب خلقت کچھ اعتبار نہیں
وطن کا شعلۂ آتش سبھوں کے دل میں جلے
نہ لکھنؤ کے "انگارے" جو پائیدار نہیں

آخری شعر میں اس کتاب کا ذکر ہے جو کہ اس زمانے میں لکھنؤ میں چھپی تھی اور جس کا نام تھا "انگارے" اس کتاب میں خدا اور مذہب کا مذاق اڑایا گیا تھا جسے پڑھ کر ڈیو ہرسٹ صاحب آگ بگولہ ہوگئے تھے!

آپ نے ملاحظہ کیا کہ اکبر الٰہ آبادی کا رنگ ڈیوڈ ہرسٹ صاحب کے اشعار میں کتنا نمایاں ہے۔ آکسفورڈ میں اکبر الٰہ آبادی کے دو مداح انگریزوں سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ایک تو ڈیو ڈہرسٹ صاحب اور دوسرے سر جے ڈبرن جو ایک زمانے میں یوپی میں چیف سکریٹری تھے۔ کراچی میں اکبر الٰہ آبادی کے ایک اور مداح سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ چودھری نذیر احمد خاں اور انھوں نے یہ پر لطف واقعہ سنایا کہ جب منٹگمری میں پہلی مرتبہ انھوں نے اکبر ڈے منایا تو ایک صاحب نے فرمایا کہ آپ اکبر ڈے شوق سے منائیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ اورنگ زیب کو نہ بھولیں جو اکبر سے کہیں بہتر مسلمان تھا۔

اکبر کے کلام میں طنز و ظرافت کا عنصر

(خواجہ حمید الدین شاہد)

اکبر الٰہ آبادی نہ صرف ایک بلند پایہ طنز نگار اور منفرد ظریف شاعر تھے بلکہ فطرت انسانی کے کامل نبّاض اور ہم دری تہذیب و معاشرت کے ایک چابک دست ناقد بھی تھے وہ نہ صرف اپنے دور کے مصلح اور ریفارمر تھے بلکہ ان کا کلام ہر دور میں اصلاح معاشرت کے لئے تیر بہدف نامہ ہے۔ یہی ایک ایسی خوبی ہے جس کی وجہ سے ان کا کلام اس وقت تک زندہ رہے گا جب تک اس عالم کون و فساد میں انسان کی ہنگامہ آرائیاں باقی ہیں۔ اکبر نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے اپنے دور کے شاعروں سے الگ تھلگ ایک نئی راہ نکالی اور آخر وقت تک اور نہایت پامردی اور کامیابی کے ساتھ اس راہ پر گامزن رہے۔ انہوں نے اپنی شاعرانہ جولانیاں دکھانے کے لئے جو میدان انتخاب کیا تھا، اس میدان میں کوئی ان کا ہمسر اور ہم عنان نہ بن سکا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں انفرادیت اور اجتہادانہ شان پیدا ہوگئی ہے۔ اُن کی فراست اور ذہانت کا وہ عالم تھا کہ معاشرتی، مذہبی اور سیاسی مسائل کی تہ تک تو پہنچ جاتے تھے اور ان کو اپنے خاص انداز میں اس طرح بیان کرتے تھے کہ لوگ جھوم جھوم اٹھتے۔ خوش طبعی شگفتہ مزاجی اور ظرافت ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ حاضر جوابی اور بذلہ سنجی میں کوئی ان کا مدمقابل نہ بن سکا۔ ان کی پاکیزہ ظرافت اور بے مثال طنز نے ان کی شاعری کو لافانی بنا دیا ہے۔ وہ اپنی فطری زندہ دلی کی وجہ سے ہر بات میں ہنسنے ہنسانے کا پہلو نکال لیتے تھے اور اپنے اچھوتے طرز بیان سے لوگوں کے دلوں کو موہ لینے میں ید طولیٰ رکھتے تھے اور طنز و مزاح میں اکبر کو وہ مقام حاصل ہوا جو نہ تو ان سے پہلے کسی شاعر کو نصیب ہوا تھا اور نہ اکبر کے بعد کسی شاعر نے ان کے طرز کی کامیاب تقلید کی۔ طنز و ظرافت کا مقصد محض ہنسنا ہنسانا ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنے معاشرہ کی صحتمندانہ تنقید اور اصلاح بھی پیش نظر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طنزیہ انداز میں تلخی اور تندی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس تلخی و تندی کو کارگر بنانے کے لئے ظرافت و مزاح کی چاشنی ضروری ہے۔ اکبر کا کمال یہی ہے کہ ان کے کلام میں طنز و ظرافت کا متوازی امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کا اولین مقصد اپنے دور کی تہذیب و معاشرت کی اصلاح کرنا تھا خصوصاً جدید تعلیمیافتہ مسلمانوں کی مغرب زدگی اور قدامت پرستوں کی تنگ نظری پر انہوں نے کڑی تنقید کی ہے لیکن ان کی سخت سے سخت تنقید بھی کچھ گو ناگوار نہیں معلوم ہوتی اور یہی ان کی شاعری ہے وہ اپنے مافی الضمیر کو ایسے لچک دار الفاظ اور موثر پیرایۂ بیان میں ادا کرتے ہیں کہ سننے والوں پر گراں نہیں گزرتا۔ وہ ہنسی ہنسی میں لوگوں کے دلوں میں چٹکیاں لیتے ہیں۔ زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں جس کے عیوب پر

نقائص کو انھوں نے بے نقاب نہ کیا ہو۔ اکبر کی ظرافت کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ سنجیدگی اور متانت کے دامن کو اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، ابتذال اور سوقیانہ پن سے ان کا کلام پاک ہے۔ انھوں نے جس مضمون کو بھی بیان کیا ہے اس میں جدت اور ندرت کا پہلو نمایاں ہے۔ مغربی تہذیب کی اندھی تقلید کا وہ اس طرح خاکہ اڑاتے ہیں ؎

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا کٹی عمر ہوٹلوں میں مرے اسپتال جاکر

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں حجاب اُس کو نہیں آتا انہیں غصہ نہیں آتا

ترقی کی نئی راہیں جو زیرِ آسماں نکلیں
میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں

بہت شوق انگریز بننے کا ہے تو چہرے کو اپنے گلٹ کیجئے

تہذیب جدید میں زندگی کا جو نصب العین ہے اس پر کس قدر بھرپور طنز کیا ہے ؎

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے بی۔ اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

مذہب نے پکارا اے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں یاروں نے کہا یہ قول غلط تنخواہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

چھوڑ لٹریچر کو اپنی ہسٹری کو بھول جا شیخ و مذہب سے تعلق ختم کر اسکول جا
چار دن کی زندگی ہے کوفت سے کیا فائدہ کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

قوم کے لیڈروں کی خود غرضی پر طنز ملاحظہ فرمایئے۔

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ رنج لیڈر کو بہت ہے مگر آرام کے ساتھ

اکبر نے ظرافت کے نشتر کو تیز سے تیز تر بنانے کے لئے برمحل اور موزوں الفاظ سے کام لیا ہے۔ الفاظ کی الٹ پھیر نئے نئے قافیوں کی کھپت اور انگریزی الفاظ کا آزادانہ اور برجستہ استعمال ان کے کلام کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

عاشقی کا ہو بُرا اس نے بگاڑے سارے کام ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

پاکر خطاب ناچ کا بھی شوق ہو گیا سر ہو گئے تو بال کا بھی شوق ہو گیا

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

کہاں کا حرام اور کہاں کا حلال
ہیٹ جائے حلّی رہیں رام لال

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جاجا کے تھانے میں
کہ اکبر ذکر کرتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کچھ سین نہیں خوش آتے نہ بھلتے ہیں برجی
میں زیل کا طالب ہوں نہ خواہانِ ایزجی
سنتا نہیں لکچر، میں پڑا رہتا ہوں دن رات
کٹتا ہے نقط لیڈیوں میں وقتِ ڈنرجی

کہتی ہے زراہِ اکبر مجھ سے وہ گرل
کیا تجھ سے ملوں کہیں کا تو ڈیوک نہ ارل
اکبر نے کہا دکھا کے داغِ دل و اشک
ہے میری گرہ میں بھی یہ روبی یہ پرل

کرلی ہے خوب میں نے نئی روشنی کی جانچ
مجھ سے بہت نہ کیجئے اب آپ تین پانچ

ان لیڈروں کی شعلہ زبانی سے کیا ہوا
ہانڈی تو سرد رہ گئی مذہب آئی آنچ

اکبر نہ صرف ناصح تھے، واعظ تھے، مصلح تھے بلکہ وہ ایک بہت بڑے فنکار بھی تھے۔ ان کا فن اردو ادب میں بے مثل اور زندۂ جاوید ہے۔ ان کی ظریفانہ تنقید نے اردو ادب میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ وہ ادب برائے ادب کے قائل نہ تھے بلکہ انھوں نے ادب کو سماج سدھار اور اصلاح معاشرت کا آلۂ کار بنا کر صحیح معنوں میں انسانیت کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔ ان کا دل اپنوں اور بیگانوں کی بے راہ روی پر کڑھتا تھا اور وہ اس گر کو اچھی طرح سے سمجھتے تھے کہ راست نصیحت اور پند و موعظت بے سود ثابت ہوگی۔ اس لئے انھوں نے ظرافت کے پیرائے میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو وعظ نصیحت کے انداز میں بے اثر ثابت ہوتا ہے۔ انھوں نے ہنس ہنس کر تلخ و تند باتیں کہیں اور لوگوں نے ہنسی خوشی انھیں گوارا کر لیا۔ اکبر نے ہنسی ہنسی میں ایسی پتے کی باتیں کہہ ڈالیں جن کو سن کر ہر درد مند دل رو پڑا۔ انھوں نے مغرب کی کورانہ تقلید اور لامذہبیت کو روکنے کے لئے اپنی شاعری سے بہت کام لیا اور اخلاق و معاشرت میں جو برائیاں پیدا ہو چکی تھیں ان کی اصلاح کے لئے طنز و ظرافت کا حربہ استعمال کیا۔ اکبر نے اپنے اشعار میں ان خرابیوں کا جو عبرت ناک نقشہ کھینچا ہے ان میں سے چند یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

لامذہبی سے ہو نہیں سکتی فلاحِ قوم
ہرگز گزر سکیں گے نہ ان منزلوں سے آپ
کعبے سے بت نکال دئے تھے رسول نے
اللہ کو نکال رہے ہیں دلوں سے آپ

اللہ کی راہ اب تک ہے کھلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا

قابلیت تو بہت بڑھ گئی ماشاء اللہ
مگر افسوس یہی ہے کہ مسلماں نہ رہے

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں
جی رہے ہیں ابھی کچھ لکھے گانے والے

اکبر تہذیب جدید کی برائیوں کی اصلاح کے لئے مذہب دوستی کی تلقین کرتے ہیں اور اصل مذہب کی پیروی کو انسانیت کے درد کا واحد علاج بتاتے ہیں۔

ہم نشیں کہتا ہے کچھ پروا نہیں مذہب گیا
میں یہ کہتا ہوں کہ بھائی یہ گیا تو سب گیا

اسی حیرت میں عمریں کٹ گئیں اربابِ بینش کی
کسے اللہ کہئے اور کس کو ماسوا کہئے

صداقت کے نشاں اس مصرعۂ اکبر سے ملتے ہیں
کلیں سائنس سے چلتی ہیں دل مذہب سے ملتے ہیں

اکبر کے کلام میں طنز و ظرافت کا ایک بحرِ ذخار ہے جس کا احاطہ کرنا اس مختصر مضمون میں ناممکن ہے۔ صرف چند اشاروں اور کنایوں پر اکتفا کر کے ایک سرسری خاکہ پیش کیا ہے۔ اکبر اور طنز و ظرافت پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے۔ مختصر یہ کہ اکبر نے طنز و ظرافت کو اپنا کر اردو شاعری میں ایک مستقل صنف کا اضافہ کیا۔ اکبر کا کلام ایوانِ اردو کا ایک ایسا روشن مینار ہے جو آنے والوں کی صحیح معنوں میں رہنمائی کرتا رہے گا۔

اکبر۔ طرحِ نو کا موجد

(ڈاکٹر اسلم فرخی)

اب جبکہ اردو شاعری کے ایوانِ عالی شان میں داخل ہوا وہ وضع قطع کے اعتبار سے بردبار سنجیدہ اور متین انسان معلوم ہوتا تھا لیکن شوخی اس کے آگے آگے اہتمام کرتی آتی تھی۔ خوش طبعی اور ذکاوت اس کے دائیں بائیں تھی۔ خلوص و ہمدردی پیچھے پیچھے تھی۔ اس کے آتے ہی ایجاد کی ٹہنی میں ظرافت کے پھول کھل اٹھے۔ سودا اور انشا پیشوائی کے لئے آگے بڑھے لیکن اراکین ایوان نے اس باکمال کو اس کرسی پر بٹھایا جو خواجہ الطاف حسین حالی کی کرسی کے برابر رکھی ہوئی تھی یہ باکمال انسان لسان العصر حضرت اکبر الہ آبادی تھے۔ جن سے اردو شاعری میں ایک طرحِ نو کا آغاز ہوا۔ مزاحیہ شاعری تو اردو میں اور بھی ہیں لیکن اکبر اس اعتبار سے منفرد حیثیت رکھتے ہیں کہ ان کے مزاح کی بنیاد خلوص اور ہمدردی پر ہے۔ اس میں نفرت اور ظلم کا کوئی عنصر نہیں پروفیسر ہنری برگساں نے فلسفہ خندہ کی تشریح کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ "تنبیہہ معاشرہ کی وہ انگشت نمائی ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح کرتی رہتی ہے اس کا تعلق محض لطافت قلبی سے نہیں ہے" اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اکبر کی مزاحیہ شاعری معاشرے کی وہ انگشت نمائی ہے جو وقتاً فوقتاً ہماری اصلاح میں کوشاں رہتی ہے لیکن اس کا تمام تر تعلق لطافت قلبی سے ہے، شقاوت قلبی سے اسے کوئی ربط نہیں۔ اکبر کے مزاح کی بنیاد نفرت نہیں محبت ہے۔ انھیں اپنے دور، اپنے معاشرے اپنی روایات۔ اپنے علوم و فنون سب سے محبت تھی اور محبت کے اسی شدید احساس نے ان کی مزاحیہ شاعری کو فروغ بخشا ہے۔

اکبر کی شاعری تہذیبی تصادم کی یادگار ہے انھوں نے خود بھی اسے یادگار انقلاب قرار دیا ہے۔ ان کے عہد میں زندگی کی قدریں بدل رہی تھیں۔ خیالات میں انقلاب آرہا تھا، پرانی چیزیں صرف اس لئے ناپسند کی جارہی تھیں کہ وہ پرانی تھیں۔ نئی قدریں پوری طرح سامنے نہیں آئی تھیں اور طرز مغرب نے انھیں کسی حد تک مضحک بھی بنادیا تھا۔ مغرب زدگی کا سیلاب بہترین قومی روایات کو بہائے لے جارہا تھا، قوم جب اپنی روایات سے منحرف ہوجائے تو پھر وہ قوم نہیں رہتی انسانوں کا ایک ہجوم بن جاتی ہے۔ ایسا ہجوم جس کا کوئی مطمح نظر نہیں ہوتا۔ اکبر کی شاعری نے اسی ماحول میں فروغ پایا اور اسی ماحول کے خلاف پُرزور پُراثر اور دل میں گھر کر جانے والے احتجاج کی شکل میں نمودار ہوئی۔

اکبر سے پہلے مزاحیہ شاعری متاع کاسد کی حیثیت رکھتی تھی اور محض تفنن طبع کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ اکبر نے اس متاع کاسد کو اردو شاعری کا بیش بہا سرمایہ بنادیا اور یہ ثابت کر دکھایا کہ خلوص، ہمدردی اور مقصدی لگن سے ہم آہنگ ہوکر مزاح کا میدان فکر کے میدان سے کسی طرح بھی کم وسعت نہیں ٹھہرتا بلکہ کہیں کہیں تو ایسے مقامات بھی آجاتے ہیں جہاں ظرافت

پیغمبری کے دوش بدوش آجاتی ہے۔ اکبر کی مزاحیہ شاعری دور رس ، اثر انگیزی اور معنی خیزی کی بنا پر کسی مفکر کے نتائج فکر سے کم نہیں بلکہ اگر صحیح اور دیانتدارانہ جائزہ لیا جائے تو شاید اثر پذیری میں اکبر کا پلّہ بھاری ہوگا

اکبر کو اپنی معاشرت، اپنی روایات۔ اپنے مذہب سے عشق تھا وہ ان لوگوں میں سے تھے جو اپنی قومی روایات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اور ان کے تحفظ کو اپنا اہم ترین فرض سمجھتے ہیں قومی روایات صدیوں میں تشکیل پاتی ہیں اور لاتعداد افراد کے انفرادی اور اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتی ہیں انھیں فراموش کر دینا کسی قوم کی سب سے بڑی محرومی ہے۔ اکبر جب مسلمان عاشق کی زبانی یہ کہلواتے ہیں کہ میرے اسلام کو اک قصۂ ماضی سمجھو تو در اصل وہ اسکی قومی محرومی کا ماتم کرتے ہیں لیکن یہ ماتم ایسا ہے جو ہمیں آنسو بہانے کے بجائے سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ اکبر کی ظرافت اور مزاح کی تہہ میں دردمندی اور بے پایاں خلوص کی کارفرمائی ملتی ہے۔ حالی نے قوم کو اس کے زوال کا مرثیہ سنا کر اصلاح کی کوشش کی تھی۔ اکبر نے قوم کو ہنسا کر گدگدا کر۔ چٹکیاں لے کر اسکی قومی غیرت کو للکارا اور اس میں غور و فکر کا ایک نیا رجحان پیدا کیا۔ مقصد دونوں کا ایک تھا۔ راستہ الگ الگ تھا، اکبر کی مصلحانہ حیثیت حالی کی مصلحانہ حیثیت سے کچھ کم نہیں اور اکبر کو یہ فوقیت بھی حاصل ہے کہ ان کا فن حالی کے فن سے زیادہ مشکل اور نازک تھا۔ حالی چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی تلقین کرتے رہے لیکن اکبر نے با زمانہ ستیز پر عمل کیا۔

طنز و مزاح اکبر کا فن تھا لیکن انھوں نے اپنے آپ کو یا اپنے فن کو نیچی سطح پر لانے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہ ذہنی سطح کی ایک خاص بلندی سے اپنے ماحول کا جائزہ لیتے رہے۔ اور اپنے عہد کے مقبول عام نظریات کی جذباتی نوعیت کو طشت از بام کر کے ایک خاص ڈگر پہ چلنے والی زندگی کا رخ موڑنے کی کوشش کرتے رہے۔ ذہنی سطح کی یہ بلندی اکبر کی پوری شاعری میں نمایاں ہے مغرب زدگی ان کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی اور شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ اس کی نوعیت حقیقی نہیں بلکہ بڑی حد تک جذباتی تھی۔ شاید آج بھی اس کی نوعیت جذباتی ہی ہے۔ جذبات کے دھارے میں بہہ کر انسان اچھے اور برے میں تمیز نہیں کرتا۔ ہم نے بھی یہی کیا لیکن اکبر نے اس جذباتی وابستگی کو اپنے طنز و مزاح سے پوری طرح رسوا کیا۔ انھوں نے صاف صاف کہا کہ ؎

یہ بات غلط کہ ملکِ اسلام ہے ہند
یہ جھوٹ کہ ملکِ لچھمن و رام ہے ہند
ہم سب ہیں مطیع و خیر خواہِ انگلش
یورپ کے لئے بس اک گودام ہے ہند

اور اس میں شبہ ہی کیا ہے کہ ہم سب یورپ کا خام مال ہیں جو گودام میں حفاظت سے رکھ دیا گیا ہے۔ عام طور پر اکبر کو سرسید کا حریف سمجھا جاتا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ انھوں نے اپنی شاعری میں سرسید اور ان کے مشن کا خوب خوب خاکہ اڑایا ہے لیکن اکبر نہ سرسید کے حریف تھے نہ ان کے بدخواہ۔ انھیں سرسید سے ہمدردی تو تھی لیکن وہ سرسید کے تعلیمی کاموں کی نوعیت بدلنے کے خواہشمند ضرور تھے۔ اکبر اس سطحیت سے بیزار تھے جو کسی حد تک سرسید کے اثر سے نمودار ہوئی تھی۔ یہ خیال بھی صحیح نہیں کہ اکبر ہر نئی چیز سے بھڑکتے تھے اور اسے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے انھوں نے اہل مغرب کی خوبیوں کی تعریف بھی کی ہے۔ نئی چیزوں کو بھی سراہا ہے لیکن نئی روشنی میں اپنے ماضی کو فراموش کرنے پر وہ کبھی تیار نہیں

ہوئے ان کا قول یہ تھا۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو پارک میں پھولو — جائز ہے غباروں میں اڑو چرخ پہ جھولو
لیکن یہ سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد — اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

ان اشعار سے اکبر کا نقطۂ نظر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ انھیں زمانے کی تیز رفتاری کا احساس ہے وہ جانتے ہیں کہ ہر زمانے کے تقاضے دوسرے عہد کے تقاضوں سے کچھ مختلف ہوتے ہیں لیکن یہ اختلاف زندگی کی بنیادی قدریں نہیں بدل سکتا۔ بنیادی قدروں کا بدل جانا قومی زندگی ختم ہو جانے کے مترادف ہے۔ اکبر یہ دیکھ رہے تھے کہ ان کے عہد میں بنیادی قدروں کو بدلنے کی کوشش کی جا رہی ہے شاید اسی احساس کے زیر اثر انھوں نے کہا تھا۔

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں — کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

اکبر نے زندگی کے ہر پہلو پر تنقید کی ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جو ان کے طنز و مزاح کے نشتر سے محفوظ رہا ہو وہ معاشرے کے جس پہلو کو قابل اصلاح سمجھتے تھے اسے اپنی تنقید کا نشانہ بناتے تھے اس میں نئے پرانے۔ چھوٹے بڑے اپنے پرائے کسی کی تخصیص نہیں اگر ایک طرف وہ نئی روشنی کے مغرب زدہ نوجوانوں کے اخلاق و افکار پر طنز کرتے ہیں تو دوسری طرف وہ خرقہ پوش بھی ان کی طنز سے نہیں بچے جو مذہب کے اجارہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ اکبر کے یہاں مذہب کا تصور جامد نہیں تھا نہ وہ اسے کسی خاص فرقے یا بلند طبقے کی میراث سمجھتے تھے۔ مذہبی رہنماؤں میں اگر وہ کسی قسم کی خامی دیکھتے تھے تو اس کا اظہار برملا کرتے تھے۔ ایک جگہ کہتے ہیں۔

تحریکِ ضرورتِ معیشت ہے بہت — خرقے کو بھی اب خیالِ خلعت ہے بہت
خالق کے جمال کا تو سودا کم ہے — اللہ کے نام کی تجارت ہے بہت

اکبر کی مصلحانہ نگاہ نے زندگی کے پست و بلند دونوں کا جائزہ لیا تھا اور دونوں پر ان کی گرفت بہت شدید تھی۔ ان کے یہاں مصالحت کی کوئی گنجائش اور تصور نہیں۔ زندگی کا ایک واضح تصور ہے جس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے خلوص میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

اکبر نے مزاحیہ شاعری کو اردو ادب میں پُر وقار بنا دیا۔ انھوں نے الفاظ سے۔ خیالات سے واقعات و حالات سے اور کرداروں سے مزاح پیدا کیا ہے۔ اپنے مزاح کو پُر کار بنانے کے لئے انھوں نے نئی نئی علامتیں بھی وضع کی ہیں۔ علامتوں کا زوال شاعری کا المیہ ہے۔ اکبر نے اردو شاعری کو بعض نئی علامتیں عطا کی ہیں۔ ذکاوت، خوش طبعی، شوخی، ظرافت سب سے انھوں نے خوب خوب کام لیا ہے۔ مزاحیہ شاعری کو بلند سطح عطا کی ہے اور اسے سنجیدہ شاعری کا ہم پلہ بنا دیا ہے۔ تاریخ ادب میں ان کا یہ کارنامہ بہت اہم ہے۔ لیکن قومی تاریخ میں ان کا یہ کارنامہ اس سے بھی زیادہ اہم ہے کہ انھوں نے قومی روایات کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کی اور اس سیلاب کا زور بہت کم کر دیا جو قوم کو تباہی کی طرف لے جا رہا تھا۔ شوخ نگار اکبر وہ مصلح تھے جنھوں نے قومی اصلاح کے لئے طنز و مزاح سے کام لیا ان کے عہد میں بھی اس کی ضرورت تھی اور یہ ضرورت آج بھی ہے سقراط نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اعلیٰ ترین علم اچھائی اور برائی کا علم ہے۔ وہ علم جو رموز حیات پر مبنی ہوتا ہے۔ اکبر کی شاعری اچھائی میں تمیز کرنا سکھاتی ہے۔ یہ رموز حیات پر مبنی ہے اور پھر یہ خشک وعظ بھی نہیں تو پھر اس کی عظمت سے کون منکر ہو سکتا ہے۔